
فنون
لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل : ۷۵۷۹

ٹیلیفون : ۶۹۵۸۰

فنون

خاص شمارہ

۱۱

ادارہ :

احمد ندیم قاسمی

حبیب اشعر دہلوی

تزئین :

موجد

جلد : ۶ اپریل ——— ۱۹۶۸ء شمارہ : ۶

سالانہ چندہ ۱۴ روپے غیر ممالک سے ۲۵۰ روپے قیمت فی پرچہ (شمارہ عام) ۳ روپے

مقام اشاعت : ۴۷ - انارکلی - لاہور (مغربی پاکستان)

مندرجات

سرورق : مُوجد

جوش ملیح آبادی، یگانہ لکھنوی، فراق گورکھپوری — ایک فوٹوگراف

غزلیں

تبصرے

ادارہ

حرفِ اوّل

جدید غزل نمبر

آئندہ ستمبر تک جدید غزل نمبر کی اشاعت متوقع ہے۔ یوں تو جدید غزل کا آغاز غالب سے ہوتا ہے مگر ہم محض اپنی آسانی کے لئے اقبال سے اس کا آغاز کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہر اس غزل گو کو جدید نہیں کہا جا سکتا جس نے بیسویں صدی میں غزلیں کہی ہیں۔ جدت دراصل جدید طرزِ فکر، جدید طرزِ احساس اور جدید علامتوں کے بلیغ استعمال کا نام ہے جن کی وجہ سے "ظرفِ تنگنائے غزل" میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور غزل کی شدید مخالفت کے باوجود اس صنف نے نہ صرف شکست تسلیم نہیں کی بلکہ بڑے بڑے کافروں کو اپنے حسن اور اپنے امکانات پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی کی جدید غزل کے انتخاب کے علاوہ غزل میں جدت کی اس رَو کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو بھی سامنے لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے ان نقادوں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی ہے جنہوں نے جدید غزل کا مطالعہ بے تعصبی اور غور اور محبت سے کیا ہے اور جنہیں اس حقیقت کا شعور حاصل ہے کہ معاصر تخلیقی ادب ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہم اپنے ادب کے مستقبل کو پرکھ سکتے ہیں۔ ادارہ "فنون" کی طرف سے منتخب شعراء اور نقاد حضرات کی خدمت میں دعوت نامے بھیجے جا رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمیں ان سب کا بھرپور تعاون حاصل ہوگا۔ اس تعاون کے بغیر ایک ایسا نمبر مرتب کرنا خارج از بحث ہے جو آئندہ کے نقادوں کے سامنے دورِ حاضر کی اردو غزل کی تصویر کو صحیح چوکھٹے میں پیش کر سکے۔

بعض مریض عناصر

"فنون" کی کامیابی اور معیاری ادب کے دلدادہ قارئین میں اس کی مقبولیت سے ہمارے بعض دوست شدید ذہنی تکلیف میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہمیں ان عناصر سے دلی ہمدردی ہے۔ کسی کی کامیابی پر برافروختہ ہونا دراصل ایک مرض کی علامت ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے اور مریض کا طرزِ عمل کچھ بھی ہو، وہ بہرحال ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی لئے "فنون" کے بارے میں ان دوستوں کے ارشادات پر ہم سوائے اس کے کیا عرض کریں کہ خدا آپ کو شفا بخشے۔ ہم اس کے علاوہ "فنون" کے پڑھنے والوں کو بھی یقین دلاتے ہیں کہ "فنون" نہ تو کسی مکتبِ فکر کی تضحیک کے لئے جاری کیا گیا ہے اور نہ اس کے مدِ نظر کسی فرد یا افراد کے گروہ کا مذاق اڑانا ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اعلیٰ معیار کے تخلیقی ادب کو تسلسل کے ساتھ پیش کر کے ادب میں جمود کے پرانے ڈھکوسلے کو ختم کیا جا سکے۔ تنقیدوں اور بحثوں میں اگر کسی ادیب یا کسی نقطۂ نظر سے اختلاف کا اظہار کیا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تلواریں میانوں سے نکل آئی ہیں اور قیامت کا رن پڑنے والا ہے۔ ادیب کو تو خود اپنی تنقید کا بھی حوصلہ حاصل ہوتا ہے، چہ جائیکہ وہ دوسروں کی تنقید پر آتش زیرپا ہو جائے۔ "فنون" مہذب اظہارِ رائے کا یہ منصب کسی قیمت پر ترک کرنے کو تیار نہیں ہے اور اس سے اگر بعض ذکی الحس دوستوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں تو ہم ان کے حق میں صرف دعا کر سکتے ہیں اور یہ عرض کر سکتے ہیں کہ مرض لاعلاج نہیں ہے۔

ضروری تصحیح

گذشتہ خاص اشاعت (۶۔۵) کی ترتیب میں چند فروگذاشتیں ہو گئی ہیں جن کے لئے ہم متعلقہ اہلِ قلم سے معذرت خواہ ہیں۔ قارئین تصحیح فرما لیں۔ صفحہ ۳۴۳ پر محترمہ زہرا نگاہ کے نام سے جو دو نظمیں "گونج" اور "پناہ" کے عنوان سے درج ہیں وہ دراصل جناب انور عظیم کی نظمیں ہیں۔ اسی طرح محترمہ کشور ناہید کی غزل (صفحہ ۲۱۴) کی یوں تصحیح کر لیجیے:

شعر ۳ غلط: دو سائے جب آ گئے سر کیں ایک ہی سایہ رہ جانے ۔۔۔ سات رنگ سے دھنک بنے پر سب رنگوں کا ایک ہی رنگ

صحیح: دو سائے جب آ گئے سر کیں ایک ہی سایہ رہ جاتا ہے ۔۔۔ سات رنگوں سے دھنک بنے پر ساتوں کا ایک ہی رنگ

شعر ۵ غلط: دھوپ چڑھی تو سونا چمکا، دھوپ ڈھلی تو سرسوں تھی ۔۔۔ چاروں گھونٹ جمی ہے کائی، ہر ساتوں کا ایک ہی رنگ

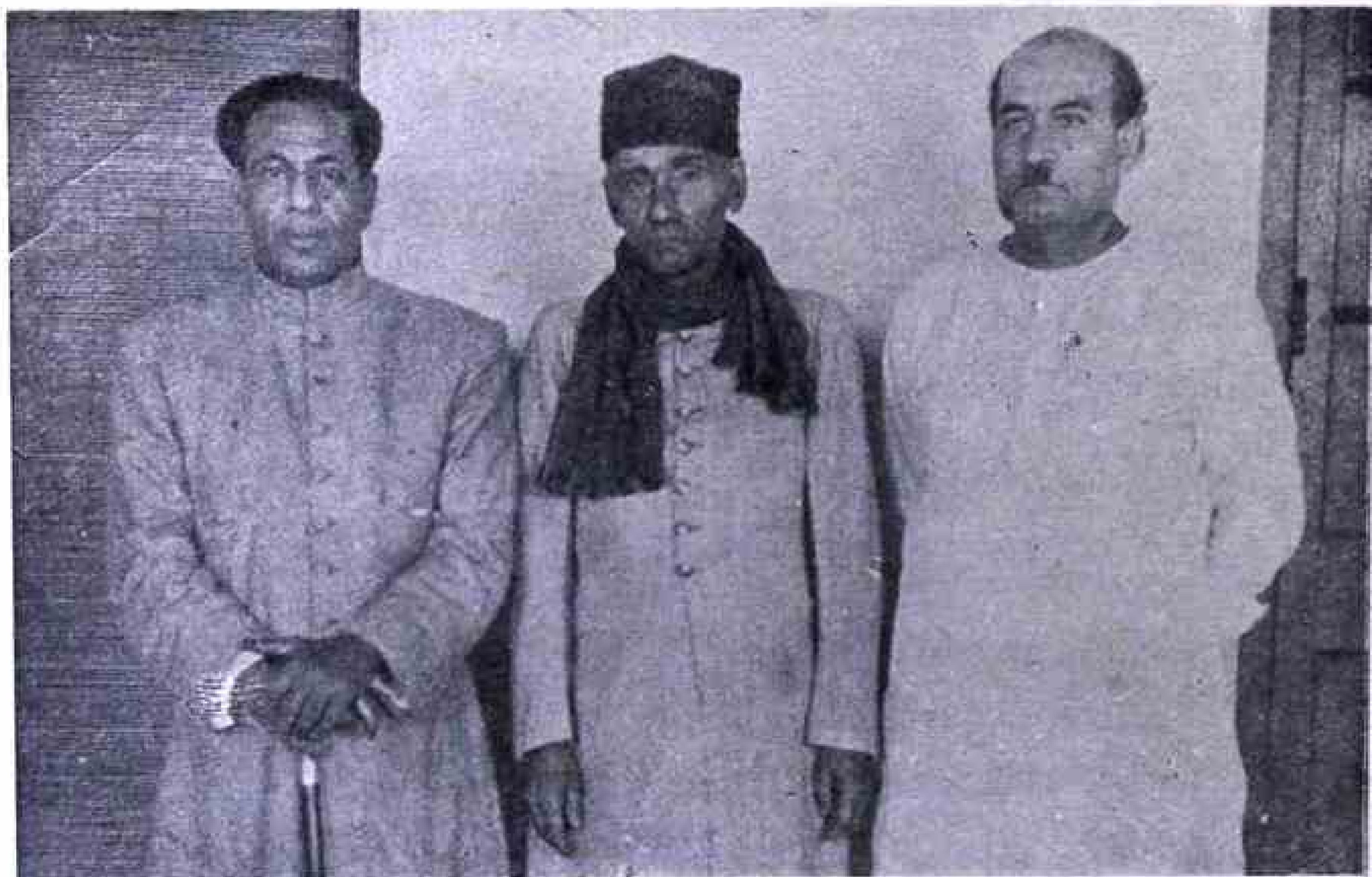
صحیح: دھوپ چڑھی تو سونا چمکا، دھوپ ڈھلی تو سرسوں تھی ۔۔۔ ہر جانب ہے جم گئی کائی، برساتوں کا ایک ہی رنگ

شعر ۶ غلط: گم اس آگی اس پگڈنڈی پر جس سے گزر کے ملتے تھے ۔۔۔ گنج اماں بھی سڑکیں بن گئیں، سب باتوں کا ایک ہی رنگ

صحیح: گم اس آگی اس پگڈنڈی پہ جس سے گزر کے ہم ملتے تھے ۔۔۔ کنج اماں بھی سڑکیں بن گئیں، سب باتوں کا ایک ہی رنگ

ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر

عکس تحریر امام ویردے مرحوم



ایک یادگار تصویر—(دائیں سے بائیں) جوش ملیح آبادی ۔ یگانہ لکھنوی ۔ فراق گورکھپوری



یگانہ لکھنوی — علامہ رشید ترابی کے ساتھ

(مطلع)

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزہ نہ ملا
کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

جواب لب پہ وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ خانقاہ کا مزہ نہ ملا

امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

ہزار رنگ تھے اسی جانب پہ منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا ملا ملا نہ ملا

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستا نہ ملا

خوشا نصیب جسے خفیفِ عشق شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

سمجھ میں آ گیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

(رباعی)

بیداریِ موہوم کا پردہ نہ اٹھا
کھلنے کے لئے وقت بہت خوب اٹھا
کیا جانے سحاب سے آخر کیا گزری
پانی کتنا بہا ہے بجلی کتنا گھٹا؟

شوکت صدیقی

دیوار کے پیچھے

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی ساڑھے بارہ بجے کا عمل ہوگا، کہیں قریب ہی کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ ان دنوں پاس پڑوس میں چوری کی ایک آدھ واردات بھی ہو چکی تھی۔ اس لئے کتوں کے اس طرح مسلسل بھونکنے سے ذرا تشویش ہوئی۔ میں شہر کے جس علاقے میں رہتا ہوں۔ وہ کسی قدر غیر آباد ہے نہ سڑکوں پر روشنی کا بندوبست ہے اور نہ رات کو پولیس کی باقاعدہ گشت ہوتی ہے۔

آنکھ کھلنے کے بعد میں نے سوچا کہ احتیاطاً اپنے گھر کا بھی جائزہ لے لوں۔ میں نے دروازہ کھولا اور کھنکارتا ہوا باہر آگیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز گھر کے پچھواڑے سے آرہی تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔ میرے مکان کے پیچھے ایک خالی پلاٹ ہے۔ اور اس کے برابر ایک نیم تعمیر مکان ہے۔ جو غیر آباد ہونے کے باعث رات کی تاریکی میں بھوتوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ راتوں کو یہاں کتے بسیرا کرتے ہیں یا زیر تعمیر مکانوں پر کام کرنے والے مزدور اور کاریگر اس کو حوائج ضروری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کس منحوس کا مکان ہے۔ کبھی پلٹ کر ادھر کا رخ نہیں کیا کہ میں اس سے احتجاج کرسکوں۔

ہاں تو جب میں عقبی دیوار کے قریب پہنچا تو پیچھے سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ دل میں کہا، لو بھئی، آج ہوگیا چوروں سے مچیٹا۔ قبل اس کے کہ میں لپک کر کسی کو بیدار کروں کہ اسی اثنا چوڑیوں کی ہلکی سی جھنجھناہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی کسی عورت نے بہت آہستہ سے کہا۔

"یہ کتے تو ہمارے پیچھے لگ گئے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آؤ اس خالی مکان میں چلیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" آواز مردانہ تھی۔

معاملے کی نوعیت کچھ کچھ سمجھ میں آگئی۔ مگر میں چکر میں پڑ گیا کہ اس وقت آدھی رات کو یہاں کون ہوسکتا ہے۔ کچھ غصہ بھی آیا کہ حرامزادوں کو کہیں اور ٹھکانہ نہ ملا۔ میری ہی دیوار کے پیچھے ان کو عشق لڑانا رہ گیا تھا۔ جی چاہا کہ ان کو ڈانٹوں۔ لعنت ملامت کروں، پھر اس خیال سے باز رہا کہ اپنی بھی نیند حرام ہوگی اور دوسروں کی بھی خواہ مخواہ کا ہنگامہ ہوگا۔ بات زیادہ بڑھ گئی تو معاملہ پولیس تک پہنچے گا۔ سوچا مجھے کیا نقصان پہنچا رہے ہیں بس دیوار پیچھے ہی تیرا کیے لیتے ہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ واپس آکر بستر پر سو گیا۔

ابھی ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ بیوی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے"

جواب ملا "باہر سارا محلہ اکٹھا ہے۔ کوئی واردات ہوگئی ہے۔"

لوگوں کے زور زور باتیں کرنے کی آوازیں بھی میں نے سنیں۔ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ باہر جا کر دیکھا تو ایک مکان کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے۔

قریب گیا تو ایک مرد اور عورت نظر آئے۔ دونوں گردنیں جھکائے سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ بات کیا ہے۔ عورت سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ مرد صورت شکل سے ہرگز نامعقول نہیں لگتا تھا۔ سیاہ رنگ کی چست پتلون اور اونی سویٹر پہنے، وہ سیدھا سادا ایک عام نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ لوگ ان دونوں کے گرد نیم دائرے میں کھڑے اس طرح گھور رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔

میری طرح کچھ اور لوگ بھی گھروں سے نکل کر وہاں آ گئے۔ ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا "بھئی ہوا کیا، معاملہ کیا ہے؟" جواب دینے والا بھی ایک ہی شخص تھا۔ لمبا تڑنگا، نیلی یونیفارم پہنے، گلوبند لپیٹے وہ بڑی شان سے اکڑا ہوا کھڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاور ہاؤس میں مستری کا کام کرتا ہے۔ ممکن ہے فورمین ہو۔ کچھ بھی ہو، بہرحال آدمی پرلے درجے کا شیخی خورہ ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر، چٹخارے لے کر اونچی آواز سے بتا رہا تھا۔

"بھئی ہوا یہ کہ میں ڈیوٹی ختم کر کے آ رہا تھا۔ جب اس خالی مکان کے سامنے پہنچا تو کچھ آہٹ معلوم ہوئی۔ دو سائے ہلتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹک کر ٹھہر گیا اور وہیں سے ڈپٹ کر آواز لگائی "کون ہے؟" بس ایک دم یہ دونوں نکل کر بھاگے۔ میں پیچھا نہ کرتا تو صاف نکل گئے تھے۔ بلکہ یہ سالا تو نکل ہی گیا تھا۔ وہ تو راستے ہی میں کوئی گڑھا آ گیا۔ قلابازی کھا کر گرا اور میں نے فوراً دبوچ لیا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے ٹکیٹرا گھٹنے سے دبا رکھا تھا نکل کر کیسے جاتا۔"

یہ تفصیل وہ اس سے پہلے بھی بتا چکا تھا۔ اور ہر بار کندھے اُچکا کر سب کو اس طرح دیکھتا جیسے ابھی اکھاڑے سے کشتی مار کر آیا ہے۔ وہ بات ختم کرتا تو ایک دم تبصرہ شروع ہو جاتا

"یار ذرا اندھیر ہے اندھیر۔ غضب خدا کا کس قدر بے غیرتی ہے"

"صورت تو دیکھو، اچھا خاصا بھلا آدمی لگتا ہے اور اس کے یہ کرتوت"

"بھگا کر لایا ہے۔"

"نہیں بھئی، یہ تو کوئی آوارہ عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"ابے تم کو یہ حرامکاری کرتے شرم نہیں آتی جہنم میں جاؤ گے جہنم میں۔"

"لعنت ہے تمہاری اوقات پر۔"

اس لعنت اور پھٹکار کے دوران پستہ قد محمد حسین بھی اپنی منمنی آواز میں بار بار کہتے "جی ان کو سنگسار کر دینا چاہیے۔ اسلام میں زناکاروں کی یہی سزا ہے۔"

جب وہ کئی بار یہی بات کہہ چکے تو ایک بار میں نے جل کر کہا "تو یہ پہلا پتھر کون مارے گا؟"

بولے "آپ ہی سے بسم اللہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

میں نے کہا "جناب پھانسی کے تختے پر چڑھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ زیادہ مجاہد معلوم ہوتے ہیں آپ ہی سے پہل ہو۔"

وہ ایک دم جوش میں آ گئے۔ "لیجیے میں ہی شروع کرتا ہوں" اور انھوں نے واقعی پتھر بھی اُٹھا لیا۔

میں نے ٹوکا "پتھر اُٹھانے سے پہلے یہ بھی سوچ لیجیے کہ انجام کیا ہو گا۔ جیل کی کوٹھڑی اور پھانسی کا تختہ، بیوی رانڈ، بیوہ بچے یتیم۔"

انھوں نے فوراً پتھر چھوڑ دیا۔ مجھ کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولے "ذرا زبان سنبھال کر بات کیجیے۔ آپ ہی کے ایسے بزدلوں نے تو مسلمانوں کو بدنام کیا ہے۔ جبھی تو ہم اس حالت کو پہنچے ہیں کہ اس طرح کھلے عام حرامکاری ہو رہی ہے۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہتے۔ لیکن بیچ میں دوسرے لوگ بول پڑے۔ جو بھی بھی رہا تھا۔ کوئی بات شروع کرتا، دوسرا بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا۔ ہر شخص اپنی ہانک رہا تھا، جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور وہ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ خوف سے سہمے ہوئے، سکڑے ہوئے، دُبکے ہوئے۔

رات ڈھلنے لگی تھی خنکی بڑھ گئی تھی اور ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ ان کو پولس کے حوالے کر دیا جائے مگر سوال کئی میل دور تھانے تک جانے کا تھا۔ اور اس سے ہر شخص کنی کاٹ رہا تھا۔ بعض کی تجویز تھی کہ مرد کا منہ کالا کیا جائے اور جوتے لگائے جائیں۔ عورت کی صرف چوٹی کاٹ دی جائے۔ کچھ اور بھی ایسی ہی دلچسپ سزائیں تجویز کی گئیں۔ بوڑھے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور جوان بڑوں کے ڈر سے خاموش تھے۔ ایک آدھ بار انھوں نے لقمہ دیا تو اُن کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا جن کے باپ موجود تھے، انھوں نے لڑکوں کو تنبیہہ کر کے گھر واپس بھیج دیا تھا۔

آخر بڑی بک بک، جھک جھک کے بعد یہ طے پایا کہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے اور اس تفتیش کی روشنی میں سزا تجویز کی جائے لیکن اس طرح شبنم میں لوگ زیادہ کھڑے رہنے کے حق میں نہیں تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ بات معقول تھی سب تیار ہو گئے لطف یہ کہ کوئی بھی گھر واپس جاتا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص کو دلچسپی تھی، کرید تھی، اور ان میں، میں بھی شامل تھا۔

یہ تحریک چونکہ اکبر صاحب کی تھی۔ لہٰذا ان ہی کے مکان میں جو قریب ہی تھا۔ بیرونی برآمدے میں سب لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اندر سے کرسیاں آگئیں۔ بیٹھنا نصیب ہوا تو لوگوں میں کچھ معقولیت بھی پیدا ہوئی۔ عورت کو ذرا دور ایک کونے میں بٹھا دیا گیا اور مرد سے سوالات کیے جانے لگے۔ محلّے کے واحد ڈاکٹر مرزا صاحب نے ابتدا کی۔ انھوں نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

"بھئی تم اس محلّے کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے، کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ اور یہ عورت کون ہے؟ بیوی تو معلوم نہیں ہوتی۔"

کسی نے بیچ میں لقمہ دیا "توبہ کیجیے۔ بیوی کے ساتھ کوئی یہ نامعقول حرکت کرتا ہے۔" یہ صاحب کہ جن کا نام نامی اسم گرامی شریف احمد ہے۔ میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر رہتے ہیں، انھوں نے ابھی نیا نیا مکان تعمیر کرایا ہے۔ کسی ایسی فرم میں ملازم ہیں جہاں دوسرے الاؤنسوں کے ساتھ مکان کا ایک مقررہ کرایہ بھی ملتا ہے۔ اپنے مکان میں رہنے کے باوجود دفتر سے اس کا کرایہ بھی وصول کرتے ہیں مکان بیوی کے نام ہے اس خوف سے کہ راز نہ کھل جائے۔ بیوی کے لئے شوہر کے خانے میں کسی جھکّن خاں کا نام لکھوا دیا ہے۔ ویسے بڑے پرہیزگار آدمی ہیں۔ میں ہر روز ان کو پابندی کے ساتھ مسجد کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ شریف احمد کا ذکر تو خواہ مخواہ بیچ میں آگیا۔ اب اس آدمی کا حال سنیے۔ اس نے کسی سوال پر کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ بہت اصرار کیا گیا تو عاجزی سے بولا "جناب غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجیے۔ آپ سب سے معافی مانگتا ہوں۔ توبہ کرتا ہوں" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

مستری جی جنھوں نے دونوں کو پکڑا تھا، فوراً بول پڑے۔ معافی تو تم نے اسی وقت مجھ سے مانگی تھی۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتاؤ۔"

وہ آدمی پھر خاموش ہو گیا، کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک فیاض خاں نے اُٹھ کر اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگایا اور گرج کر بولے "بتاتا ہے کہ سالے کے ایک اور لگاؤں۔"

وہ آبدیدہ ہو کر بولا "آپ مار کیوں رہے ہیں۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔"

فیاض خاں پولس کے ریٹائرڈ انسپکٹر ہیں۔ ذرا نہ سیجے۔ ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ وہ بلبلا کر بولا "ماریے نہیں سب بتائے دیتا ہوں اور اپنا گال سہلانے لگا۔

فیاض خاں نے ہم سب کو اس طرح داد طلب نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھو اس طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایکبار

پھر اپنا سوال دہرایا "اب تو بتا دو کہ تم کون ہو، یہاں کیسے آئے، کیوں آئے؟"

فیاض خاں نے اس کو پھر ڈانٹا "سچ سچ بتانا ورنہ مار مار کر سور بنا دوں گا۔"

وہ آدمی آہستہ سے بولا "میرا نام اسلم ہے۔ دفتر میں کلرک ہوں۔"

پوچھا گیا "شادی ہو گئی ہے تمہاری؟"

اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔

اکبر صاحب نے کہا "بھلے آدمی شادی کر کے گھر کیوں نہیں بسا لیتے، اس خرافات میں کیا رکھا ہے۔ عاقبت بھی خراب اور دنیا میں بھی منہ کالا۔"

وہ بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں، میری ماں اور دوسرے رشتہ دار بھی یہی کہتے ہیں مگر بات یہ ہے..."

کسی نے بیچ میں بات کاٹ دی "کیوں بکتا ہے۔ تم کو تو عورتوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مزا آتا ہے۔"

وہ کہنے لگا "نہیں جناب یہ بات نہیں۔"

فیاض خاں نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا "پھر کیا بات ہے سچ سچ بتا۔"

وہ بتانے لگا "دیکھئے ڈیڑھ سو تو کل میری تنخواہ ہے۔ اس میں پچاس روپے ہر مہینے ماں کو بھیجتا ہوں۔ ان کا اور کوئی سہارا نہیں۔ باپ کا میرے انتقال ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کراچی میں معمولی سے معمولی مکان سو روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ ایک دوست کے ساتھ کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر رہا ہوں۔"

پھر کوئی بیچ میں بول پڑا "اماں، صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔"

پوچھا گیا "اس عورت کو بھگا کر لائے ہو؟"

اس نے جواب دیا "جی نہیں"

کسی نے لقمہ دیا "تو پھر اس کا بھڑوا ہو گا۔" اس پر بعض لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا "یہ عورت کون ہے؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا "معلوم نہیں۔"

فیاض خاں پھر گرجے "ابے پھر جھوٹ بولا۔ لگاؤں دو ایک اور"

"میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔"

فیاض خاں کو اب تو جلال آ گیا۔ قبل اس کے وہ ہاتھ اٹھاتا، ڈاکٹر صاحب ذرا بول پڑے "مگر بھئی، پھر یہ عورت تمہارے ساتھ یہاں کیسے آئی؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ اور درگت بنے گی۔"

وہ کہنے لگا "دیکھئے بات یہ ہے کہ میں دس بجے کے قریب ایک دوست سے ملنے ریلوے اسٹیشن گیا تھا۔ وہ ریلوے میں کام کرتا ہے۔ وہیں یہ عورت مجھ کو مل گئی۔ اسٹیشن سے ذرا ہٹ کر فٹ پاتھ پر کھڑی کسی آدمی سے بات کر رہی تھی مجھے آتا دیکھ کر وہ آدمی ایک دم آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھ کو دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ میں آگے چلا گیا۔ پھر نہ جانے کیوں واپس آ گیا۔"

کسی نے آواز کسا "استاد یہ نہیں کہتے کہ ذرا ٹھرک لگانے کو جی چاہا تھا۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "اماں بات تو پوری سننے دو۔ ہاں بھئی تو پھر کیا ہوا؟" اب اس کی بات میں لوگوں کو دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔

وہ بتانے لگا "میں نے قریب جا کر اس سے پوچھا "کہاں جاؤ گی؟" بولی جہاں لے چلو" بس پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھ سے چالیس روپے مانگے اور بیس روپے پیشگی بھی لے لئے۔ ہم دیر تک سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومتے رہے اور جب ایک پولس والے کو اپنی جانب گھورتے ہوئے دیکھا تو سوچا کہ اس طرح سڑکوں پر گھومنا خطرناک ہے۔ میں نے فوراً ایک رکشا ٹھہرائی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ مگر اس کو لے کر جاتا کہاں، دفتر کے ایک ملنے والے کے ہاں پہنچا تو اس نے گالیاں دے کر بھگا دیا۔ جس شخص کے ساتھ رہتا ہوں وہ بال بچے دار آدمی ہے۔ اس کو ذرا بھی شبہ ہو جائے تو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دے۔

سب بڑی دلچسپی کے ساتھ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے کہ اچانک اکبر صاحب بول پڑے "جب منہ ہی کالا کرنا تھا تو کسی ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا ہوتا۔ یہاں ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں۔"

وہ بولا "میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔"

کسی نے پوچھا "کتنے روپے تھے؟"

"پچاس!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "یہ ماں کو بھیجنے کے لئے تو نہیں تھے؟"

اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا "جی ہاں!"

بیک وقت کئی آوازیں مختلف سمتوں سے ابھریں۔

"بھئی حد ہو گئی۔"

"لعنت ہے اس شخص پر"

"اس کو تو واقعی سزا ملنی چاہیئے"

کسی نے اونچی آواز سے اس کو مخاطب کر کے کہا "بھئی تم آگے بتاؤ۔"

وہ بتانے لگا "جب کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آئی تو ہم شہر سے نکل کر ادھر آ گئے۔ یہاں آبادی بھی کم ہے اور سڑکوں پر اندھیرا بھی ہے۔ کیا کرتا بیس روپے تو وصول کرنا ہی تھے۔" وہ اب ذرا کھل کر بات کرنے لگا تھا۔

کسی نے برجستہ کہا "تو تم نے کئے وہ روپے وصول؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولا "رکشا کے کرایہ میں جو تین روپے دئے تھے۔ وہ بھی وصول نہیں ہوئے۔"

بستہ قد محمد حسین اس بات پر تڑپ کر رہ گئے۔ بگڑ کر بولے "لاحول ولا قوۃ، کیا بے غیرتی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اور اس بے حیا کو تو دیکھیئے کس بے شرمی کے ساتھ بات کر رہا ہے۔" کچھ اور لوگوں نے بھی لعنت ملامت شروع کر دی۔

رات بہت زیادہ ہو چکی تھی اور اس شخص کی بات میں بھی اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفارش کی "میرا خیال ہے اب ان کو جانے دیا جائے۔ ان کو خاصی سزا مل گئی۔"

شریف احمد کہنے لگے "کیا بات کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ ان کو سزا کہاں ملی، ان کو ضرور کچھ نہ کچھ سزا ملنا چاہیئے تاکہ آئندہ عبرت ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "یہ رسوائی، یہ لعنت پھٹکار کچھ کم سزا ہے۔ بھلے آدمی ہوں گے تو آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔"

کسی نے اصرار کیا "نہیں صاحب ان کو پولس کے حوالے کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ کہنے لگے "پولس کے حوالے کرنے سے کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ کچھ جرمانہ ہوجائے گا اور اخباروں میں خبر چھپ جائے گی کہ ایک نوجوان مرد اور عورت پبلک پلیس پر بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ اور جہاں تک تھانے جانے کا سوال ہے تو جناب میں تو اب گھر جا کر سوؤں گا۔ میں تھانے والے نہیں جاتا"

ذرا دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر شریف احمد کی آواز ابھری "مجھے تو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ شریف لوگوں کی آبادی ہے۔ یہ یہاں اس حرامکاری کے لئے کیوں آئے؟"

میں جو تمام عرصے خاموش بیٹھا رہا تھا۔ شامتِ اعمال بیچ میں بول پڑا "جناب میرے گھر کی دیوار کے پیچھے یہ ساری بیہودگی ہوئی مگر میں اب ان سے کیا کہوں۔ نہ جانے رات کی تاریکی میں کس کس دیوار کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے۔ مجھے تو انھوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ میری نیند خراب کی، نہ میرے گھر میں نقب لگائی۔

شریف احمد میری باتوں پر چڑ گئے کہنے لگے "آپ کو ان سے بڑی ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی ہمدردی ہے تو اپنے گھر کے اندر بلا لیا ہوتا آپ نے" ان کی اس بات پر میں جل کر رہ گیا لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بڑے طنز کے ساتھ بولے "آئندہ بلا لیجئے گا۔ ویسے یہ دھندا بُرا نہیں، منافع ہی منافع ہے"۔

یہ کہہ کر انھوں نے زور کا قہقہہ مارا۔ میں نے اپنا پیر ذرا ڈھیلا کیا اور قبل اس کے کہ ان کا قہقہہ ختم ہو، جوتا اتار کے بغیر کسی تمہید کے تڑا تڑ دو ان کی گنجی چندیا پر جما دیئے۔ تیسرا ہاتھ اُٹھایا تھا کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی جوتا چھین کر پھینک دیا۔ پھر کیا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کبھی وہ مجھ کو مارنے کے لئے جھپٹتے، کبھی میں ان پر لپکتا۔ کئی بار ہم گتھم گتھا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ہر بار لوگوں نے روک لیا۔ اچھی خاصی افراتفری مچ گئی۔

جب ذرا معاملہ ٹھنڈا ہوا تو پتہ چلا کہ اس ہنگامے میں وہ دونوں چپکے سے نکل بھاگے مگر میں بیٹھے بٹھائے مشکل میں پھنس گیا۔ شریف احمد نے دوسرے ہی دن سٹی کورٹ میں مجسٹریٹ کے روبرو آٹھ آنے کے اسٹامپ پر حلف نامہ داخل کیا۔ دو گواہ پیش کئے اور مارپیٹ کرنے کے الزام میں میرے خلاف قابلِ ضمانت وارنٹ جاری کرا دیئے۔ ابھی مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی ہے جس میں ضمانت دے کر آیا ہوں۔ باقاعدہ سماعت بعد میں ہوگی۔ اب چونکہ یہ معاملہ عدالت کے روبرو ہے۔ لہٰذا یہ بات یہیں چھوڑے دیتا ہوں، کچھ اور کہوں گا تو توہینِ عدالت کے جرم میں دھر لیا جاؤں گا۔

الطاف فاطمہ

بِیر بہوٹی

کتنی ہی دیر سے رفیع نہانے کو پریشان پھر رہا تھا اور کالج جانے کا وقت تھا کہ تنگ ہوا چلا جا رہا تھا۔ مگر اس غسل خانے میں جا کر نہانے کی ہمت بھی تو نہیں ہو رہی تھی جسے صبح صبح بچے دلدر خانہ بنا کر اسکول چلے دیئے تھے جگہ جگہ ٹوتھ پیسٹ کے لوندے گرانے کے علاوہ ادھر ادھر کلیاں کر کے ان پر مٹی بھرے جوتے رکھ رکھ کر ادھر سے ادھر چلنے کی بنا پر غسل خانے میں کیچڑ اور پھسلن ہو رہی تھی۔ دس بجے کالج اسپورٹس شروع ہونے والے تھے اور اب سوا نو ہو رہے تھے۔ اس نے تین چار بار سونو سے کہا تھا کہ غسل خانہ صاف کر دے تا کہ میں نہا لوں مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر نہایت اطمینان سے اپنے سیاہ، بچشارہ سے چہرے پر بڑی بڑی موٹی موٹی آنکھیں لئے فرش پر ٹاکی پھیرتی رہی تھی۔ بھورے نائٹ سوٹ کے کوٹ کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کھجاتے ہوئے نہایت مسکینی سے اس نے باجی بی سے رجوع کیا۔ "باجی بی، دیکھ رہی ہیں آپ؟ یہ کم بخت کتنی اڑیل ہے۔ اتنی دیر سے میں نہانے کو پھر رہا ہوں مگر مجال ہے جو غسل خانہ دھو دے۔"

وہ باجی بی کا خالہ زاد بھائی تھا مگر وہ سگے بھائیوں کی طرح اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھیں چنانچہ انہوں نے وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے اس کو جھاڑ پلائی۔ "کیوں ری کم بخت، سنتی نہیں کیا کہہ رہا ہے وہ؟ پھر وہ بڑبڑائیں۔ "کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھی ہے مردار۔"

اور مردار حسب عادت ٹاکی غصے سے پٹخ کر بڑبڑائی۔ "سن تو لیا۔ ہی تسی تو ائی کیوں ڈال دے او۔ ٹاکی لا لوں تو ۔ ۔ ۔ ۔"

انہوں نے وہیں سے اس کی بات کاٹی۔ "چل چھوڑ اسے۔ جا، جا کر پہلے غسل خانہ دھو کر آ۔ اسے دیر ہو رہی ہے۔"

چنانچہ وہ ٹاکی وہیں چھوڑ کر بیر بہوٹی ہوئی اٹھی اور پھر اس نے حسب عادت جھاڑو سنبھال کر بشیرے کو آوازیں دینا شروع کر دیں "او بشیرے شیرے! چل آ اپنے پیو نوں تُلا۔ پانی سٹ۔" اور اس کی آواز۔ اتنی کھرج دار اور موٹی تھی کہ ذرا انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس تین فٹ یا اس سے شاید کچھ انچ زیادہ کی ننھی کے اندر سے نکل رہی ہے۔

نفرت تھی رفیع کو اس کی اس پکی پکی عورتانہ آواز سے۔ تو خیر دس منٹ تک وہ اسی بے ہنگم آواز میں چلی پکار مچاتی رہی۔ پھر اس نے جھاڑو پٹخ کر اعلان کر دیا۔ "بی بی جی! بشیرا تو مر گیا کدھرے جا کر رن میں کی گران۔ رن پانی کون سٹے؟"

رفیع گومگو کے عالم میں کھڑا کبھی اس کی شکل اور کبھی اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس لئے کہ اگر وہ ہرڈل ریس، ڈسکس تھرو اور جویلین تھرو میں حصہ لینے بروقت نہ پہنچا تو پھر پی ٹی آئی صاحب اس کی اچھی خاطر کریں گے اور بعد میں سمجھ لیں گے کہ وہ اسپورٹ بیس کا ہی تو داخلہ تھا ورنہ کون اس جیسے تھرڈ ڈویژنر کو داخلہ دیتا اور وہ بھی سائنس میں ۔ ۔ ۔ ۔ قاعدے کی رو سے تو اسے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح منہ اندھیرے ہی سے گراؤنڈ میں موجود ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اور پی ٹی آئی صاحب دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ عین وقت پر ایک شان بے نیازی سے گراؤنڈ میں داخل ہوگا اور یوں

شاسٹ سارے ریکارڈ توڑ تاڑ، سارے چیلنج کپ اور ٹرافیاں سمیٹ سماٹ، ایک طرف جا کھڑا ہوگا۔ مگر اب تو کچھ اور ہی نظر آرہا تھا کہ یہ سو لو کم بخت کے چلتوں آج اسے ضرور ہی دیر ہوگی۔ بہرحال اس کم بخت کو اس کے مستقبل سے دلچسپی بھی کیا ہوسکتی تھی۔۔۔۔ مگر اب یہ غسل خانہ دھلنے کی کیا صورت ہو! یہ معمہ اس کی عقل سے بالاتر تھا کہ بالآخر پھر وہی باجی بی آڑے آئیں اور انہوں نے لحاف میں اور زیادہ گھس کر دبکتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔ "اے میاں، تو پھر تم ہی ڈال دو پانی کہ یہ کم بخت غسل خانہ دھو کر چھٹی کرے۔"

اسے یہ تو اس کی عقل میں آیا ہی نہ تھا۔ چنانچہ اس نے کوٹ کی آستین چڑھاتے ہوئے کہا "چل آئیں ڈالتا ہوں پانی۔"

اور جب وہ دیوار میں بنی ہوئی سیمنٹ کی ٹنکی سے پانی نکال نکال کر غسل خانے کے فرش پر ڈال رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ جان بوجھ کر پانی کی چھینٹیں اڑا اڑا کر اس کو بھگو رہی ہے۔ چنانچہ وہ اس پر غرایا۔ "کیا کر رہی ہے! کم بخت میرے کپڑے بھگو رہی ہے۔"

تب اس نے جھاڑو چلاتے چلاتے اپنا بندری ساخت والا موٹا ساٹھگواں ہونٹ ٹیڑھا کیا اور بڑبڑائی۔ "وڈا شنیل دا زری سوٹ ہے نا۔ ابھی تو نہا کر اتارنا ہے!"

وہ جب یوں ہونٹ بچکا کر اپنے مخصوص مکروہ انداز میں بڑبڑاتی تھی تو رفیع کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا، یہ اس کا نچلا ہونٹ مسل کر پھینک دے۔۔۔۔ مگر مجبوری تھی کہ ایسا کرنا اس کے پروگرام میں داخل نہ تھا۔ اور پھر اس وقت تو اس کو اپنی پڑی تھی۔

"اچھا چپ کر، دفع ہو۔" جلدی سے پانی سونت کر، اس نے فینائل کا ڈبہ ٹیڑھا کر کے فینائل فرش پر ٹپکاتے ہوئے کہا۔

پہلے تو خاموشی سے اس نے فینائل کو جھاڑو سے پانی میں ملایا اور پھر پانی سونت کر چلتے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا۔ "بس!"

پھر جب وہ باہر نکل رہی تھی تو اس نے اپنے کانوں سے اس کو کہتے سنا۔ "ہے کنا مطلبی۔ کام نے نتا تو آکھ دا ہے دفع ہو۔ آیا کہیں سے نواب دا پتر۔۔۔۔ جانے کتھوں آگیا ہے۔"

وہ ہمیشہ اس کو احساس دلاتی تھی کہ تم اس گھر کے فرد نہیں ہو بلکہ کہیں باہر سے آگئے ہو۔ چنانچہ اس بنا پر اس سے گستاخی کو وہ اپنا جائز حق سمجھتی تھی۔ حالانکہ کتنی مرتبہ باجی بی اس کو جتا چکی تھیں کہ خبردار جو کبھی تو نے رفیع کو جواب دیا۔

خیر تو اس گھڑی جب وہ غسل خانے سے بڑبڑ کرتی نکل رہی تھی تو رفیع کو محسوس ہوا کہ وہ اتنی چھوٹی نہیں ہے۔ جتنا وہ اس کو اب تک سمجھتا رہا ہے۔

شام کو جب وہ اپنے جیتے ہوئے کپوں اور ٹرافیوں سے لدا پھندا آیا تو بھائی صاحب سمیت سارا گھر جدھر اکسائیٹڈ ہو گیا اور بھائی صاحب نے تو اسی وقت بشیرے کو گرما گرم جلیبیاں لانے کے لئے دوڑا دیا!

اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلا تو سو لو اس دن بھی لوگوں کے اکسائٹ منٹ سے فائدہ اٹھا کر جو کام چھوڑ کر چمپت ہوئی تھی اس میں رفیع کا کمرہ بھی شامل تھا۔ اور پھر دوسرے دن یہ حرکت کی تو وہ اسپورٹس کے دوسرے دن ہونے والی چھٹی سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے خیال سے لحاف میں دبکا پڑا تھا تو وہ آئی اور پورے زور سے جھاڑو دری پر پٹخ پٹخ کر نہ جانے کب کب کی گرد اڑانا شروع کر دی۔ جب سارا کمرہ غبار میں گم ہو تا دکھائی دینے لگا تو لیٹے لیٹے اس نے لحاف منہ پر کھینچ کر اس کو گھرکا۔ "کم بخت، کمینی، مانے گی نہیں!

"زبان سنبھالو اپنی رفیع صاحب۔" اس نے نہایت ٹیڑھے پن سے جواب دیا۔

"تجھے شرم نہیں آتی؟ اتنی سی لڑکی اور جواب دیتی ہے پوری پکی عورتوں کے سے!"

عاجز ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے چاروں طرف لحاف لپیٹتا باہر کو چلا تھا کہ وہ جھاڑو چھوڑ کر پھدکتی ہوئی اس کے بالکل نزدیک آ کر پھنکاری پوری پکی عورتوں کی طرح۔ "ہونہہ رفیع صاحب ہیں اتنی سی چھوکری نہیں ہوں۔ پورے سولہ سال کی ہوں۔" اس نے اپنے کو تانتے اور پھلاتے ہوئے کہا۔

اس کا لٹکا ہوا ہونٹ کچھ اور بھی ٹیڑھا ہو رہا تھا اور ناک سکڑی ہوئی تھی اور اس کو یوں اس انداز میں کھڑا دیکھ کر وہ کچھ دہشت زدہ سا ہو گیا۔ پھر وہ اس کو یوں تین چار سیر روئی کے لحاف میں لپٹا کھڑا دیکھ کر ایک دم سے کھل کھلا کر ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

تو پھر سیدھا وہ باجی بی کے کمرے میں پہنچا جو بچوں کو رخصت کر کے اب بستر درست کر رہی تھیں اور اس کو یوں آتا دیکھ کر معترض ہوئیں

"اوئی میاں، نہ کوٹ نہ چیسٹر یہ پورا تھان کا تھان لحاف لپیٹے پھر رہے ہو۔ شاباش ہے تم کو!"

"باجی بی!" اس نے دیوار کے ساتھ والی چوکی پر بیٹھتے ہوئے تمہید اٹھائی۔

"ہاں کیا ہے؟ ہونق کیوں ہو رہے ہو؟" وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسیں۔

"کیوں، کیا میں ہونق ہو رہا ہوں؟" اس نے اپنے چہرے کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کی۔ "باجی بی۔ یہ سوجو ہے نا کم بخت۔ ۔ ۔" وہ رکا۔ "آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتیں؟"

"اے لو اور سنو۔ اس کو نکال دوں اور اپنی جان غضب میں کر لوں!" پھر انہوں نے دبے ہوئے لہجے میں وہی قدیم دکھڑا شروع کر دیا۔ "اے بھیا کہاں ملتا ہے آٹھ روپلی میں جمعدار۔ اب تو بھیا حال یہ ہے کہ پچیس سے کم نہیں مانگتے اور کام وہی اڑا پڑا۔" انہوں نے اپنی آواز اور دبائی ——— "وہ تو یہ کہو کچھ تو یہ ہیں ہی غریب اور کچھ اس کی ماں گیگلی ہے جو تنخواہ بڑھانے کا نام نہیں لیتی۔"

"مگر یہ سوجو ہے کتنی بڑی جو آپ اس کو اس سے زیادہ دیں؟" رفیع کا خیال تھا کہ وہ آگے چل کر وکالت کا امتحان پاس کرے گا چنانچہ اس کی چلائی ہوئی بات فوری طور پر کارگر ہوئی۔

"اے ہے یہ کم بخت تھی ہے کوئی! اے یہ تو پندرہ سولہ برس کی ہے!" اب ان کی آواز پھر کراہن کی طرف مائل تھی۔ "دیکھنے میں مگوڑی دس گیارہ برس کی نظر آتی ہے۔"

"پھر تو یہ تقریباً بوڑھی ہوئی اور وہ بھی نہایت بدتمیز ——— اب یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ——" وہ ہکلایا اور کچھ رکا —— "کہ کم بخت صبح صبح کمرے میں دھول اڑانا شروع کر دی۔ —میرا تو دم گھٹ گیا۔"

"اے ہے، خدا کی مار اس پر۔ صبح ہی منع کیا تھا کہ وہ سو رہا ہے۔ پہلے دوسرے کام کرلے جب تک۔ مگر اس کو تو ہر بات الٹنے کی لت ہے۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔۔۔" مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے غسل خانے سے ایک شور قیامت اٹھتا سنائی دیا۔

بشیرا شور مچا مچا کر فریاد کر رہا تھا: "بی بی۔ اے سوہنیوں گا کان کوڑدی اے۔"

"ہے ہے! سوجو نامراد۔ جدھر جاتی ہے وہیں سے اس کی فریاد آتی ہے۔" باجی بی ادھر جانے کی مڑی ہی تھیں کہ آگے آگے بشیرا اور اس کے عقب ہی سوجو داخل ہوئی۔

آتے ہی اس نے پہل کی۔ "اے دیکھو بی۔ بشیرے نے منہ بھیموں دیا۔"

اور اسی دم باجی جی کی ہمدردیاں سولو کے ساتھ ہو گئیں۔ "اے بشیر کچھ ہوش درست ہیں تمہارے؟ شرم نہیں آتی اس سردی میں اس کو بھگو دیا۔ آنے دو صاحب کو، آج نہ پٹوایا۔ ہو تہیں۔ اے ماں! کچھ ننھے سے تو ہو نہیں۔ وہ بھی سیانی ہے۔ خبردار! جو اس سے مذاق کیا۔"

حالانکہ اس نے مذاق ہرگز نہ کیا تھا۔ کچھ دن سے سولو نے یہی وطیرہ اختیار کیا تھا۔ وہ سامنے آیا اور بشیرے، بشیرے کہہ کہہ کر ٹھٹے لگانا شروع کر دیتی۔ ساتھ ہی اس کی "نکمیح" یا "ستھن" کے میلے پھٹے ہونے کا بار بار اعلان کرتی، اتنی اونچی آواز میں کہ بشیر کے ضبط کا پیمانہ آخر کہاں تک نہ چھلکتا۔

مگر بشیر ابتی جی کے اس اعلان پر ہونق رہ گیا تھا کہ سولو ایک سیانی لڑکی ہے۔ اس نے ان کی بات کی تصدیق تو کی، البتہ مضحکہ خیزی کا اندازہ لگانے کو مڑ کر دیکھا تو سولو اپنے سیانے پن کے اعلان کو سن کر فخریہ اپنے آپ کو پھلائے اور تانے کھڑی تھی۔

پھر باجی بی نے ایک دفعہ گھوم کر سولو کو تنبیہ کی۔ "اور ہم تمہارا کیا علاج کریں کہ تم ایک ایک کے منہ آتی ہو؟"

"میں بتاؤں؟" رفیع اب لحاف پھینک کر وہیں جا کھڑا ہوا اور ہکلا کر بولا "ان کے لگائیے دو جوتے اور کہیے کہ اپنے جامے میں رہا کریں۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ — کہ —" وہ پھر اس کو دیکھ کر ہکلا گیا۔

اور اتنا سننا تھا کہ اس نے تن تنا کر جھاڑو پھینکی اور یہ جا وہ جا۔

اور باجی بی پھر اس کی جان کو آ گئیں۔ "اے بھیا، تم نے غضب کر دیا۔ دیکھا اب وہ مردار نکل گئی۔ اب یہ بشیر مردے تھوڑی کریں گے جھاڑو جھٹکا۔ فوراً نوٹس دے دیں گے، ہمارا حساب دے دیجیے۔ بھئی اصل میں تو ہماری جان غضب میں ہے۔ ہم نہ اتنا پیسہ خرچ کر سکتے ہیں اور نہ گندے میلے میں بیٹھ سکتے ہیں۔"

"بس بس میں سمجھ گیا۔" وہ ذرا تیزی سے بولا۔ "آپ ہی نے بگاڑا ہے اور یہ سب پر شیر ہوتی جاتی ہے۔ پہلے چپ چاپ آتی اور کام میں لگ جاتی تھی۔ اب تو بالکل دماغ ہی چل گیا ہے۔"

"اے میں کیوں بگاڑتی۔ بھئی قصہ یہ ہے کہ یہ اپنے ماموں کے لڑکے سے منگی ہوئی تھی شروع سے۔ اب یہ رہ گئی ٹھٹری شٹراق اور وہ نکلا ہے یہ لمبا پونگا۔ اور پلٹن میں نوکر ہو گیا ہے۔ اب اس نے منع کر دیا کہ میں تو نہیں کرتا۔ آٹھ دس سال کی لونڈیا لگتی ہے۔ اس دن سے اس پر شیطان سوار ہے۔" پھر وہ ذرا رازداری میں بولیں۔ "اس دن آئی تھی نا جاگاں۔ بڑا رو رہی تھی کہ بھاوج مجھ سے جلتی ہے بچپن کی مانگ تھا دی حالانکہ لڑکا خود ہی راضی نہیں اب یہ ہے کہ ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔"

چھٹی کا دن تو یوں غارت ہوا۔ دوسرے دن شام کو کالج سے لوٹا تو پتہ چلا کہ سولو کل شام آئی نہ آج دن بھر آئی تو پھر باجی بی نے یہ فیصلہ سنایا کہ وہ بہ نفس نفیس یعنی خود جا کر سولو کو جس کا اصلی اور بہنسے کا نام روز امین تھا، بلا کر لائے۔ اس لیے کہ اگر بشیرے کو مجبور کیا وہاں جانے پر تو وہ اپنا حساب مانگنے کھڑا ہو جائے گا۔ "اے میاں کیا کریں۔ بات یہ ہے کہ ہم اسے دیتے ہی کیا ہیں۔ اتنی تھوڑی تنخواہ دے کر ہمیں تو دبنا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ چل دے گا۔"

بس ٹھیک ہے۔ سولو کی تنخواہ کم ہے۔ بشیر کی تنخواہ کم ہے۔ سب سے دبنا پڑے گا۔ ہماری کون سی تنخواہ بندھی ہے جو ہم سے کوئی دبے گا۔

وہ پھٹ پھٹ پیر پٹختا جلتا، اسے بلانے روانہ ہوا۔ پھر اس نے وہ ساری سڑک عبور کی اور کارخانے والے احاطے سے گزر کر اس خستہ، بونا گی زرد کوٹھی میں داخل ہوا اور پھر اس سیاہ بدبودار کیچڑ کی دلدل کو اینٹوں کی اس لمبی قطار پر چل کر پار کیا جو کوٹھی سے چل کر ملازموں کی کوٹھڑیوں تک پہنچنے کے لئے آگے پیچھے رکھ دی گئی تھیں۔

اور جب اس نے سولو کے دولت کدے یعنی بھاڑ سے منہ نشق ہوتی اور سرکتی دیواروں والے گیراج کے آگے والی دو ڈھائی گز خشک زمین پر کھڑے ہو کر بھاگاں کو آواز دی تو سولو نے جو پرے پتے چولھے کے پاس نہائی دھوئی اور فیشن وار بال بنائے پیڑھی پر چڑھی بیٹھی تھی، اس کو دیکھ کر اپنا لٹکا ہوا ہونٹ بچکایا اور پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ تاہم وہ بھاگاں کو پے در پے آوازیں دیتا رہا تو بھاگاں ہمیشہ کے سے گیگلے پن اور خود لا خبطا حالت سے باہر نکلی۔ "آؤ جی، رفیع صاحب! ساڈی حال ہے۔ سنی سولو منجی لا کے پا۔" سولو بدستور منہ پھیلائے بیٹھی رہی تو وہ خود ہی لپک کر منجی لے آئی۔ "آؤ جی بیٹھو۔"

وہ جل کر خاک ہو گیا گویا وہ اس نازک وقت میں یعنی کالج سے آتے ہی اور بغیر چائے پئے صرف بھاگاں سے ملاقات اور گپ کے ارادے سے آیا تھا۔ چنانچہ وہ خفا ہو کر بولا۔ "کیا مذاق ہے! ہفتے میں تین دن تمہارے دروازے پر حاضری دو تو یہ بیگم صاحبہ کام کرنے آئیں گی۔"

بھاگاں کی ہونق اور سوالی صورت دیکھ کر اس نے وضاحت کی "یہ کل سے جھاڑو پھینک کر جو غائب ہوئی ہے تو اب تک صورت نہیں دکھائی۔" اس نے سولو کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں کنجریے، کتیے" بھاگاں سولو پر جھپٹ پڑی۔ "دس مینو تو کتھے سی۔"

"کتھے سی! ہونہہ!" اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیا اور اپنے آپ کو پھلانا اور تاننا شروع کر دیا۔

اب رفیع کا جی چاہا کہ چولھے کے پاس پڑی پھکنی لے کر اس کو کوٹ کر ڈال دے۔ مگر اس نے صرف اسی پر اکتفا کی کہ بھاگاں کو مشتعل کرانا شروع کر دیا۔ "دیکھا، کیسی زبان چلاتی ہے اور کام کے نام پر دم نکلتا ہے۔ چل اٹھ . . . . . صبح سے کام پڑا ہے۔"

"پڑا ہے تو پڑا رہے! ہمارا کوئی ٹھیکہ ہے؟ کروا اپنے بشیرے، شبیرے سے۔ اور پھر غصہ کرتے کرتے اچانک وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ رفیع اس کی اس حرکت پر حیران رہ گیا۔

پھر اس نے بھاگاں کی گالیوں کے جواب میں کہا۔ "میں نہیں جا رہی کام کرنے۔ بھیج نا اپنے منڈے نوں۔ کڑی نوں . . ."

چنانچہ شاید یہ خیال بھاگاں کو خاصا پسند آیا اور وہ فوراً ہی منڈے اور دوسری کڑی کو فراہم کرنے دوسری سمت کو لپک لی۔ ناچار رفیع کو بھی انہوں اینٹوں پر سے جنہیں بھاگاں نے بڑی سرعت سے پھلانگ لیا تھا، افتاں و خیزاں اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا اور اب وہ گیراج کے پرلی طرف والے میدان میں تھے۔ جہاں بچوں کا ایک غول، دھول میں اٹا، کھیل میں مست ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ "نی مریو، منے جوسف۔"

اور بچے کم بخت اتنے حراف کہ اس کی آواز سنتے ہی ادھر ادھر لکنے چھپنے لگے۔ وہ آخر ان ہی کی تو ماں تھی۔ اس نے بھی ان کو کھدیڑنا شروع کر دیا۔ بچے مستقل جھونک دے دے کر اس کی زد سے باہر ہو رہے تھے اور پھر تالیاں بجا بجا کر اس کی شکست پر جشن منا رہے تھے۔ خصوصاً جوسف (جوزف)، تو اتنا کم بخت تھا کہ اپنے میلے چکٹ کوٹ کی کاٹھے اخروٹوں سے پھولی جیب پہ ہاتھ رکھے قہقہے لگا رہا تھا۔ لڑکے کی نا اہلی اور بیکاری پر اس کا جی چھوٹ گیا اور کیچڑ میں پھنستے ہی وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "میری تو آنکھ کو بیٹی تھی،

اس کو ترس آگیا اور اس نے از خود اپنے آپ کو پکڑوا دیا مگر وہ بزعم خود یہی سمجھ رہی تھی کہ مریو کو اس نے اپنے دم خم سے زیر کیا ہے چنانچہ اس نے اس کے اجڑے ہوئے بالوں کو جی بھر کر گھسوٹا اور رفیع کی طرف دھکا دے کر اس کو حکم دیا۔ "چل تر رفیع صاحب دے نال۔"

پھر وہ معذرت کے طور پر اس کے قریب آئی اور تقریباً اس کے کان میں منہ ڈال کر بولی۔ "جی کیا کروں، لونڈیا تو بدمعاش نکل گئی۔"

پھر اس نے جلدی جلدی پھس پھس کرتے ہوئے اس کو کل کی روداد سنائی کہ کس طرح میجر صاحب آئے اور پھر کس طرح وہ ان کے اردلی سے فلرٹ کرتی ہوئی پکڑی گئی۔ میجر صاحب اس کوٹھی کے داماد تھے چنانچہ ان کے اردلی اور جوان آیا جایا ہی کرتے تھے اور ادھر ہر دوسرے تیسرے دن ہی باپ سولو کی کٹائی کر رہا تھا۔

"لاحول!" رفیع نے کہا اور "مریو" کو اپنی کڑی نگرانی میں لے کر چلا کہ مبادا وہ ادھر ادھر چھپے ہوئے بچوں کے اشارے دیکھ لے اور وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔

تو اس کے بعد سے روز لین یعنی سولو کا معمول یہ ٹھہرا۔ تین چار دن بڑی خاموشی سے سر جھکائے آتی اور قاعدے سے کام کر کے چلی جاتی سارا گھر خوش خوش نظر آتا کہ اب آگئی راہ پر کہ اچانک ہی اس پر ایک دورہ سا پڑتا۔ ایک ایک کے منہ آتی اور بات بات پر زبان چلاتی۔ جان بوجھ کر نقصان کر دیتی۔ پھر خوب ہنستی۔ باجی بی بھی اب تو اس سے عاجز ہو چلی تھیں، نوکروں کا کیا ہے۔ آتے جاتے رہتے ہی ہیں۔ بشیرا بے چارا تھا تو گینگلا سا پر کام خوب کرتا تھا۔ اس کو بھی محلے والوں نے ورغلا لیا تو اب کے گل زمان آگیا۔ کام تو ایسا ویسا ہی کرتا پر اسے غرّانا اور رانگ ڈپٹی کرنا خوب آتی تھی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب پورے دو مہینے تک رفیع کو ایک دن بھی سولو کے گھر کی حاضری نہ دینا پڑی تھی۔ مگر باجی بی کو اس کی ادائیں سخت ناگوار گزرتی تھیں "بھئی ہمارے گھر میں سیانی بچی ہے۔" وہ جب اپنی سب سے بڑی آٹھ سال کی بچی کا حوالہ دیتیں تو پھر رفیع کا ایمان سولو کے سیانا ہونے پر سے بھی اٹھنے لگتا۔

پھر یہ ہوا کہ گل زمان بھی رخصت ہوئے اور خلاف معمول باجی بی اس مرتبہ نوکر کے نکل جانے سے غم زدہ ہونے کے بجائے مطمئن تھیں۔ اگرچہ گل زمان کے آنے سے سولو کی اس سے لڑائیاں بڑھ گئیں تھیں اور وہ ذرا سی بات میں اس پر جھاڑو تک تان کر کھڑی ہو گئی تھی لیکن اس کے چلے جانے پر وہ ذرا بھی خوش نہ ہوئی بلکہ اس کا ردعمل یہ تھا کہ وہ اسی شام غائب ہوئی اور دوسری صبح اتنی دیر میں منہ پھلائے ہوئے آئی کہ باجی بی اس کے آنے سے مایوس ہو چکی تھیں۔

سولو کا پارہ گویا پھر چڑھا رہتا تھا کئی دفعہ اگلی ملی کو آنا پڑتا تھا اور وہ نہایت ڈپلومیٹک طریقے پر باجی بی سے بیٹھ کر گزری کے سکینڈل کیا کرتی۔

ان ہی دنوں کالج میں کیڈٹس بھرتی کرنے والے آئے اور دو ہفتوں کے اندر اندر رفیع کو اپنا بوریا بستر سنبھال کر پی ایم اے جانا پڑا۔ پہلی ٹرم پوری کرنے کے بعد چھٹی گزارنے کا سوال آیا تو ساتھ ہی ابو جان کی نئی بیگم کی اس ناگواری کا خیال بھی لایا جو وہ اس کو دیکھ کر محسوس کرتی تھیں اور جس کی بنا پر وہ ہمیشہ اپنی خالہ زاد بہن باجی بی کے پاس رہتا تھا۔ چنانچہ وہ لازماً یہیں واپس آیا تو گھر میں کئی انقلاب آ چکے تھے مثلاً آمدنی میں اضافے کے خیال سے باجی بی نے مرغیاں پال لی تھیں جو دن بھر اپنے جالی دار ڈربے میں کٹ کٹ کیا کرتی تھیں اور ان کی بیٹی زبیدہ جس کو وہ ہمہ وقت سیانی کے لقب سے نوازتی تھیں، واقعی اب سیانی ہو چلی تھی کہ اس کی ساری شلواریں تنگی اٹنگی ہو گئی تھیں جن کو پہنتے وقت وہ دھاریں روتی۔ اس کی اٹنگی شلواروں پر اچانک اس کو سولو کا خیال آیا جس کا قد قدتوں سے ایک ہی نامناسب سے مقام

پڑا کر رک گیا تھا اور وہ مزے سے زبیدہ کی پرانی شلواریں شکائے پھرتی تھی۔

ارے ہاں، واقعی، وہ تو اب کی نظر ہی نہ آئی تھی۔ رفیع کو اپنے جانے سے پہلے کا وہ واقعہ یاد آگیا جب سولو نے اس کو واقعی سہما دیا۔ بات تو خیر ایسی کوئی خاص نہ تھی۔ کچھ وہ ہی اتنا بودا تھا کہ سچ مچ ڈر ہی گیا اور قصہ صرف اتنا تھا اس دن شام کو جب کالج سے واپس آیا تو وہ یونیورسٹی کیڈٹ کور کی وردی میں تھا اور سولو اس کا کمرہ صاف کر رہی تھی۔ وہ اس کو وردی میں دیکھ کر چونکی اور اپنا لٹکا ہوا ہونٹ حقارت سے ٹیڑھا کر کے بڑبڑائی: "رفیع صاحب، ایڈا لما ہو گیا!" ــــ پھر اور بھی حقارت سے بولی۔ "میرے مامے دا پتر وی تہاڈا ہی جیسا لمبا اونٹ ہے۔" پھر وہ اس کے قریب آئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "رفیع صاحب، ہن تسی وڈے ہو گئے۔"

پتہ نہیں کیوں وہ بوکھلا سا گیا تھا۔ "کیا بک رہی ہے؟" ــــ اس نے اس کو گھرکا مگر وہ خود کو بے طرح غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح لگا جیسے ایک بڑھتی ہوئی مگر کچی کچی عمر کے لڑکے کو کسی گھاگ سی پکی پکی خاتون کی غلط غلط سی نظر کا احساس کرنے کے بعد لگتا ہے۔

مگر وہ اس کی گھرکی کی پرواہ کئے بغیر ایک بھونڈے انداز میں کہتی رہی تھی۔ "تمہارے تو مونچھیں آ رہی ہیں رفیع صاحب۔ تم پلٹن میں کیوں نہیں ہو جاتے؟ تم کو وردی بڑی سجتی ہے۔ تم نے ساڈا میجر صاب دیکھا ہے؟"

"باجی بی ــــ اس کو بلا لیجئے۔ سولو کو ــــ نہیں تو ــــ نہیں تو میں اس کو مار ڈالوں گا ــــ" نہیں معلوم اس کے حلق سے کیسی آواز نکل تھی۔ ۔ ۔ ۔

البتہ باجی بی گھبرا کر ضرور اس کی مدد کو آ گئی تھیں تو انہوں نے کیا دیکھا کہ وہ مزے سے جھاڑو پکڑے ہونٹ ٹیڑھا کئے بالکل اس کے سامنے کھڑی ہے اور ڈھیٹوں کی طرح ہنس رہی ہے۔

"اری کم بخت، نہیں باز آئے گی؟ دس دفعہ کہا ہے کہ وہ کمرے میں ہو کمرے تو دھول نہ اڑایا کر۔"

"تو! میں نے کب اڑائی دھول؟ میں تو ان سے یہ بول رہی تھی کہ تم پر یہ وردی سجتی ہے۔ تسی پلٹن وچ ہو جاؤ۔ بیم صاحب ہن رفیع صاب کنا اونچا لما ہو گیا ہے!" وہ ہنسی۔

"چل مردار ــــ" وہ بھی ہنسیں اور مڑ گئیں۔ "میں سمجھی تو نے اس کی کوئی چیز توڑ دی ہے یا اس کے منہ پر دھول جھاڑ دی۔"

اور وہ اس کے پکے دل پر حیران رہ گیا تھا۔

ہاں تو وہ اس بار نظر ہی نہ آئی اور اس کے بجائے پانچ فٹ دس انچ کے قریب ایک لمبی کھپٹ سی خاتون جھاڑو میں لگاتی اور ٹانگیں مارتی نظر آئی تو وہ بہت ہنسا۔

باجی بی آپ نے سولو کے گٹھے پن کا بدلہ چکا دیا ان خاتون کو رکھ کر ــــ پھر بھی اس سے تو بہتر ہوں گی یہ"

"اے مٹھو، خاک بہتر ہیں۔ کم بخت عورت کیا ہے اچھا خاصہ کھسرا ہے۔ اے وہ کم بخت بہت غنیمت تھی مگر اب تو اس کا باپ اس کو نکلنے ہی نہیں دیتا۔ اسی کی ماں ان دیوانی کو رکھوا گئی ہے۔ سچ کہتی ہوں، آدھی سٹرن ہے۔"

چنانچہ دو تین دن میں وہ کھسرے کا بھی عادی ہو گیا۔ جو کام کم کرتی اور باتیں زیادہ ۔ ۔ ۔ اور سولو کا تو نام آتے ہی وہ اس میں کیڑے ڈالنے بیٹھ جاتی۔ اس کو سارا اعتراض تو یہ تھا کہ "سولو سائیاں نال کرتی تو کچھ نہیں، وہ تو مسلماناں نال ــــ" پھر وہ بات ادھوری چھوڑ کر

روٹی مانگنے یا قمیض کا مطالبہ کرنے بیٹھ جاتی۔

"بات کچھ نہیں۔ وہ تو بس میجر صاحب کے اردلی اور ڈرائیور سے فلرٹ کرتی ہے۔" باجی جی یقین دلائیں۔

اب وہ ایک سال وہاں رہ کر خود کو بہت تجربہ کار اور ہر موضوع پر بات کرنے کا اہل سمجھنے لگا تھا چنانچہ اس نے بڑے فلسفیانہ انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے باجی بی کہ آپ کی سولو کی ساری تکلیف اور کمزوری تو یہ دردی ہے جو اس کو دل وجان سے پسند ہے، اور جس کو پہن کر اس کے مامے کے پتر نے اس کو ٹھکرا دیا۔ اب ہے کدھر وہ؟" نہ جانے کیوں اس کا دل اس کو دیکھنے کو چاہنے لگا۔

"اے سنا ہے دس پندرہ دن سے اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں وہ لوگ۔"

"سنا بی جی! گھسرے نے ایک صبح صبح آ کر خبر دی۔ "سولو کا بیاہ ہو گیا۔"

"اے ہٹ نگوڑی کیا اسی ماموں کے لڑکے سے؟" باجی بی کی باچھیں کھل گئیں۔ نہ جانے ان کو سولو سے کیوں اتنی محبت اور ہمدردی تھی۔

"کوئی نہیں۔" گھسرے نے اپنے سوکھے چمرخ سے بچے کو گودی میں جاتے ہوئے کہا۔ "او تھے پنڈ میں ایک بندہ ہے اوہ دی نانی فوت ہو گئی۔ ادھا سر چٹا ہے۔۔۔ اپنا جمعدار تو اس کے آگے لڑکا معلوم ہوتا ہے۔" گھسرے کو اپنے جمعدار پر بہت ناز تھا جس کا اس سے صرف اتنا واسطہ تھا کہ مار کوٹ کر ساری تنخواہ چھین لے اور پھر لمبا کرتا اور چوڑے چوڑے کنارے والا لاچا زیب تن کر کے ادھر ادھر مارا پھرے۔

نہ چاہنے کے باوجود رفیع بڑی دیر کھڑکی سے باہر کھڑا دیکھتا اور سوچتا رہا۔ پھر وہ لال جوڑا پہن کر اور رنگ کے چھینٹے پڑی سفید چادر اوڑھ کر اپنے آدھے چٹے سر والے خاوند کے پیچھے پیچھے گرجا میں داخل ہوئی ہوگی۔ اس نے ضرور عقد کرنے والے خوبرو پادری کو دیکھ کر حقارت سے اپنا لٹکا ہوا ہونٹ پچکایا ہوگا۔ کہیں وہ ٹھٹھا مار کر ہنس نہ پڑی ہو اور اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے کو ناچنا اور پھلانا نہ شروع کر دیا ہو۔۔۔ اچھا ہوا جو اس کا یہ حشر ہوا۔

پھر جس شام اس کو سوار ہونا تھا اس صبح بھاگاں آتی نظر آئی اور اس کو دیکھ دور ہی سے بولی۔ "آہا ساڈا رفیع صاحب، آ گیا! اسلام۔"

"سلام۔ اچھی تو ہو بھاگاں؟ وہ وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بولا۔

"اری سولو، تو کہاں؟" باجی بی کی خوشی میں تیرتی آواز نے اس کو چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ باجی بی مارے خوشی کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں اور وہ اپنے لال سرخ کپڑوں میں اور بھی سیاہ نظر آ رہی تھی۔ "اری چپکے چپکے بیاہ کر لیا! جو مجھے خبر ہوتی تو تجھے جوڑا دیتی۔"

رفیع نے بغور اس کی طرف دیکھا اس کی موٹی موٹی ڈھیٹ آنکھیں بالکل خاموش اور کچھ کچھ جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا لٹکا ہوا ہونٹ بہت کچھ ہموار نظر آ رہا تھا اور اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اور بھی مختصر اور بچی سی نظر آ رہی تھی۔

پھر جب وہ افسردہ سی ایک طرف بیٹھی زبیدہ کو اپنی کانچ کی چوڑیاں گنوا رہی تھی تو باجی بی نے بھاگاں کو ٹٹولا۔ "اری کیا کیا دیا تو نے؟ وہاں سے کیا آیا؟ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ہمیں تو بتا دیتی۔"

بھاگاں ٹھس ٹھس رونے اور ناک سڑکنے لگی۔ "بیگم صاحب جی۔ ایک جوڑے اور چار برتنوں سے کڑی اشادی میں نے تو۔"

"اور ادھر سے کیا چڑھا؟"

"منواہ تیھر بیگم صاحب جی، دو جوڑے لائے۔ وہ بھی اتنے بڑے اور لمبے کہ میں نے لوٹا دیے۔ اور چاندی کی بالیاں، بس۔ وہ کہتا ہے زنانی کے دوا معالجے میں سب پیسہ اٹھ گیا تھا۔"

"اری تو رنڈرے کو کیوں دے دی؟" باجی بی تو اتنی خفا تھیں کہ حد نہیں۔

"بس جی نصیب اس کا" اور وہ سر جھکائے اپنے کالے کالے ہاتھوں میں مری مری سی مہندی رچائے بیٹھی تھی اور آج شام وہ بھی ہفتہ بھر رہ کر اپنے خاوند کے ساتھ جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں رفیع کا دل ڈوبنے سا لگا تھا اور وہ عجیب اوٹ پٹانگ سی باتیں سوچنے لگا تھا۔ یہ بھی تو ایک لڑکی تھی جو ماں باپ کی آمدنی میں برابر کا اضافہ کر رہی تھی۔ آٹھ باجی بی دیتی تھیں۔ چار خانصاحب کے یہاں سے اور دس چودھریوں کے یہاں سے لاتی تھی۔ پھر کیوں اس کو اس کی مرضی کے بغیر آدھے چٹے سر والے کے حوالے کر دیا گیا؟ پھر کیوں اس کو ایک جوڑے اور چار برتنوں سے اٹھایا گیا جب کہ چودھری صاحب کی بیٹی کے جہیز میں مبالغے کو اتنا روا رکھا گیا کہ ریڈیو گرام اور ریڈیو اور ٹرانسسٹر کے علاوہ ٹیلیویژن بھی دو تھے، ایک بڑے سائز کا اور ایک چھوٹا دستی۔ جس نے اپنی تمام عمر میں پڑھنے کے سوا کچھ نہ کیا مگر دولہا اپنی پسند کا ڈھونڈا۔

پھر وہ اپنی حماقتوں پر خود ہی ہنسا۔ اس نے ٹائم ٹیبل میں اپنی گاڑی کا وقت دیکھا اور ایک اچھے اور سچے کیڈٹ کی طرح اپنا سامان خود پیک کیا۔ باجی بی نے اس کے ساتھ انڈوں کا حلوہ کیا تھا اور گزک کا ڈبہ۔ اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا سویٹر دیتے ہوئے تلقین کی تھی۔ "اے نم سردی نو کھانا اپنا خیال رکھا کرو۔" پھر بھی آنسو تھے کہ اس کی آنکھوں میں ڈھلکتے ہی چلے آ رہے تھے۔ تب انھوں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا تھا۔ "جاؤ اللہ کی حفاظت میں دیا ہے۔"

جب ریل کا انجن فراٹے بھرتی آگے کو لپکی تو اس کو خیال آیا، اسی ریل کار میں وہ بھی تو بیٹھی ہوگی اپنے آدھے چٹے سر والے خاوند کے ساتھ۔ ان ہی لال سرخ کپڑوں اور مری مری سی رنگت والی مہندی سمیت۔ تھوڑی جھکی ہوئی آنکھوں میں سویا ہوا ڈھیٹ پن اور لٹکے ہوئے ہونٹ کی ننھی ننھی سی ہمواری کو لپیٹے ہوئے۔ پھر اچانک ہی اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ بیر بہوٹی ہو جس نے کسی ہاتھ کے لمس سے سہم کر اپنی ہر چیز کو جس سے وہ عبارت تھی اپنے اندر سمیٹ لیا ہو۔

ڈب ڈبا کے بہت سے آنسوؤں کو اس نے بمشکل پیا اور فر فر اڑتی ہوئی ریل کار کے ڈبے سے منہ نکال کر ہرے بھرے مسکراتے کھیتوں کو بڑے چاؤ سے دیکھنے لگا۔

محمد احسن فاروقی

عشق کا دوران

عارف نے اپنے دوست سلیم کا خط لفافہ میں واپس کر کے میز پر رکھ دیا۔ آرام کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگار سلگایا اور دھواں اڑانے لگا۔ "ناہید کے لئے ویسی ہی ساڑھی جیسی تم نے پارسال بھیجی تھی صرف رنگ پیازی ہو لے کر ہفتے کی شام کو آجاؤ۔" خط کے یہ الفاظ اس کی نگاہوں کے سامنے تھے۔

"ساڑھی ایک سو پچیس کی تھی۔ اتنے ہی روپیہ کی اور لوں۔ دام ڈیڑھ گنے ہو گئے ضرور بڑھ گئے ہوں گے اور پچیس روپیہ آنے جانے کا کرایہ۔ دو سو روپے کا لگا ہے۔ اب تک مزے ہی میں ہیں۔ صاحبزادے اور صاحبزادے سے زیادہ صاحبزادی۔ ناہید۔ دو سو روپے ان پہ میں صدقے کر دوں؟"

ایک سال پیشتر وہ یہ سوال نہ کرتا۔ فوراً آفس چھوڑ کر کار میں بیٹھتا۔ ساڑھی لانا ہفتے کا انتظار میں ہوں کا شام ہوتے ہی چھٹی لے کر فوراً روانہ ہو جاتا۔ راستے بھر ناہید کی صورت آنکھوں کے سامنے ہوتی۔ اس کے یہاں پہنچ کر ناہید کو ساڑھی دیتا۔ وہ کس قدر خوش ہوتی۔ اس کے چہرے پر وہ دل کش سرخی وہ پُراسرار حسن آجاتا جو جادو کی طرح اس کے سر پر سوار تھا۔ مگر اب! کیا وہ اب ایسا کرنے کو تیار تھا؟ دوست کی مروت میں کر بے گا ضرور۔ مگر ناہید کو دیکھنے اسے خوش کرنے اس کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کئے جانے کا شوق! اب کہاں گیا؟ وہ کیا ہو گیا تھا! ایک دورہ پڑا تھا۔ اس کی شدت سے یاد آتی ہے۔ ناہید کا چہرا کیسا آنکھوں میں کھپ گیا تھا۔ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے ہر وقت کھیلا کرتی تھی۔ دل عجیب طرح بے تاب ہوا کرتا تھا۔

نہیں، پہلی نظر والی محبت کا سوال نہیں تھا۔ وہ سلیم کی شادی میں شریک ہوا تھا اور اس کے دو ہی دن بعد سلیم و ناہید اس کے بنگلے میں اس کے بیڈروم کے اندر گھسے چلے آئے تھے۔

"یہ ناہید تم سے ملنے کو بے قرار تھی۔ میں نے تمہارا بہت ذکر کیا تھا۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ ناہید کبھی الگ نہیں ہوئے۔ سوچا کرتے تھے کہ ہم دونوں سگی بہنوں سے شادی کریں گے۔ مگر ناہید تمہارے کوئی سگی بہن ہی نہیں ہے . . ." سلیم یہ سب کہتا رہا تھا۔

عارف ناہید کے حسن کے رعب میں آ گیا تھا۔ آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ ناہید دو دن کی دلہن تھی۔ کپڑے خاص طور پر رنگین تھے۔ چہرے پر بلا کی شگفتگی تھی۔ بلا کی سرخی تھی۔ کیا وہ شرما رہی تھی؟ نہیں مسکرا رہی تھی۔ آنکھیں چار کرنے کو تیار تھی۔ مگر عارف ہی کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں۔

"تمہارا آدمی وادمی ہے؟ چائے کا انتظام کرو گے کہ نہیں؟" سلیم نے کہا تھا۔

"سامان سب باورچی خانے میں ہے۔ مگر وہ آدمی نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔"

"میں چائے تیار کر لوں گی۔ مجھے باورچی خانہ دکھا دو۔" ناہید نے بڑی مستعدی اور بے باکی سے کہا تھا اور پھر وہ بڑی پھرتی سے جا کر چائے اور ناشتہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئی تھی اور سلیم اور عارف ڈرائینگ روم میں آ کر باتوں میں مصروف ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دیر کے بعد تینوں ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے۔ عارف کا رخ تو سلیم کی طرف تھا مگر دل ناہید کی طرف لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بڑی حسرت کی نگاہوں سے ناہید کو دیکھتا۔ وہ بڑے دل فریب طریقہ پر مسکراتی، آنکھیں لڑاتی اور عارف گھبرا کر سلیم کی طرف مڑ جاتا۔ ناہید اس کے دل پر عجیب پراسرار اثر کر رہی تھی جس کو سلیم ہرگز نہیں جان رہا تھا۔ کیا ناہید کچھ محسوس کر رہی تھی؟ کہا نہیں جا سکتا۔ عورت کے بابت کوئی بات کلیتاً کہہ دینا غلط ہی ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ عجیب طرح سے کھل جاتا۔ بڑی دل کش سرخی اس پر دوڑ جاتی۔ قیامت کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی۔ اس کی آنکھیں عجیب طرح پر پھرتیں۔ کبھی کسی پراسرار شرم سے وہ چہرے کو جھکا لیتی۔ کبھی چہرے کا رخ بدل لیتی۔ کبھی اسے بہت سنجیدہ بنا لیتی۔ کبھی تڑاک تڑاک باتیں کرنے لگتی۔ اس نے کیا کیا کہا تھا عارف کو بالکل یاد نہ تھا۔ مگر آواز میں بڑا پرکیف سر تھا۔ لہجے میں نزاکت تھی۔

عارف نے اس کی بات چیت کو ایک ایسا راگ محسوس کیا تھا جس کے معنے اس کا دل ہی جانتا تھا۔ بڑی دیر تک تینوں ساتھ رہے تھے۔

کیا ناہید کا جادو اسی دن سے عارف پر چل گیا تھا؟ نہیں ایک پراسرار اثر تو ضرور ہوا تھا۔ مگر جادو کا وہ اثر جو بعد میں جاگا اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ سلیم اور ناہید کے چلے جانے کے بعد اس کا دھیان بار بار ان دونوں کی طرف جاتا اور ناہید کے نقشے پر اطمینان سے جمتا۔ اس کے بنے ہوئے بال، مانگ نکلی ہوئی اور ادھر ادھر گچھے کوئی خاص اثر نہیں رکھتے تھے۔ ماتھا چوڑا تھا۔ آنکھیں معمولی تھیں۔ عارف کو جیسی بڑی بڑی آنکھیں بھاتی تھیں اور جیسی کبھی کبھی ہی دکھائی دی تھیں ویسی ناہید کی ہرگز نہ تھیں۔ ان آنکھوں کو چھوٹا ہی کہنا مناسب تھا۔ چہرہ کچھ گول ہی تھا۔ عارف کو کتابی چہرہ پسند تھا۔ ناہید کا ویسا نہیں تھا۔ گال بھرے بھرے سے تھے۔ ہاں رنگ گورا تھا۔ عارف کو گورا رنگ بڑی عامیانہ پسند کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اسے چمپئی رنگ بہت بھاتا تھا۔ ناک بھی کوئی خاص حسین نہ تھی۔ ہاں ہونٹ قیامت تھے۔ مسکراہٹ انہیں اور بھی قیامت بنا دیتی تھی۔ سنجیدگی میں بھی ان کی دل کشی کم نہیں ہوتی تھی۔ نہیں وہ اس پر عاشق نہیں ہوا تھا۔ عورت کا وجود ہی اس کیلئے عجیب تجربہ ہوا کرتا تھا اور یہ جوان عورت اس سے اس قدر قریب آئی تھی جتنی پہلے کبھی کوئی اور نہ آئی تھی۔ ہر عورت کو وہ بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا اور اس عورت نے اپنے کو بڑی صفائی اور بے باکی سے دکھایا تھا۔

سلیم میں رقابت کا جذبہ تھا؟ بالکل نہیں تھا؟ یا وہ عارف کو اپنا رقیب تصور ہی نہیں کر سکتا تھا اور عارف کو عشق بھی کب ہوا تھا جو وہ رقیب کے دائرے میں آتا۔ اس کی توجہ بس اس قدر تھی جتنی ایک شریف جوان کی ایک شریف معمولی حسن والی لڑکی کی طرف ہونا چاہیے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھل جانے کھل کر ملنے میں کوئی مزاحمت نہ تھی جلد بے تکلف ہو گئے تھے۔ "تم" سے باتیں کرنے لگے تھے۔ ایک قسم کی لگاوٹ بھی درمیان میں آ گئی تھی۔ جنس، جنسی تعلق تو اس وقت ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس وقت کوئی مرد کسی عورت کے سامنے آتا ہے۔ یہ احساس ہی کہ سامنے کی چیز عورت ہے مرد کے اندر جنسیاتی محرک کو چھو دیتی ہے۔ اس ابتدا سے ارتقاء ہوتا رہتا ہے اور جسے عام طور پر جنسی تعلق کہا جاتا ہے وہ اصل میں جنسی تعلق کا خاتمہ ہے۔ عارف کو تعلق بڑھانے کا کوئی شوق نہیں ہوا تھا۔ ایک بھائی کی بیوی یا برابر کے دوست کی بیوی سے جس نرمی اور جس محبت سے پیش آنا چاہیے اس طرح سے وہ ناہید کا خیال کرتا رہا۔ سلیم اور ناہید کے درمیان ناراضگی میں وہ ناہید کی طرفداری کرتا اور سلیم کو الزام دیتا۔ سلیم کو کوئی شبہ ہوتا تھا؟ نہیں ایسا کوئی امکان نہ تھا۔ ناہید ضرور خوش ہوا کرتی تھی۔ بہت خوش ہوا کرتی تھی۔

کیا سلیم کا دل ناہید سے بھر گیا تھا؟ وہ ہمیشہ کا دل پھینک تھا اور ناہید بیوی تھی۔ بیوی میاں کا تعلق کچھ ہی عرصے میں رسم دنیا کے دائرے میں آ ہی جاتا ہے۔ ناہید کا جسم بھرنے اور پیٹ ابھرنے لگا تھا۔ اس عالم میں گدھی پر بھی جوبن ہوتا ہے۔ ناہید پر بھی بڑا جوبن آ گیا تھا۔ بڑی لذیذ معلوم ہونے لگی تھی۔ اسی زمانے میں سلیم کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہ جاتے وقت کہہ گیا تھا ———— "مجھے ایک آدھ مہینے تک مکان نہ مل سکے گا ناہید یہیں رہے گی۔ اس کا خیال رکھنا"۔ اور عارف نے کہا "ابے تیرے کہنے کی ضرورت ہے؟ کیا میں اس کا خاص خیال نہ رکھوں گا"۔ اور ناہید نے بھی کہا تھا "عارف تم سے زیادہ میرا خیال رکھے گا"۔

خیال رکھنے کا معاملہ رسم دنیا تھا۔ مگر ناہید نے عارف کا عجیب طرح خیال کرنا شروع کیا۔ اس کا مطلب کیا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عورت کا برتاؤ ہمیشہ پراسرار ہوتا ہے۔ یہ ذہنی درجہ پر کبھی نہیں ہوتا۔ جذباتی ہوتا ہے اس لیے عقل میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ مرد عقل سے کچھ نتائج اس کے بابت نکال کر کوئی حرکت کرنے لگتا ہے جو عورت کو ضرور ناگوار ہوتی ہے اور پھر تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ ناہید کو ہر صبح عارف کے پاس آنا فرض ہو گیا تھا وہ دن نکلنے کے بعد ہی عارف کے گھر آ جاتی۔ عارف بیڈروم ہی میں ہوتا۔ وہ دن دناتی ہوئی اندر آ جاتی۔ عارف گڑبڑا کر بستر پر اٹھ بیٹھتا۔ وہ سامنے آرام کرسی میں بیٹھ جاتی اور باتیں ہونے لگتیں۔ یہاں تک کہ عارف کے دفتر جانے کا وقت آ جاتا۔ یہ روز ہی کا معمول ہو گیا تھا۔ دونوں کو ایک ہفتہ ہی میں اس کی عادت پڑ گئی تھی عارف نے کہہ بھی دیا تھا "اب مجھے تمہارے پورے آٹھ بجے یہاں آنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ آٹھ بجے اور محسوس ہوا کہ تم آ رہی ہو۔ اس دن تم نہیں آئیں تو آہٹ پر کان رہا۔ دیر تک اٹھا نہیں۔ پھر آخر کو دفتر تو جانا ہی تھا"۔ اس کے بعد سے ناہید ٹھیک آٹھ بجے اس کے پاس ضرور پہنچ جاتی اور پھر شام کے وقت دونوں ساتھ ٹہلتے ہوئے دور نکل جایا کرتے اور ناہید کو گھر واپس پہنچا کر عارف اپنے گھر آتا۔

سلیم کا خیال تھا کہ وہ ایک مہینے میں گھر کا انتظام کرے گا مگر اس کو تین مہینے لگ گئے۔ اس دوران میں کئی دفعہ وہ چھٹی لے کر آیا۔ جتنے دن وہ یہاں رہا ناہید عارف کے یہاں نہ آئی۔ عارف کو وہ وقت جس وقت وہ آیا کرتی تھی، عجیب طرح سے خالی خالی معلوم ہوا۔ بڑی الجھن ہوتی اس کا جی چاہتا کہ خود سلیم کے گھر پہنچ جائے۔ مگر راز فاش ہونے کا خوف سلیم کے شبہ کرنے کا خوف اسے روک لیتا۔ شام کو ٹہلنے میں بھی عارف ساتھ ہو جانے سے خوف کھاتا اور دل سے انتظار کرتا کہ سلیم کب جائے اور کب پھر اسے ناہید سے آزادی سے ملتے رہنے کا وقت آئے۔ دونوں کے تعلقات یا تعلق میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس پر کوئی اعتراض کرتا۔ دونوں محض باتیں ہی کیا کرتے اور باتیں بھی ادھر ادھر کی۔ عارف چاہتا کہ کبھی دل کی بات کہے مگر اس کے دل کو کچھ کہنا ہی نہ تھا۔ ناہید میں کوئی ایسا حسن بھی نہیں نظر آتا تھا جس کی تعریف کر دیتا۔ خاندانوں کے قصے۔ دنیا کے حالات۔ روز کے تجربے۔ جدھر بھی رو چل جاتی ادھر کی باتیں ہوتی رہتیں۔ ایک دم سے ناہید گھڑی دیکھ کر کہتی "اب تمہارے دفتر جانے کا وقت ہو گیا۔ میں جاتی ہوں"۔ عارف کو محسوس ہوتا جیسے کوئی بڑا دلچسپ کھیل ختم ہو گیا۔

عارف کو ناہید اس قابل نہیں محسوس ہوئی کہ اس پر عاشق ہو جاتا اور پھر دوست کی امانت۔ دنیا میں بدنامی کا خیال بھی تھا۔ اصل میں اس کے دل میں گدگدی ضرور ہوتی تھی اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ داخل ہوتے ہی ناہید کو چپٹا کر اپنے پلنگ پر لٹا لے گا۔ مگر جب ناہید داخل ہوتی تو سارے ارادے ٹوٹ جاتے۔ ناہید آرام کرسی میں بیٹھ جاتی اور اسے محسوس ہوتا کہ اس کے سب جذبات ٹھنڈے ہو گئے۔ باتیں ہونے لگتیں۔ اور اس پر عجیب پراسرار پسپائی آ جاتی۔ وہ ناہید کے جسم کی ہر چیز پر نگاہ جماتا۔ اس کی ہر ہر ادا کا غور سے مطالعہ کرتا اور محسوس کرتا جیسے اس کے سامنے لذیذ کھانوں کا ایک دسترخوان چنا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ بڑھانے ہی کی دیر تھی کہ ہر نعمت اس کو میسر آ جاتی اور وہ مزے لے لے کر اس سے محظوظ ہوتا۔ مگر اس کا ہاتھ کسی طرف نہ بڑھتا۔

ایک دن تو عجیب ہی بات ہوئی۔ عارف اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ناہید کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک دم سے ناہید آئی اور کرسی پر بیٹھ جانے کے بجائے اس کے پاس آ کر اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ عارف کے سرہانے سے بالکل قریب تھی اور اس کے چہرے پر بے پناہ دلکشی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی پرکیف مزے کی یاد سے خوش ہو کر اس مزے کو پھر حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ عارف اسے چمٹا لے؟ اور کوئی ہوتا تو اسے اس عالم میں اور اس قدر قریب پا کر ہی کچھ کرتا۔ مگر عارف اسے تعجب سے دیکھتا رہا اور اس تعجب نے اسے بالکل بےبس کر دیا۔ ناہید ہٹ کر چلی گئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب عارف کے دل نے چاہا کہ وہ اٹھ کر اس کا منہ چوم لے مگر اس سے اٹھا نہ گیا۔ دونوں میں روز کی طرح باتیں ہوتی رہیں اور وقت پر دونوں الگ ہو گئے۔ اس دن عارف عجیب عالم میں رہا۔ اس کی نگاہ کے سامنے ناہید اس کے پاس کھڑی ہوئی دکھائی دیتی رہی۔ کبھی تعجب میں آ کر وہ دل ہی دل میں سوال کرتا "اس کا مطلب کیا تھا؟" اور کبھی جوش میں آ کر کہتا "اس نے اتنا اچھا موقع دیا تھا!" اور افسوس کرنے لگتا کہ میں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کبھی کہتا "اب کی ایسا موقع ملا تو نہ چوکوں گا۔" کبھی کہتا "اچھا ہی ہوا کہ میں بےحس پڑا رہا۔ نہیں تو نہ معلوم کیا ہوتا۔" کبھی عورت کی فطرت اسے معمہ نظر آتی۔ ایک مجسم فریب جس کا مطلب بیشتر لوگ غلط ہی سمجھ گئے۔ ناہید کے اس کی طرف کس قسم کے جذبات تھے؟ اس سوال کا جواب دینا اس کے لئے مشکل تھا۔ اس شام ڈر کے مارے وہ گھر سے ہی نہیں نکلا کہ ناہید کے ساتھ ٹہلنے میں کہیں کوئی زیادتی نہ کر بیٹھے۔ رات میں اسے دیر تک نیند نہ آئی۔ مگر جب آنکھ لگی تو خواب میں دیکھا کہ ناہید اس پر آ کر گر پڑی اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

صبح کو وہ انتظار کرتا رہا مگر ناہید نہ آئی۔ وہ دفتر کچھ دیر پہلے روانہ ہوا تاکہ ناہید کے گھر ہوتا ہوا جائے۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سلیم آ گیا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں آج شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا اور ناہید کو ساتھ لے جاؤں گا۔" شام کو وہ ان دونوں کو پہنچانے گیا۔ گاڑی چل دینے پر ناہید کھڑکی سے منہ نکال کر اسے دیکھتی رہی۔ اسی کا تاثر لئے ہوئے وہ گھر آیا اور رات بھر اسی میں محو رہا۔

دن گزرتے گئے پہلے پہلے تو اسے بڑی الجھن ہوتی اور وہ وقت خالی خالی لگتا جس وقت ناہید آیا کرتی تھی مگر کچھ عرصے میں اس کی عادت چھٹ گئی اور ناہید کا خیال ہٹ گیا۔ وہ بھی شادی کر لینا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں کئی لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ مگر آگے بڑھنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔

دو مہینے گزر گئے کہ ایک دن سلیم اور ناہید اس کے گھر میں آ اترے۔ ناہید پورے دنوں پیٹ سے تھی اور گیند ایسی معلوم ہو رہی تھی مگر اس کے چہرے پر بلا کی رونق تھی۔ کھڑے بیٹھے وہ بہت جلد تھک جاتی تھی اور آتے ہی عارف کے پلنگ پر لیٹ گئی۔ عارف کے گھر کا اندر والا حصہ خالی ہی کہا جا سکتا تھا۔ سلیم نے طے کیا کہ ناہید ولادت تک یہیں رہے گی۔ ایک کلینک میں اس کا انتظام بھی ہو گیا تھا اور کلینک کی ڈاکٹرنی نے کہا تھا کہ ہر ہفتے اسے ضرور دکھایا جایا کرے۔ اسے لے جانے کا کام عارف کے سپرد ہوا تھا اور سلیم یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ ڈیلیوری ہونے پر اسے تار دے دیا جائے۔ اس طرح عارف اور ناہید ایک ہی گھر میں رہنے لگے تھے۔ عارف گھر آتا تو اپنے کمرے میں بیٹھنے کی بجائے ناہید کے کمرے میں جا بیٹھتا۔ ناہید چلنے پھرنے سے ایسی معذور تھی کہ گھر کا انتظام نہ دیکھ سکتی۔ سارا گھر اسی نے سنبھال لیا تھا اور عارف ہر طرف سے بےفکر ہو کر بس اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے میں مصروف رہتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے ناہید اس کی ہی بیوی تھی اور ناہید بھی اس سے اسی طرح پیش آتی جیسے اپنے میاں سے۔ دونوں میں عجیب قسم کا لگاؤ تھا جس میں جسمانی تعلق کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ دو دفعہ عارف اسے ڈاکٹرنی کے یہاں لے گیا۔ سواری پر بیٹھنے میں ناہید کو دقت محسوس ہوئی تو اس نے اس کے جسم کو سہارا دیا۔ ناہید کے سخت گوشت کا اسے عجیب احساس ہوا۔ ناہید کا گول چہرہ بھر کر اور بھی گول ہو گیا تھا۔ اکثر جب

عارف اس کے پاس آرام کرسی پر بیٹھا ہوتا اور وہ پلنگ پر لیٹی ہوتی تو چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے لے یا اپنا چہرہ اس چہرہ پر رکھ دے مگر ایسا کرنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

آخر ناہید کے درد لگے۔ اس نے اسے گود میں لے کر سواری میں بٹھایا اور کلنک لے گیا۔ سارے وقت کلینک میں موجود رہا۔ چار گھنٹے کے بعد لڑکی پیدا ہوئی۔ اس نے سلیم کو تار دیا۔ سلیم آیا مگر دو دن رہ کر چلا گیا۔ ہفتہ بھر وہی ناہید کے پاس جاتا رہا۔ بچہ ہونے پر ناہید عجیب دبلی اور گھٹی ہوئی نظر آئی۔ گھر لاتے وقت بھی اس نے اسے گود میں اٹھا کر ہی سواری میں بٹھایا اور اتارا۔ غسل کرنے کے بعد ناہید ایک نئے رنگ سے کھلی ہوئی معلوم ہوئی۔ عارف نے محسوس کیا کہ پہلے وہ بہرحال ایک کلی کی طرح تھی مگر اب کھل کر پھول ہو گئی تھی۔ وہ اسے پہلے سے کہیں زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ ایک دن وہ دفتر سے آ کر ناہید کے کمرے میں گیا تو اسے بچی کو گود میں لئے ہوئے دودھ پلاتے دیکھا۔ ناہید کی صورت پر عجیب قسم کی رونق تھی۔ سادا چہرہ عجیب پراسرار حسن سے روشن تھا۔ ایسے حسن کا اسے کبھی پہلے مشاہدہ نہ ہوا تھا۔ اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہی ناہید تھی جس کو اس نے نہ معلوم کتنے بار دیکھا تھا مگر اب وہ کوئی روحانی وجود کوئی پری معلوم ہو رہی تھی۔ ناہید بچی کو لٹا کر کمرے سے باہر گئی اور اس کی چال میں عارف کو عجیب رقص محسوس ہوا۔ عجیب محویت کا عالم اس پر طاری ہوا۔ شاید اسی کو عشق کہتے ہیں؟ ناہید اب ایک کامل چیز ایک کرشمہ معلوم ہونے لگی تھی۔ یہ محض لگاؤ محض تعلق سے بڑھ کر کوئی چیز تھی۔ عارف کا بقول حافظ "ہر سر مو" عجیب لذت کے عالم میں آ گیا تھا۔ وہ عجیب محویت سے ہمکنار ہو گیا تھا۔ ناہید کے پاس سے چلے جانے پر بھی یہ محویت کم نہ ہوتی۔ دفتر کا کام کرتا مگر دھیان ناہید کی طرف رہتا۔ واپسی پر چال میں عجیب شتاب زدگی ہوتی۔ دل میں بڑی دلکش بے قراری رہتی۔ اس کے سامنے ہونا یا اس سے الگ یہ بیقراری کم نہ ہوتی۔ ناہید کو بھی محسوس ہو گیا تھا کہ عارف بے قرار تھا مگر ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل تھی جو ختم نہ ہوتی۔

سلیم کا خط آیا تھا "تم ناہید کو ریل میں سوار کر دو۔ میں یہاں اتار لوں گا۔" عارف دفتر سے واپس آیا تھا تو ناہید کو سامان سنبھالتے ہوئے تیار پایا تھا۔ وہ سفید شلوار اور پھولدار لمبی قمیض پہنے کھڑی تھی۔ گلے میں زرد دوپٹہ پڑا تھا۔ آنکھوں میں کاجل، چہرے پر پاؤڈر، ہونٹوں پر لپ اسٹک اسے اور بھی عجیب کرشمہ بنائے ہوئے تھیں اور ان سب پر اس کی بڑی لگاوٹ سے بھری مسکراہٹ عجیب جادو کھیل رہی تھی۔ عارف کی بے قراری حد کو پہنچ گئی اور اس نے ناہید کا منہ چوم لیا تھا۔ اس کے بعد ہی اسے عجیب طرح پر احساس گناہ۔ احساس جرم ہوا تھا اور وہ لپک کر گھر سے باہر آیا تھا اور سواری کا انتظام کرنے لگا تھا۔ اب ناہید سے آنکھ ملانے کی اسے ہمت نہ ہوئی تھی حالانکہ سواری پر سوار کرتے وقت ریل پر بٹھاتے وقت اس نے اسے برابر سہارا دیا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ وہ بھی ساتھ ہولے۔

گھر آنے پر گھر خالی خالی معلوم ہوا تھا۔ مگر اب ناہید کی صورت اس کے سر پر بری طرح سوار ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے صاف صاف نقشہ کھنچا ہوا نظر آتا تھا اور دل کی حرکت میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ بے تحاشا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر ناہید کے پاس پہنچے۔ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے لے اور جی بھر کر پیار کرے۔ وہ ہر وقت گم گم رہتا۔ دفتر کے ساتھی پوچھتے "کیسی طبیعت ہے؟" وہ کہتا "کوئی بات نہیں کیوں؟" وہ کہتے "کچھ بجھے بجھے سے معلوم ہوتے ہو۔" کوئی کہتا "کہیں مرنے تو نہیں لگے؟" کوئی کہتا "ابے اب جلد شادی کر ڈالو۔ اب وقت ہو گیا۔" وہ لڑکیوں کی تلاش میں جاتا۔ کئی پر نگاہ جاتی مگر کوئی اچھی نہ معلوم ہوتی۔ آنکھیں ناہید ہی کو ڈھونڈتیں دل ناہید ہی کو طلب کرتا۔ جسم اس کو محسوس کرنے کے لئے عجیب حرکت میں آتا۔ راتیں اس کی یادوں میں کٹتیں۔ خوابوں میں اسے ہمکنار دیکھتا۔ بے تاب ہو کر دل میں ٹھانتا کہ چھٹی لے کر ناہید کے یہاں پہنچے مگر جانے کا بہانہ نہ ملتا اور پھر محسوس ہوتا کہ سلیم پر راز نہ کھل جائے۔

وہ سوچا کرتا "کیا ناہید اس سے راضی تھی؟" اس معاملے میں شک کی بہت کم گنجائش تھی۔ ناہید شروع ہی سے اس کی طرف رجوع تھی مگر کیا سچ مچ وہ اس کے ساتھ سرحد پار کرنے کو تیار تھی۔ عورت کے بابت کہا نہیں جا سکتا کہ وہ کب تک ساتھ جائے گی اور کب لات مار دے گی۔ جہاں تک وہ گیا تھا وہاں تک جانے کا تو اسے یقین تھا۔ لیکن آگے بڑھنے پر کیا ہوتا اسے معلوم نہ تھا۔ پیار کر لینے پر تو ناہید کو کوئی اعتراض نہ ہوا تھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ اسے اور پیار کیا جائے؟ مگر اس سے زیادہ دست درازی کو وہ شاید نہ برداشت کرتی۔ وہ ناول بہت پڑھنے لگا تھا اور ہر ہیروئین کو ناہید تصور کرتا۔

اب اسے یقین ہوا کہ وہ ضرور عاشق تھا۔ مرض عشق کے مصائب کے بھی اب وہ معنے سمجھنے لگا تھا۔ اس عالم میں سال کا سال گزر گیا تھا۔ اس دوران میں سلیم اور ناہید ادھر آئے ہی نہیں۔ سلیم کا اور بھی دور تبادلہ ہو گیا تھا۔ سلیم کا ایک خط آیا تھا جس سے معلوم ہوا تھا کہ ناہید پھر حمل سے تھی۔ "تو یہ کوئی سال کا ماڈل خالی نہیں چھوڑے گی۔" اس نے ہنس کر دل ہی دل میں کہا تھا اور پھر اس کے دل نے کہا تھا "کاش یہ بچہ میرا ہوتا۔" خیر بچے ہونے یا نہ ہونے کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس سے ناہید کے حسن میں اور اس کے عشق میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ سلیم کا تبادلہ اور بھی دور کے شہروں میں ہوتا گیا۔ عارف کو ہر خبر پر محسوس ہوتا کہ ناہید اور بھی دور ہو گئی۔ مگر حقیقت میں وہ اس کے دل سے اور بھی زیادہ قریب ہوتی گئی تھی۔ عارف کے تصور میں اس کی صورت شکل اور بھی زیادہ حسین ہوتی گئی۔ اس کے چہرے کے داغ دھبے بالکل مٹ گئے۔ اس کے رنگ روپ میں روحانی چمک آگئی۔ وہ حسن کا کامل مجسمہ ہو گئی۔ اس کی تصویر نگاہوں کے سامنے زیادہ سے زیادہ صاف ہوتی گئی۔ ایک دن اسے خیال ہوا کہ سلیم سے ایک اس کی اور ناہید کی تصویر اپنے پاس رکھنے کے لئے مانگنے کو لکھے۔ مگر اسے یقین ہوا کہ فوٹو اس دلکش تصویر کو خراب کر دے گا جو ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرتی رہتی ہے۔ وقت گزرتا گیا اور اس کی محویت اور اس کی بے قراری میں کوئی فرق نہ آیا۔

ایک دن دفتر سے واپس آیا تو اسے ایک خط ملا۔ خط ناہید کا تھا۔ اس سے پہلے ناہید نے اسے کبھی کوئی خط نہ بھیجا تھا اس میں لکھا تھا "سلیم کو تو خط لکھنے کیا دم مارنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ میں لڑکی ہونے کے بعد سے بیمار رہتی ہوں۔ حرارت ہو جاتی ہے۔ دبلی ہوتی چلی جا رہی ہوں۔ تمہارے لیے میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے بالکل میری ایسی ہے۔ تم کو ضرور پسند آئے گی۔ تم آکر دیکھ جاؤ تو شادی کی بات چیت کروں۔" اس خط نے اسے عجیب طرح کی ہمت دلائی تھی اور اس نے جواب میں لکھا تھا "تمہاری بیماری کی خبر سن کر بڑی فکر ہو گئی ہے۔ ٹھیک سے علاج کرو۔ تمہاری سی لڑکی؟ کیا یہ ممکن ہے؟ فرصت ملی تو ضرور آؤں گا۔ لڑکی سے زیادہ تمہیں دیکھنے کے لئے۔ تمہیں دیکھنے کو دل کس قدر بے قرار ہے۔" یہ خط روانہ کرنے کے بعد وہ سوچتا رہا کہ اگر یہ خط سلیم کے ہاتھ پڑ گیا تو کیا ہوگا۔ افسوس کرتا رہا کہ اسے ناحق اس صفائی سے دل کی بات لکھ دی۔ ہفتوں اسے یہ کشمکش و پیچ ستاتا رہا۔ اسی دوران میں اس کے ایک دوست نے اپنی بیوی کے لئے ایک ساڑھی لی تھی۔ اسے بھی ناہید کو ایسی ہی ساڑھی میں ملبوس دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے ایسی ہی ساڑھی لے کر ناہید کو روانہ کر دی۔ ناہید نے اس کے جواب میں بڑی خوشی کا اظہار کیا اور یہ بھی لکھا کہ سلیم ایک مہینے کی چھٹی لے کر آنے والا ہے۔ وہ بھی ساتھ آئے گی اور وہ دونوں اسی کے گھر میں رہیں گے۔

اور ان کے آجانے ہی پر یہ کیا ہوا تھا۔ سارا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ سلیم و ناہید دونوں ساتھ ساتھ آئے اور عارف کے سامنے بیٹھے۔ ناہید کیسی ہو گئی تھی؟ اس کے وجود نے اس حسین تصویر کو جو عارف کے تصور میں تھی ایک دم سے پاش پاش کر دیا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ کیسا پھیکا بدمزا پیلا نظر آیا تھا۔ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر عادتاً رسماً مروتاً وہ دیکھے گیا تھا۔ گول گول گال غائب ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے چاروں طرف سیاہ حلقے تھے۔ ناک کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ جسم بھی ڈھل گیا تھا۔ ہر روز وہ زیادہ سے زیادہ بری معلوم ہوتی گئی تھی۔ کیا اسے بھی محسوس ہو گیا تھا کہ عارف کا اس کی طرف لگاؤ جاتا رہا تھا وہ کہہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہر حال رسم دنیا قائم رہی۔ ساتھ رہتے رہے مگر دل کی لگی بجھ گئی۔ ناہید میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ بری معلوم ہوتی تھی۔ گھنونی معلوم ہوتی

پھسل جانا بھول گئی تھی، مسکراہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کاڑھ رہی تھی۔ اس طرح وہ سارا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ ہنسا۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ کیا حماقت ہوئی تھی؟ یہی عشق ہوتا ہے؟ یوں ہی ختم ہو جاتا ہے؟ یہی اس کا دورہ ہے؟ یہی اس کی دوران ہے؟

اور اب یہ خط آیا تھا۔ جولائی۔ اگست۔ ستمبر قریب تین ماہ بعد "ویسی ہی ساڑھی بھیج دو۔ دو سو روپیہ لگا۔" اسکا جی اب یہ خرچہ کرنے کو نہیں چاہتا تھا اور اسوقت اسنے کتنے شوق سے اتنا روپیہ خرچ کیا تھا بلکہ یہ محسوس کیا تھا کہ اس سے زیادہ ہوتا تو خرچ کرتا۔ مگر اب اس کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک پیسہ بھی خرچ کرے۔

سگار ختم ہو گیا۔ وہ آرام کرسی سے اٹھا اور میز پر بیٹھ کر خط کا جواب لکھنے لگا۔ بہت سی بناوٹ کی باتیں لکھ کر اس نے لکھا "ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ ویسی ساڑھی کہیں نہ ملی۔ وہ تو اتفاق سے ایک جاننے والے سے مل گئی تھی۔ انہیں لکھ رہا ہوں کہ جلد کوئی صورت نکالیں اور مجھے ویسی ہی ساڑھی گہرے رنگ پیازی ہو بھیج دیں۔ پارسل ملتے ہی تمہیں روانہ کر دوں گا۔

نکہت حسن

سازش

شکیلہ بیگم کے ہاں پہلی لڑکی پیدا ہوئی۔ صورت شکل واجبی سی تھی۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ اور کھڑا کھڑا ناک نقشہ۔ "چلو بہن اوڑھ کر اچھی لگے گی۔" وہ مطمئن ہو کر دوسری زچگی کا انتظار کرنے لگیں۔ میاں کے ڈھنگ اور طور طریقے دیکھ کر سوچتی تھیں کہ کوئی نثار خطانہ ہو۔ ایسی ہی تل پھلی سی طبیعت پائی تھی نثار احمد نے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، ابھی کچھ اور ابھی کچھ۔ شکیلہ بیگم پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھیں۔ میاں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے تھے۔ لڑکپن پتنگ اڑاتے اور آنکھیں لڑاتے گذرا۔ چھتوں چھتوں اور منڈیروں منڈیروں پھرتے جوانی بیتی۔ پتنگ کو پیچ دے رہے تھے کہ شکیلہ بیگم کا ہرا طوطیا آنچل نظروں کے سامنے لہرا گیا۔ پھر کیا تھا، ہر ڈھیل دیں وہ تنی جائیں، یہ اڑی لگائیں وہ رخ بدل لیں۔ نثار احمد بھی اپنی دھن کے پکے تھے ایسا تان کر پیچ اٹھایا کہ شکیلہ بیگم کٹی پتنگ کی طرح صحن میں آگریں۔ بیاہ کر آئیں تو ایسی ہی تھیں، سیدھی سادھی قصباتی عورت — نہ ان میں غمزہ تھا نہ عشوہ اور نہ بگھاتی تھیں۔ نثار احمد انگلی پکڑتے، وہ پہونچا تھما دیتیں۔ نثار احمد کلائی مروڑتے، وہ پوری کی پوری کمان بن کر کھڑی ہو جاتیں۔ نثار احمد کی کنپٹیوں پر بھاپ سی اٹھتی تو وہ پتنگ پر بھتی کی طرح دہکنے لگتیں۔ نثار احمد کو کوٹھوں اور منڈیروں کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ سے پتنگ کو پیچ دیتے اور نگاہوں سے صحن اور دریچوں کو ٹٹولتے رہتے۔ پتنگ آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جاتی اور نگاہیں کسی صحن میں جا کر اٹک جاتیں۔ صحن میں بان کی دو چار پائیوں کے درمیان ملکہ نور جہاں کا حمام خانہ تیار ہوتا۔ لوہے کے تسلے میں ابلتا ہوا پانی، کھلی اور آبٹن کی ملی جلی خوشبو اور رضیہ کے گورے بدن پر پانی کے قطرے، جیسے ننھے پھوٹ رہے ہوں۔ کمر پر پھیلے ہوئے سیاہ بالوں میں لگی ہوئی سفید موتیوں کی جھالر۔ نثار احمد جلدی جلدی سیڑھیاں اتر جاتے۔

ابھی ان کی مسیں ہی بھیگی تھیں اور ان کی اماں سر پھوں کا کوئی ٹوٹکا کرنے کا سوچ رہی تھیں کہ ایک دن کیا دیکھتی ہیں کہ نثار احمد ڈھیروں لال، ہری نیلی پیلی پتنگیں، انجے، پچکے، ڈور اور چرخیاں لئے چلے آ رہے ہیں۔

"ہائے، یہ کیا شوق چرایا؟ ولد ارا احمد تعلقدار کا پوت اب کنکوے لڑائے گا!" جوادی خانم تھوڑی دیر بک جھک کر پلنگ پر لیٹ گئیں اور نثار احمد رنگوں کی دنیا میں گم ہو گئے۔ زمین پر انھوں نے پتنگوں کو بچھا کر ہر ہر زاویے سے دیکھا۔ لال نیلے، پیلے رنگوں کا سیلاب کمرے میں بھرا تھا اور رنگوں کے اس سمندر میں کھڑے ہوئے نثار احمد کشتی کے چپو کی طرح کانپ رہے تھے۔ ان پر لرزہ سا طاری تھا اور تب انھوں نے ایک پتنگ اٹھائی، خوب کنا تنا، مانجھا اور ڈوری، اور چھت پر پہنچ گئے۔ پتنگ کو انھوں نے آسمان پر چھوڑا، ڈور اور پتنگ کے فاصلے کو نگاہوں سے ناپا اور پھر اس تناؤ کو محسوس کیا جو ڈور اور پتنگ کے درمیان قائم تھا۔ پتنگ آسمان کی گہرائیوں میں گم ہو گئی۔ ڈور کا تناؤ بڑھنے لگا، اس کھنچاؤ اور تناؤ میں جانے کیا جادو تھا کہ نثار احمد کی آنکھیں مندنے لگیں۔ بھنچے سے بھنچے ان کو اپنی آنکھوں کے گرد منڈلاتے ہوئے نظر آتے اور وہ چھت پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اڑتی ہوئی پتنگ کٹ کر دوسرے گھر میں جا گری۔ اٹھانے کے لئے انھوں نے منڈیر پر پیر رکھا تو بچھو کا سا ڈنک لگا۔ زینب کی آدھی اپنا تمام نفاق اثر چھوڑتی ہوئی ان کے اعصاب سے جا ٹکرائی۔

مُرلی کی تان سے ملتی جلتی یہ لڑکی چھت پر کپڑے ٹانگنے آئی تھی۔ تمتمائے ہوئے گال، پریشان آنکھیں اور کھلی ہوئی پنڈلیاں۔ نثار احمد کا دل چاہا کہ وہ اس ہلکی پھلکی تیتری سی لڑکی کو ڈور کے ساتھ باندھ کر آسمان پر چھوڑ دیں۔ ابھی وہ اُٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وہ اوئی کہتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

نثار احمد محلہ دریا گنج میں لکھوری اینٹوں والی حویلی کے مالک تھے۔ حویلی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی کمر سے کمر لگائے سٹے سٹے ہزارہا مکان ریڑھ کی ہڈی کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ کچھ پھونس کے چھپر تھے اور کچھ لپے پُتے انجنہاری کے گھر سے ملتے جلتے چکنے چپڑے مٹی کے گھروندے۔ حویلی کی بڑائی کا اندازہ ان ہی مکانوں سے لگایا جاتا تھا جن کو نثار احمد کے باپ دلدار احمد تعلقدار نے نوشیرواں عادل کی طرح ڈھانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ عمارت میں آڑ آتی ہے تو آئے، چھت میں رخنہ پڑتا ہے تو پڑے، گوبر اور چارے کی بو نتھنوں میں گھس کر پھیپھڑوں کو متورم کرتی ہے تو کرے۔ کچے مکان حویلی کی عظمت کا نشان تھے۔ ان گھروں میں دنیا بسی تھی۔ ہر گھر بجائے خود اندر کا اکھاڑا تھا اور جب سے نثار احمد کی مسیں بھیگی تھیں اور انھوں نے ڈور پتنگ سنبھالی تھی انھیں محلے کی ہر لڑکی پر رادھا کا گمان ہوتا تھا۔ پر یہ کیسی رادھائیں تھیں۔ ڈری سہمی، سہمی، ڈھکی چھپی جو دیوار سے کمر لگا کر اور سُٹ سُٹ کر چلتی تھیں۔ جو نہ چہلیں کرتی تھیں اور نہ قہقہے لگاتی تھیں اور نہ لہک لہک کر گاتی تھیں کہ

میں تو گردھر آگے ناچوں گی

محلہ کی کنواریوں کا یہ ڈھکا چھپا انداز نثار احمد کے ہزاروں جذبوں کو اُبھارتا رہتا۔ وہ سارے سارے دن چھجوں چھجوں اور منڈیروں منڈیروں پھرتے۔ زینب کی اوئی، رضیہ کا بینگا اور خوشبو میں اڑاتا ہوا بدن، فہمیدہ کی سمندر پہ کھلنے والی کھڑکیوں سے ملتی جلتی آنکھیں اور شکیلہ بیگم کا ہرا طوطیا آنچل اور بندو کی لڑکی کلثوم کا چودھواں برس اور درمیان میں ڈھیروں فاصلے، طبقاتی بُعد، خاندانی روایات، نسلی اور خونی فرق اور پھر سب سے بڑھ کر سرخ اینٹوں والی پکی پختہ عمارت جس کی چھت پر کھڑے ہو جاؤ تو نیچے پھیلی ہوئی دنیا چیونٹی کی طرح مسلی مسلائی دکھائی دے۔

نثار احمد اگر دل میں ٹھان لیتے تو ذرا کی ذرا دیر میں شاہی حرم سرا تیار کروا سکتے تھے، پر جو تاک جھانک میں مزا تھا وہ حرم سرا میں کہاں؟ وہ یوں ہی چھتوں چھتوں پھرتے۔ ان کی نگاہیں صحن سے دالان اور دالان سے کمروں کو ٹٹولتی رہتیں۔ دروازے کھلتے اور بند ہو جاتے۔ لمحہ بھر کو رضیہ کا طباق سا چہرہ دیوار پر اُبھرتا اور پھر گم ہو جاتا۔ بھینس کے آگے چارہ ڈالتی ہوئی کلثوم اپنے دوپٹے کو سینے پر پھیلا کر چھت پر دیکھتی اور پھر کٹے ہوئے چارے کے ڈھیر پر دھم سے گر پڑتی۔ شکیلہ بیگم کا ہرا آنچل فضا میں لہراتا اور تازگی کا احساس چھوڑتا ہوا گم ہو جاتا۔ نثار احمد کو معلوم تھا یہ فاصلے پاٹے نہیں جائیں گے —— وقت کا دریا اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا ہے —— پھر بھی انھوں نے صحن میں لیٹی ہوئی جوادی خانم کو دیکھا۔ خاندانی وقار اور بیگماتی تمکنت — اقدار اور وضعداری کی ہنڈیوں پر وہ سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھیں۔ سادھو نثار احمد کو ساون کے اندھے کی طرح ہرا ہی ہرا نظر آ رہا تھا۔ شکیلہ بیگم کے تنے بدن، دہکتے گالوں اور پھڑ پھڑاتے ہونٹوں والی ایک بھاری بھرکم لڑکی تھیں اور پھر جب وہ ہرا دوپٹہ اوڑھ کر دالان سے کمرے اور کمرے سے دالان میں گھپ چھپ کرتی پھرتیں تو نثار احمد بے اختیار ہو جاتے۔ شکیلہ بیگم کو حاصل کرنا آسان نہیں تھا وہ سید گھرانے کی بیٹی تھیں اور نثار احمد ——!

جوادی خانم کو پیر بھاری ہوتے کس نے دیکھا تھا! نہ اُبکائیاں تھیں اور نہ کھٹی میٹھی چیز کو دل چاہا۔ راتوں رات چوری چھپے دائی گئی اور صبح کو دروازے پر نوبت رکھی تھی اور بھانڈ بھنڈیلے گلا پھاڑ رہے تھے۔

مہینوں محلے میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ سراغ لگ گیا تھا۔ بس حویلی میں کام کرنے والی لڑکی فاطمہ کی سانولی رنگت میں سونا سا گھٹ کر رہ گیا تھا۔ تبہ صاحب کی بیوی نے فاطمہ کے چہرے پر نظر ڈالی اور دھک سے رہ گئیں۔ مامتا کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ ہاں بند گلے والے باریک کرتے کے اندر چھاتیاں سی

چھوٹ رہی تھیں اور دوسری طرف نواڑی پلنگ پر لیٹی ہوئی جوادی خانم اپنی سوکھی چھاتیاں بچے کے منہ میں ٹھونس رہی تھیں اور بچہ بلبلایا جا رہا تھا۔ تب فاطمہ نے آگے بڑھ کر بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ گل گوتھنا سا بچہ گداز چھاتیوں کے لمس سے ہی خاموش ہو گیا اور پھر جب پندرہ بیس منٹ بعد فاطمہ کوٹھری سے باہر آئی تو کرتے کے اندر کوئی چیز لبیرے کی طرح لٹک رہی تھی اور بچہ نیند میں مسکرا رہا تھا۔

نثار احمد کو جوادی خانم نے جی جان سے پالا تھا۔ ٹھنڈی ہوا سے ان کو زکام ہو جاتا، تیز دھوپ سے نکسیر بہہ نکلتی، پیدل چلتے تو خفقان ہو جاتا، گہری نیند سے جی بھاری ہوتا اور باسی تباسی کھانے سے الٹیاں لگ جاتی تھیں۔ مولوی، ماسٹر جو گھر پر پڑھانے آتے تھے ان کو پھول کی چھڑی بھی چھلانے کی اجازت نہیں تھی۔ ابھی الف دو زبر آ اور ب دو زبر بًا کی گردان بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بڑے پیر پر ریشم کے کام کی چادر چڑھوائی، زنانہ مردانہ میلاد ہوا، رتی والی کا مجرا اور بی بی کی صحنک کی رسم ادا ہوئی اور چلتے چلاتے اپنے بھائی کی بڑی بیٹی جہاں آرا سے منگنی بھی کر دی۔ جہاں آرا کی ماں نے حامی بھرنے میں ذرا ہچر مچر کی، نثار احمد کی تاریخ پیدائش اور جوادی خانم کے ٹھیٹ مردانہ چہرے کا جائزہ لینے کے لئے ناک کو سکوڑا تو ان کے میاں سجاد حسین سانپ کی طرح پھنکارے۔ جوادی خانم کے گلے میں پھنسی ہوئی ٹھستی، کلائیوں میں جھولتی ہوئی چوہے دنتیاں، مشروع کا پاجامہ اور جالی کے کرتے پر سے ان کی نظر پھسلتی ہوئی دیوان خانے میں جا اٹکیں۔ سفید دیوان پر والد احمد بیٹھے تھے، سنہری پیچوان آگے رکھا تھا، برابر میں منشی جی بیٹھے ہوئے تھے جو زمینوں اور جائداد کے کاغذوں پر نثار احمد کا نام چڑھا رہے تھے اور تب ہی نثار احمد کی منگنی کی رسم ادا ہو گئی۔

"کیا چاند سورج کی جوڑی ہے!" جوادی خانم نے جھٹ پٹ دونوں کی بلائیں لے ڈالیں۔ باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی فاطمہ کی آنکھیں دھوئیں سے اٹ گئیں اور جلتی ہوئی آگ بجھنے لگی۔ اٹھارہ سال کے بعد پھر وہ سینے کے اندر وہی تناؤ محسوس کر رہی تھی جو اس رات محسوس کیا تھا جب دائی نے سینے کے ساتھ چمٹے ہوئے بچے کو الگ کر کے جوادی خانم کے برابر ڈال دیا تھا اور دودھ سے بھری ہوئی اس کی چھاتیاں پکے پھوڑے کی طرح دکھنے لگی تھیں اور وہ ساری رات تڑپتی رہی تھی۔ ساری رات روتی رہی تھی اور ساری رات لڑتی رہی تھی اور فرض اور ممتا کے درمیان پوری رات ٹھنی رہی اور صبح ——— فاطمہ کسی ہیرو کی طرح مورچے پر کھڑی تھی۔ وہ ممتا کے جذبے کو کچل چکی تھی اور فرض کا جھنڈا اٹھائے جوادی خانم کی پائنتی بیٹھی ہوئی بچے کو دودھ پلا رہی تھی ——— "اس نے سانپ جنا ہے۔" لاشعور میں دبی ہوئی آواز نے سر اٹھایا اور اس نے بچے کو گود سے جھٹک کر جوادی خانم کے برابر ڈال دیا۔

منگنی کی رسم پر جو اس کی آنکھیں بہنی شروع ہوئیں تو وہ خود حیران رہ گئی۔ جہاں آرا کی ماں کسی کام کے لئے باورچی خانے میں آئیں تو فاطمہ دھاروں دھار رو رہی تھی۔ انھوں نے جو اس کا دل ٹٹولا تو پھر کیا تھا مدت کا رکا ہوا بند ٹوٹ گیا اور اس سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا۔ خاندانی وقار، بیگماتی نفاست، جائداد، زمین، گھڑیا دنٹوں کی حویلی، قلمی آموں کے باغ اور میٹھے پانی کے کنوئیں سب ڈوبنے لگے۔ نثار احمد کی لگی لگائی بات منٹوں میں ٹوٹ گئی۔ پردے کے پیچھے چھپی ہوئی جہاں آرا نے جاتے جاتے ایک نظر حویلی اور پھر نثار احمد پر ڈالی۔ نثار احمد کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

نثار احمد کی بات بگڑتے کے اندر اندر ٹوٹ گئی پر جوادی خانم اپنی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ بیسیوں نائنوں اور میراثنوں کو اسی کام پر لگایا ہوا تھا۔

"گھرانا عزت دار ہو۔ بڑی کا پھوڑی میں فرق نہ ہو۔ ہاں بیٹیا صورت کی اچھی ہو۔ کھاتے پیتے لوگ ہوں، موئے ننگ فقیر نہ ہوں۔ میں سوا لاکھ کی بری لے کر جاؤں گی۔"

دو ایک دن کی بھاگ دوڑ کے بعد معاملہ طے ہو جاتا۔ منگنی کے لڈو تقسیم ہوتے۔ دروازے نوبت رکھی جاتی اور جوادی خانم کی بیٹ بیٹا آنکھوں

میں ڈھیروں چراغ جل اُٹھتے۔ پھر راتوں رات جانے کیا ہوتا، پھلکا کی منگنی کے لڈو، زردوزی کے کام کے دوپٹے، ہیرے کی انگوٹھی، پھول اور پان سب واپس آجاتے اور جوادی خانم تلملا کر رہ جاتیں۔

نثار احمد کی بات سب اونچے اور شریف گھرانوں میں لگی اور سب جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ گئی۔ یہ ایسے ذہنی دھچکے تھے کہ نثار احمد کے سیاہ بھنور سر پر برف کے گالے سے نظر آنے لگے۔ قدم بوجھل اور ویران نظریں۔ تھک ہار کر انھوں نے چھجوں اور منڈیریوں کا سہارا لیا اور آنکھوں ہی آنکھوں سے انھوں نے وہ کچھ حاصل کرنا شروع کر دیا جو جوادی خانم سوا لاکھ کا چڑھاوا چڑھا کر بھی نہ کر پاتیں۔ شکیلہ بیگم سے شادی محض ایک وقتی جذبہ تھا۔ کچھ اپنی مردانگی کا ثبوت بھی پیش کرنا تھا اور یار دوستوں کی پھبتیوں کا جواب بھی دینا تھا، جو مذاق ہی مذاق میں نشتر سے چبھوتے رہتے تھے۔ شکیلہ بیگم کو بیاہ تو لائے اور شادی کے ایک سال بعد بیٹی بھی پیدا کروا دی پر ان کے ساتھ وہ زیادہ دیر نہ چل سکے۔ شکیلہ بیگم دوہرے بدن کی ایک نفسیاتی عورت تھیں جو پہلی بیٹی پیدا کرنے کے بعد دوسری زچگی کے انتظار میں اور تن گئی تھیں۔ عورت کی یہ درجہ دیکھنے کا نثار احمد میں کہاں بوتا تھا۔ ان کے لئے عورت بڑے فاصلے کی چیز تھی۔ گڈی لمبی ڈوری کے سرے پر لہراتا ہوا ایک دھبہ، کچے پکے گھروں میں ڈوبتے ابھرتے چہرے، چارے کے ڈھیر میں سے جھانکتی ہوئی گیہوں کی کچی بالی یا فضا میں بکھرا ہوا ہرا رنگ۔ یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ شکیلہ بیگم کے بھاری بھرکم وجود میں ہر چیز گم ہو کر رہ گئی تھی۔ نثار احمد اندر سے باہر، اوپر سے نیچے ڈھیروں چکر لگا ڈالتے۔ کبھی بھٹکتے بھٹکاتے جو کمرے میں آنکلتے تو شکیلہ بیگم بچی کو گود میں ڈال کر ان کے سامنے بیٹھ جاتیں "وہ مجّو کی ماں آئی تھی۔" وہ بچی کو دودھ پلاتے ہوئے کن انکھیوں سے نثار احمد کو دیکھتیں۔

"ہوں" نثار احمد ان کی طرف دیکھے بغیر ہنکارہ بھرتے۔

"کہہ رہی تھی اپنے بچھڑے کو کھونٹے سے باندھ کر رکھو۔" انھوں نے نثار احمد کو آنکھ ماری اور پھر بولیں: "اے، میں تم سے پوچھتی ہوں تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے؟ کیوں اپنی نیت ڈانواں ڈول کرتے پھرتے ہو؟ میں کیا کسی سے کم ہوں؟" وہ پلنگ پر اور پھیل کر بیٹھ گئیں۔

نثار احمد گڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ گئے۔

شکیلہ بیگم عجیب شش و پنج میں تھیں۔ کبھی سوچتیں "جب یوں ہی مجھ سے آنکھیں سینکنی تھیں تو مجھے بیاہ کر ہی کیوں لائے تھے؟" —— غضب خدا کا! اے یہ کوئی ننھے ہیں؟ بال پکنے پر آرہے ہیں! نہ وارث نہ پوت، یہ جائداد زمینیں یوں ہی موئے اُلفتّوں کے نیگ لگیں گی۔ عقل ہو تو اب بھی سنبھل جائیں۔"

وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھیں۔ کبھی بڑ بڑی اُٹھتی تو سر شام بچی کو سلا کر، خود بن سنور کر دروازے پر آنکھیں لگا کر بیٹھ جاتیں۔ میاں آتے تو کانٹوں والی بیل کی طرح ان کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ جاتیں۔ نثار احمد کے ٹھٹھرے ہوئے وجود میں شعلہ سا بھڑکتا اور دوسری طرف پورا آتش فشاں پھٹ پڑتا اور نثار احمد پھر بوکھلا جاتے۔ تب شکیلہ بیگم کو ہر چیز پانی کے ریلے میں بہتی ہوئی محسوس ہوتی، زمینیں، دکانیں، آموں کے باغ، میٹھے پانی کے کنویں سب ان کے سینے پر ڈھیر ہو جاتے اور اس پر دندناتی ہوئی درجن بھر افراد کی فوج، ممیرے خلیرے رشتہ دار —— رشتہ داریاں تو اسی ایک وقت نکلتی ہیں۔

"اے ہے کیسی لتھڑ پڑے گی!" انھوں نے بچی کا پوتڑا بدلا اور دل مسوس کر رہ گئیں۔ "آج کو یہ لونڈا ہوتا تو مجھے پڑی تھی جو میں یوں اپنی اوقات خراب کرتی۔ مجھے کاہے کو یہ کسبیوں جیسے جتن کرنے پڑتے۔ یہ بھی کوئی شریف زادیوں کے ڈھنگ ہیں؟"

نثار احمد کو راہ راست پر لانے کے لئے شکیلہ بیگم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ کوٹھے والیوں کی طرح سج بن کر بھی بیٹھیں۔ چوڑیدار شرعی کا پاجامہ، جالی کے کرتے کے اندر زردوزی کے کام کا محرم، ابرِ رواں کا گنگا جمنی بانکڑی ٹکا ہوا دوپٹہ، مانگ میں افشاں، آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر مسّی کی دھڑی، اُجاڑ صورت لئے جگنوں کی طرح ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھی بھریں۔ روٹھی رانی کی طرح دنوں اَٹواٹی کھٹواٹی لئے بھی پڑی رہیں پر پتھر میں جونک نہ لگنی تھی نہ لگی۔ دن تو نثار احمد کا باہر گزرتا تھا اب راتیں بھی باہر گذرنے لگیں۔ شکیلہ بیگم سب کچھ دیکھتیں اور خاموش رہتیں۔ کبھی کچھ کہنے کے لئے زبان کھولتیں تو نثار احمد کی ماں جوادی خانم تڑاخ سے بول پڑتیں۔ "اے بیوی تم کیا جانو یہی تو اپنی شان ہے! ایسے نہ ہوں تو پھر رئیسوں اور فقیروں میں فرق ہی کیا ہوا! نثار احمد کی کیا بات کرو ہو، اس کے باوا تو اٹھواڑوں بھی گھر میں نہیں آتے تھے! آج مجرا ہے تو کل سماع، آج قوالی ہے تو کل عرس، وہ تو بھلے کو میں فاطمہ کو لے آئی، خدا مغفرت کرے اس بچی نے میری زندگی گذروادی۔" جوادی خانم کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔

شکیلہ بیگم ایک چھوڑ دس فاطماؤں کو بلالیتیں پر یہاں فاطمہ کی ضرورت کسے تھی؛ پھر شکیلہ بیگم خود کیسی ہزار فاطماؤں پر بھاری تھیں۔ مہینے پندرھویں جب بھی ان کو موقع ملتا وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر جال پھینکتیں جس کو دیکھتے ہی نثار احمد سرکش گھوڑے کی طرح بدکتے اور دولتی جھاڑ کر کھڑے ہو جاتے۔ شکیلہ بیگم کے دن اجاڑ اور راتیں ویران ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ پوری رات جاگتی رہتیں اور پوری رات روتی رہتیں، وہ اس دن کو کوستیں جب وہ سہرا دوپٹہ اوڑھ کر صحن میں نکلی تھیں اور نگاہیں حویلی کی چھت سے جا ٹکرائی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو برا بھلا کہتیں جنھوں نے بھٹی میں تپی ہوئی اینٹوں سے بنی ہوئی سرخ سلگتی ہوئی عمارت تو دیکھی پر عمارت کے اندر کے بھنڈار کو محسوس نہیں کیا۔ یہ سرد اور خنک راتوں کا سناٹا ان کے ہی مقدر میں لکھا تھا۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوئی صحن میں نکل آئیں۔ باہر نکل کر انھوں نے گہرا اور طویل سانس لیا اور صحن سے دالان اور دالان سے صحن کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ صحن میں نوکر چاکر سوئے ہوئے تھے۔ باورچی خانے کے قریب کریمن کا پلنگ پڑا تھا اور وہ گٹھری مارے پڑی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور بالوں کے لچھوں میں دو ایک مچھر اٹکے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے اس کے سلیپر پڑے تھے۔ سرہانے پانی کا لوٹا رکھا تھا اور اس پر نقشین کٹورا ڈھکا ہوا تھا۔ برابر کے پلنگ پر اس کا بیٹا رمضان سو رہا تھا۔ رمضان کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹھکیں ۔۔۔ اتنا وقت گذر گیا! انھوں نے پھر رمضان کو دیکھا، ان کو اپنی بصارت پر شبہ ہو رہا تھا۔ ابھی تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو رمضان ایک دُبلا پتلا ننھی سا لڑکا تھا جو کریمن کے ساتھ یا ورچی خانے کے پیڑھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ اب اس وقت پوری چارپائی گھیرے پڑا تھا۔ کشادہ شانے اور فراخ پیشانی۔ شکیلہ بیگم نے کریمن کو دیکھا، سوکھی مرنڈا سی عورت، وہ دل پکڑ کر رہ گئیں۔ آج کو میاں کسی کرم کے ہوتے تو وہ ایسے ایسے سات بیٹے پیدا کر کے رکھ دیتیں۔ ان کا دل چاہا وہ رمضان کو اٹھا کر اپنی اُجڑی کوکھ میں بھر لیں پر کریمن کا سوکھا ہاتھ لاکھ کی مہر کی طرح اس کے فراخ سینے پر دھرا تھا۔

رمضان باہر کے کام پر مقرر تھا۔ وہ نثار احمد کا حقہ بھرتا، چبوترے پر چھڑکاؤ کرتا۔ مونڈھے کرسیاں نکالتا۔ نثار احمد کے سر میں مالش اور بدن پر لگے مانے کا کام اس کے سپرد تھا۔ نثار احمد کا زیادہ وقت اب باہر گذرتا تھا اس لئے کریمن نے اس کو اندر کے کام پر بھی لگا لیا تھا۔ نثار احمد کو نہ مالش کی ضرورت تھی اور دکھوں کی۔ انھیں کون سی ایسی دھینگا مشتی کرنی پڑتی تھی۔ نگاہ بازی میں ایسی کون بہت محنت پڑتی ہے۔ چھتوں چھتوں اور منڈیروں منڈیروں گھومتے گھومتے جب تھک جاتے تو سڑک پر نکل جاتے۔ چلتے چلتے کسی گھر میں جھانک لیا، کسی کونے میں دُبکی سمٹی لڑکی کی کلائی پکڑ لی، کسی کا دوپٹہ گھسیٹ لیا۔ اور کسی کے کبھی مار دی، بچیوں کے ماں باپ بھی یہ سوچ کر کہ رئیس زادے ہیں ڈھیل دے جاتے تھے۔ پھر یہ بیچاری اور یہ چھپر کھٹ بیٹیاں ان کی بچیوں کا مقدر بھی بن سکتی تھیں۔ اب سید برکت علی کی لڑکی شکیلہ راج رچ رہی ہے نا! یہ تو کوئی شکیلہ بیگم سے پوچھتا جو اس راج بھون میں بے پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ وہ تو جب سے رمضان نے اندر باہر سنبھالا تھا ان کو ذرا چین سا آ گیا تھا۔ گھر میں اپنائیت اور نوجوانوں کی شان سے گھومتے ہوئے رمضان

پران کو اپنے ہی بیٹے کا گمان ہوتا اور وہ اپنی گوری اور سڈول پنڈلیاں کھول کر بیٹھ جاتیں۔

"لے ذرا میرے تلوے تو سہلا دے" وہ اپنے مخمل کے بھڑے جیسے پیر اس کے آگے پھیلا دیتیں۔ رمضان کی آنکھوں میں ستارے سے کوندجاتے اور شکیلہ بیگم خاموش بیٹھی اس کو دیکھتی رہتیں۔ پھر روز کا معمول ہو گیا۔ رمضان اپنے کاموں کو نبٹا کر شکیلہ بیگم کے کمرے میں آجاتا۔ کبھی ان کے تلوے سہلاتا کبھی سر میں تیل لگاتا اور کبھی بدن پر ہلکے ہلکے مکے مارتا۔ اس کے مکوں میں نہ کوئی آسودگی تھی اور نہ جسمانی راحت۔ بچھو کے ڈنک کے پنجوں والے ہاتھ۔ کبھی کبھی شکیلہ بیگم کا دل چاہتا وہ ان گول مٹول مٹھیوں کو اپنے کلیجے میں رکھ لیں۔ انھوں نے کمرے سے جاتے ہوئے رمضان پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی "اے ہے ڈوبے کی ابھی مسیں ہی بھیگی ہیں!"

پیار کا بے پناہ جذبہ شہد کے گھونٹ کی طرح ان کے حلق میں اتر گیا۔ اس شہد کی مٹھاس کا اندازہ تو ان کو اس دن ہوا جب نثار احمد بغیر کہے سنے دھڑ سے کمرے میں گھس آئے شکیلہ بیگم کھلے سر بیٹھی تھیں شبنمی کرتے کے گریبان میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے اور جھولے پڑ رہے تھے۔ انھوں نے شلوار کے پائنچے گھٹنوں گھٹنوں تک چڑھا رکھے تھے۔ ان کے دودھیا پیر نواڑی پلنگ پر چاندی کے کٹوروں کی طرح دھرے تھے اور رمضان ان پر ٹھنڈے پانی سے ٹکور کر رہا تھا۔ نثار احمد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زمین پر بیٹھے ہوئے رمضان کو ایک ٹھوکر ماری اور دروازے کے باہر دھکیل دیا اور خود پلنگ پر گر پڑے۔

"الٰہی خیر" کہتی ہوئی شکیلہ بیگم اٹھیں پیشانی پر ہاتھ رکھا اور دبانا یا۔ آگ بھڑکی اور بجھ گئی۔ پر بجھتے بجھتے شکیلہ بیگم کو اس چنگاری کا پتہ دیتی گئی جس سے سرد اور بجھی ہوئی آگ کو دہکایا جا سکتا ہے۔ پر کبھی کبھی وہ خود جھینپ جاتیں۔

"اے ہے! او رمضان ڈوبا بھی کیا سوچتا ہوگا!" وہ دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرتیں۔ اپنے دل کو ٹٹولتیں۔ ان کا دل آئینہ کی طرح شفاف تھا۔ نہ کوئی داغ نہ دھبہ۔ وہ پھر رمضان کو آواز دیتیں، اوپر سے نیچے تک اس کو دیکھتیں۔ ہلکا پھلکا معصوم سا جذبہ اپنی تمام تر شدت کے ساتھ ان کی آنکھوں میں امنڈ آیا۔ ایک ایسے ہی گبھرو جوان بیٹے کی آرزو میں وہ شطرنج کی بازی بچھا بیٹھی تھیں۔ رمضان تو محض مہرہ تھا شاہ کو مات دینے والا ایک چھوٹا سا مہرہ۔

وہ گھنٹوں اپنے کمرے میں رمضان کو بٹھائے رکھتیں، کبھی اس سے سر دبواتیں اور کبھی بازوؤں پر انگلیوں سے چٹکیاں لگواتیں، کبھی کمر سہلانے کو کہتیں، تو کبھی جھانوے سے ایڑیاں رگڑواتیں۔ نثار احمد کبھی بھولے سے اندر آتے تو رمضان بوکھلا جاتا۔ دھل دھل کرتا ڈھیروں پانی شکیلہ بیگم کے کپڑوں کو لت پت کرتا ہوا اس کے ہاتھوں سے گرنے لگتا۔ پانی کی تیز نوکیلی دھاریں، رمضان کی بوکھلاہٹ اور نثار احمد کی عرق آلود پیشانی، شکیلہ بیگم کا چہرہ برف کے اس ٹکڑے سے مل جاتا جس پر سورج کی روشنی نے پوری قوس قزح کھلا دی ہو۔ تب وہ نظر اٹھا کر نثار احمد کو دیکھتیں اور ان کی نگاہیں چندھیا جاتیں۔ راکھ کے ڈھیر میں سونے کے تارے چمکنے لگے تھے۔

نثار احمد کے معمولات میں آہستہ آہستہ فرق آرہا تھا۔ ان کی نگاہوں میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ چنچل اور منڈیروں کو ٹٹولنے والی نظریں اب شکیلہ بیگم کے چہرے پر آٹکی تھیں۔ شکیلہ بیگم کی سفید رنگت میں گلاب سے کھلتے جا رہے تھے۔ پھر بھی وہ دہکتے گال اور کسی تتی کا ٹخنی لئے مختلف امراض کی پوٹ بنی بیٹھی رہتیں نثار احمد کی موجودگی میں ان کے سارے مرض اٹھ کھڑے ہوتے۔ وہ چہرے پر انتہائی کرب کی کیفیت پیدا کر کے رمضان کو پکارتیں "لے ذرا میرے سر میں مالش کر کہ درد سے پھٹا جا رہا ہے"۔۔۔ "ذرا وہ خمیرے کی شیشی تو اٹھا لا کیسا خفقان سا ہو رہا ہے" وہ دوپٹہ الگ ڈال کر پھونک پھونک کر گریبان کے اندر پھونکیں مارتیں اور جب وہ جانے کے لئے مڑتا تو کہتیں "رات کو گرم پانی کی بوتل لا کر سنکائی کر جیو"۔

نثار احمد کا پورا چہرہ شکنجے کی طرح کس جاتا۔ ان کی کنپٹیوں پر بھاپ سی اٹھنے لگتی اور ان کا دل چاہتا کہ وہ تیل بھری کٹوری رمضان کے ہاتھ سے چھین کر شکیلہ بیگم کے کپڑوں پر چھڑک کر آگ لگا دیں۔ وہ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر بے چینی سے ٹہلتے۔ چلتے چلتے کن انکھیوں سے شکیلہ بیگم کو بھی دیکھ لیتے جو

سر کے بعد گردن اور گردن کے بعد کمر سہلوا کر مکر کرکے سوتی بن جاتیں۔ نثار احمد کے مزاج کی تبدیلی اور ارادوں کی مضبوطی دیکھ کر وہ بڑی بڑی مسکرایا کرتیں۔ جوں جوں نثار احمد کا چہرہ تمتماتا، نتھنے کانپتے، بازو اور پنڈلیوں کی مچھلیاں پھڑکتیں، شکیلہ بیگم پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے ہلکی پھلکی کشتی ہواؤں کے بادبان سنبھالے سمندر پر ہلکورے کھا رہی ہو۔ آنے والا وقت نفیریاں بجاتا ہوا ان کے سامنے آکھڑا ہوتا۔

”اے ہے کیسی سب پر اوس پڑ جائے گی!“ وہ لیٹے ہی لیٹے مسکرانے لگیں اور ایسے میں ان کا دل چاہا وہ رمضان کو سینے سے لگا کر پڑ رہیں۔

رمضان! وہ ان سب حدود کو پھلانگتا ہوا بہت آگے نکل چکا تھا۔ شکیلہ بیگم کے تلووں پر ٹھنڈے پانی کی ٹکور کرتے کرتے اس نے ان پیروں کے نیچے جو جنت دیکھی تھی وہ محض ڈھکوسلا تھی۔ اس کے قدم بھٹکنے لگے تھے۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا۔ سوچتا کچھ تھا، کرتا کچھ تھا۔ کریمن ہر وقت گلا پھاڑتی رہتی ”اوے اندھے یہ تو نے برتن صاف کیے ہیں؟“ —— ”اے حرام خور! یہ میاں کا حقہ بھرا ہے یا اپنا کلیجہ؟“ —— ”مردے، میں تجھ سے پوچھوں ہوں یہ تو دوڑ دوڑ کر بیوی کے کمرے میں کیوں جاوے ہے؟“

شکیلہ بیگم خود حیران تھیں: نثار احمد اور رمضان دونوں ایک ہی موڑ پر آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں ایک ہی ڈوری سے بندھے ہوں۔ ڈوری کھینچیں گی تو دونوں گھسٹتے چلے آئیں گے اور سرا چھوڑا تو دونوں ہی دیوار سے جا ٹکرائیں گے۔ وہ عجیب مخمصے میں تھیں۔ کبھی سوچتیں، سرا چھوڑ دوں میری بلا سے دونوں جئیں یا مریں، پر وہ اس جھٹکے کو بھی برداشت کر پائیں گی جو ان دونوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوگا؟ وہ تو خیر برداشت کر بھی لیں مگر یہ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی پکی پختہ عمارت! لکھوری اینٹوں سے بنی ہوئی اس عمارت میں کوئی رخنہ نہیں تھا۔ کہیں کوئی آڑ یا خم نہیں تھا۔ کوئی جھول نہیں تھا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے پھونس کے چھپروں اور کچے پکے مکانوں کے ساتھ ساتھ صدیوں سے یوں ہی کھڑی تھی۔ خاندانی عظمت اور وقار کی نشانی۔ شکیلہ بیگم نے دادی خانم سے ایسی ایسی ڈھیروں کہانیاں سنی تھیں۔ اس لئے وہ بڑی چابک دستی سے لگام تھامے ہوئے تھیں ورنہ ذہن میں تو رات دن گھڑ دوڑ سی ہوتی رہتی تھی۔ بیسیوں مرتبہ ان کا دل چاہا تھا: ”اے میاں کو خبر بھی نہ ہوگی“ رمضان کے تن و توش کو دیکھ کر ان کے سینے میں ہوک سی اٹھتی، پھر تڑپ تڑپ کرکے اپنے دونوں کچے پٹ ڈالتیں۔ ہاتھ منہ پر پانی ڈالتے وقت اگر رمضان کا ہاتھ کہیں اوندھا سیدھا پڑتا تو وہ تیز نظروں سے اس کو گھورتیں: ”اپنے جامے میں رہو میاں“ وہ گھرکتیں اور رمضان سہم کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے کچے پکے چہرے کو دیکھ کر شکیلہ بیگم کی سوکھی چھاتیوں میں فوارے سے ابلنے لگتے سینے میں آبشار سے گرتے اور آنکھوں سے بوندا باندی شروع ہو جاتی۔

”تو ڈوبے کو خواہ مخواہ ہی جھوٹ لگا۔“ ان کو رمضان پر بے طرح پیار آنے لگتا۔ رمضان تو ان کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ کیا بغیر جانے بوجھے وہ نٹ کی طرح ان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ وہ چھپروں میں لمبے لمبے بانس باندھ کر آسمان کی وسعتوں میں سے نثار احمد کو گھسیٹ کر لایا تھا۔ لمبی لمبی ڈوریوں کے سرے پر فضا میں ہزاروں لال، نیلے، پیلے دھبے کانپ رہے تھے، پر نثار احمد کی نظریں اب اپنے گھر کے دالان میں جم کر رہ گئی تھیں، جہاں نواڑی پلنگ پر شکیلہ بیگم بیٹھی رہتی تھیں۔ آنے والے وقت کے تصور سے شکیلہ بیگم کے حلق میں مٹھاس سی گھلتی رہتی تھی۔ جب دروازے پر نوبت رکھی جائے گی اور چاند جیسے بیٹے گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنا حق مانگیں گے، وہ کوئی ننھی چونچ تھوڑی ہیں وہ اشرفیوں سے ان کا منہ بھریں گی —— وقت آئے تو سہی، انھوں نے پلنگ پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی۔ نثار احمد ہفتہ بھر کے لئے ٹور پر گئے تھے۔ جاتے وقت انھوں نے بڑے دلار سے بیوی سے اجازت لی تھی۔ شکیلہ بیگم نے دل ہی دل میں کچھ حساب کتاب لگا کر ان کو اجازت دی تھی۔ آج ان کی واپسی تھی۔ شکیلہ بیگم اسی نشے سے سرشار تھیں اور پلنگ پر لیٹی لیٹی جھول سی رہی تھیں۔ تنہائی کے خوف سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انھوں نے رمضان کو کمرے میں بٹھا لیا تھا۔ انھوں نے لیٹے لیٹے گردن اٹھا کر رمضان کو دیکھا۔ وہ پلنگ کی پائنتی گم سم بیٹھا ہوا بھی بڑا بھلا سا لگ رہا تھا۔ جیسے وقت آنے سے پہلے اپنا حق مانگ رہا ہو اور تب شکیلہ بیگم کا دل چاہا وہ رمضان کو منہ مانگا انعام دے ہی ڈالیں۔

اس خیال کے آتے ہی ان کو جھرجھری سی آئی۔ ابھی دو دن پہلے جوادی خانم نے ان کو بتایا تھا: "سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی اس عمارت میں کوئی بھول نہیں ہے۔ یہ صدیوں سے پھونس کے چھپروں کے سہارے سہارے یوں ہی کھڑی ہے اور اس کو کھڑا رکھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں"۔ اور تب ہی شکیلہ بیگم کو اپنے اوپر آسمان گرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ میاں کسی جوگے ہوتے تب بھی ٹھیک تھا۔ پر وہاں تو معاملہ ہی چوپٹ تھا۔ بہت کھینچ تان کے بعد گاڑی ایک خاص مقام پر آ کر اٹک سی گئی تھی۔ یہ سوچ کر شکیلہ بیگم کو دھچکا سا لگا اور پھر سارا گھر ڈگمگاتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے ایک سسکی لی اور اندھیرے میں اپنے بازو پھیلا دیے اور تب تنی ہوئی ڈوری کا سرا خود بخود ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ فضا میں نہ جھٹکا تھا اور نہ ٹکراؤ، بس ایک گہری اور طویل خاموشی کمرے میں بکھری ہوئی تھی۔
صبح کو ان کی آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ برابر کے پلنگ پر نثار احمد لیٹے تھے، اور خراٹے لے رہے تھے۔

نثار احمد اس مرتبہ عرس سے کیا واپس آئے تھے بس گھر کے ہی ہو رہے تھے۔ کہاں تو شکیلہ بیگم کی پرچھائیوں سے بھاگتے تھے، کہاں پروانہ وار نثار، سرہانے پائنتی ہی پھرتے رہتے۔ عورت نثار احمد کے لئے بڑے فاصلے کی چیز تھی۔ گڈوں لمبی ڈوری کے سرے پر لہراتا ہوا دھبہ، کچے پکے گھروں میں ڈوبتے ابھرتے چہرے، یا فضا میں بکھرا ہوا ہرا رنگ۔ اُدھر رات کی رات میں شکیلہ بیگم نثار احمد سے کٹ کر بہت دور جا پڑی تھیں اور یہ فاصلہ ہی وہ پل صراط تھا جس سے گذر کر نثار احمد ان تک پہنچے تھے۔ نثار احمد کو یہ سب فاصلے عزیز تھے اور شکیلہ بیگم بولائی جا رہی تھیں۔ وہ اپنا آپا سلئے کمروں، دالانوں میں دبکی پھرتیں۔ جوں جوں نثار احمد ان کی طرف کھنچ رہے تھے وہ سمٹی جا رہی تھیں۔ طاق سا منہ سُت سُتا کر ذرا سا نکل آیا تھا۔ پیلی زرد رنگت اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ نثار احمد کو دیکھ کر ان کا سارا دم سمٹ کر آنکھوں میں آ جاتا، کچھ کہنے کے لئے زبان کھولتیں تو الفاظ حلق میں گولے بن کر پھنس جاتے۔ ان کو کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے ہوئے ہی پوری کی پوری آواز تھیں اور نثار احمد، عادل شہنشاہ؟ بڑے ٹھہرے ٹھہرے اور سنبھلے سنبھلے وہ سینہ پھلائے پھلائے اندر باہر پھرا کرتے۔

"اے ہے کیسے خوش ہیں!" ان کو ہاتھی کی طرح گھر میں جھومتے ہوئے دیکھ کر شکیلہ بیگم کو اختلاج سا ہونے لگتا۔ وہ سارا سارا دن اوندھی سیدھی سوچوں میں گذار دیتیں۔ پھر رات آتی — رات کے خیال ہی سے اب ان کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔

"اور جو کبھی اکیلے دکیلے میں میاں ہاتھ پکڑ بیٹھے!" ان کو پلنگ پر لیٹے لیٹے خیال آیا اور تب ان کا دل چاہا وہ دیوار سے سر ٹکرا کر اپنا خاتمہ کر لیں۔ وہ پلنگ سے اٹھیں۔ ابھی وہ دیوار تک پہنچی ہی تھیں کہ انھیں سرخ پتھریلی دیوار ڈولتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ انھوں نے دیوار پر کان لگا دیے اور تب آواز کی گنگناہٹ سے ان کی آنکھوں میں نیند سی آنے لگی۔

دیوان خانے میں حقے کی نے منہ سے لگائے نثار احمد بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے جائداد کے کاغذات کھلے پڑے تھے اور وہ منشی جی کو عنقریب ہونے والے اپنے وارث کی خوش خبری سنا رہے تھے۔

جمیل الزماں

شاید

باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور اصغر اپنے بستر میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ "ڈی کنفیڈیشنز" کی رومانی کہانیاں پڑھنے اور "پلے بوائے" کی تصاویر بار بار دیکھنے کے بعد وہ بے چین ہو رہا تھا۔ وہ ان کہانیوں اور تصویروں کو حقیقت کا روپ پہنانا چاہتا ہے اور اسی امید میں وہ پہلی مرتبہ مری آیا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مری میں ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں ایک رواجی اجتماع ہوتا ہے جہاں خوشحال گھرانوں کی نوجوان لڑکیوں کی فیشن پریڈ ہوتی رہتی ہے اور وہیں دور اندیش بہنیں اپنے بھائیوں کے لئے دلہنیں اور مائیں اپنے بیٹوں کے لئے قبل از وقت رشتے ڈھونڈتی ہیں۔ شاید اسی تلاش زن و شوہر میں کئی مراحل طے ہو سکیں۔ سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا اور وہ مال روڈ کی سیر کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ آخر مری آنے کا کیا فائدہ اگر مال روڈ کی سیر نہ ہو اور نئے سال کی نئی بود پر نظر نہ ڈالی جائے۔

بارش تھمنے کے آثار نمایاں ہوئے تو اصغر پلنگ سے اچھل کر کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا اور شیشوں میں سے آسمان کا جائزہ لینے لگا۔ بادل برسنے کے بعد کبھی کبھی گرج رہے تھے اور سورج کی ہلکی شعاعیں کہیں کہیں سرمئی بادلوں میں سے جھانکنے لگی تھیں۔ وہ تیار ہونے لگا اور جب چھتری کی چھڑی لئے وہ سٹرابری بینک سے کشمیر پوائنٹ کی طرف روانہ ہوا تو مطلع قدرے صاف ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈاکخانے تک اس کے پہنچتے پہنچتے مال روڈ پر حسینوں کا جمگھٹا لگ چکا ہو گا اور وہ کم از کم اپنی آنکھوں سے اپنے دل کی پیاس بجھانے کا جتن کر سکے گا۔ ڈاکخانے کے چوک پر حسب معمول نوجوانوں کے غول تو موجود تھے لیکن سڑک پر لڑکیوں کی تعداد ابھی ناکافی تھی۔ شاید اپنے رنگین ملبوسات کو اچانک بارش سے بچانے کی خاطر آج کم لڑکیاں سیر کو نکلیں گی۔ اصغر نے سوچا۔ حسرت بھری آہ سرد بھری اور مال روڈ پر سیدھا جانے کی بجائے چند منٹ ڈاکخانے کے چوک میں رکنے کے بعد وہ مسجد کے عقب میں "لوور لین" کی طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک نسبتاً خاموش تھی اور ادھر عموماً بیاہتا جوڑے ہی چکر لگاتے تھے۔

برائٹ لینڈ ہوٹل کے دروازے کے قریب اس کی نگاہ نیچے خاموش پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گھوم رہی تھی کہ اسے ہوٹل کی سڑک پر ایک بازو ہوا میں لہراتا نظر آیا۔ "ارے یہ تو شامی ہے۔" وہ مسکرایا۔ گرمجوشی سے جوابی ہاتھ ہلایا اور ہوٹل کی سڑک پر نیچے اترنے لگا۔ شامی کسی غیر ملکی فرم کا سیلز سپروائزر تھا اور مری کے مختصر دورے پر آیا ہوا تھا۔ اصغر سے مل کر وہ بے حد خوش ہوا اور اسے اپنے ساتھ شام گزارنے کی دعوت دی۔ اصغر اپنی تنہائی سے بیزار تھا۔ وہ فوراً اپنے پرانے ہم جماعت کے ساتھ گھومنے پر آمادہ ہو گیا۔ دونوں اکٹھے مال روڈ پر چکر کاٹتے کاٹتے اپنی نگاہیں سیر کر چکے تو شامی نے کہا۔ "ارے یار۔ کیا زندگی کی راتیں یوں ہی اکیلے گذارنی پڑیں گی؟"

"میں تو ہفتے بھر کی چھٹی گذارنے آیا ہوں۔ والدہ اور ہمشیرہ بھی ساتھ ہیں۔" اصغر نے جواب دیا۔

"آخری فلم شو آدھی رات کو ختم ہوتا ہے۔ تب تک تو تم میرے ساتھ رہو۔" اصغر مان گیا تو شامی اسے ایک ریستوران میں لے گیا۔ جہاں قیام پاکستان کے ایک سال بعد امتناع شراب نوشی کے قانون کے نفاذ پر چائے کی پیالیوں میں مے نوشی کا رواج تھا۔ اصغر تو کافی پیتا رہا اور رمبا سمبا ناچ کی دھنوں سے محظوظ ہوتا رہا اور شامی کو چند اور دوست مل گئے جن کے ساتھ اس کے دیگر پروگرام طے ہوتے رہے جن میں ضرورت کی چیز کو بازار سے کرائے پر لینے کا عزم شامل تھا۔ اصغر کو یہ بات کبھی نہ بھائی تھی چنانچہ وہ ان سے اجازت طلب کر کے پہلے شو کے اختتام کے وقت تک ہی گھر لوٹ آیا۔

اگلے چھ روز بھی اسی یکسانیت سے گزر گئے۔ وہی ہر روز صبح دس بجے کشمیر پوائنٹ سے پنڈی پوائنٹ کی سیر اور نظارۂ فطرت و تماشائے جمال اور پھر شام کو مال روڈ کے چکر۔ دوستوں سے سرسری ملاقاتیں اور لڑکیوں کے اتے پتے کی باتیں۔ ایک آدھ مرتبہ کسی دوست کی وساطت سے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا بھی تو اصغر نے خوشی سے دو تین لڑکیوں کے ٹکٹ خرید دیے۔ انہیں چائے پلائی۔ کباب کھلائے لیکن ایسے مہمانوں کی باتوں سے اسے عیاری کی جھلک نظر آئی اور اسے اپنے اسراف کا افسوس ہوا۔ اس کی تنہائی اور تشنگی کے گھاؤ اور گہرے ہوتے گئے حتیٰ کہ وہ مری کی سیر سے لوٹ آیا۔

برائٹ لینڈ ہوٹل کا بیرا دروازے پر دھیمی دھیمی دستک دے رہا تھا۔ پچھلی سہ پہر ایک نو بیاہتا جوڑا اس کمرے میں آ کر ٹھہرا تھا۔ تجربہ کار بیرے نے ان کے مسرور و شاداں رویے اور ان کے مختصر سامان سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ماہ عسل منانے مری آئے ہیں۔ ایسے جوڑے عموماً ابتدا میں فراخدلی سے ٹپ دیا کرتے ہیں اس لیئے وہ اور بھی مستعدی سے ان کی خدمت کے لئے کمربستہ تھا۔ صبح کی چائے دینے کے لیے وہ ایک مرتبہ پہلے بھی آیا تھا لیکن کچھ سوچ کر برآمدے ہی سے لوٹ گیا تھا۔ اب جب کہ ناشتے کا وقت ہو چکا تھا وہ پھر آیا اور دروازے کے باہر ہلکے ہلکے کھانسنے بھی لگا۔ دروازہ کھلا تو شب خوابی گاؤن میں ملبوس اصغر نے دہلیز پر ہی پردہ سرکا کر ٹرے پکڑ لی اور بیرے کو ایک گھنٹے بعد ناشتہ لانے کا آرڈر دے دیا۔

گیارہ بجے کے بعد جب اصغر اور ثروت شاپنگ کے لئے مال روڈ پر نکلے تو اصغر کو ایک اتھاہ آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ پچھلے دس برس میں اگرچہ وہ کئی مرتبہ موسم گرما میں مری ایک ایک ہفتہ گزارنے آتا رہا تھا لیکن مری کی اونچائی اور خنکی کے باوجود اس کی اندرونی تپش میں اضافہ ہی ہوتا رہا تھا۔ اب اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پیاسے کو صاف شفاف جھیل کا کنارہ دستیاب ہو گیا ہو اور وہ شبنم کے قطروں سے بے نیاز ہو گیا ہو۔ ثروت کی موجودگی میں مال روڈ پر سرکتی تھرکتی لڑکیوں کی طرف اس نے غور کرنا چھوڑ دیا لیکن اسے ایک اور بات پر الجھن ہونے لگی تھی۔ پہلے ایک، دو دن تو اس نے سوچا کہ ثروت کو نوجوان اور دوسرے مرد اس لئے دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے جہیز کے جوڑوں میں غیر معمولی طور پر حسین نظر آتی ہے لیکن جب یہ سلسلہ لامتناہی نظر آنے لگا تو اسے بے حد غصہ آنے لگا۔ بعض اوقات اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی مسٹنڈے کو گریبان سے پکڑ کر اس کا دماغ درست کر دے۔

ثروت اصغر کے اس شدید رد عمل پر مسکرائی۔ وہ اس بات پر تو نازاں تھی کہ اس کے آنے کے بعد اس کا میاں آسودگی کی زندگی سے ہمکنار ہوا تھا اور اب وہ حسد کی بنا پر ان لوگوں کی آنکھیں نوچ لینا چاہتا تھا جو اس کی شریک حیات کو مست نگاہوں سے دیکھتے تھے لیکن یہ حرکتیں ثروت کے لئے تو کوئی نئی نہ تھیں۔ اس نے بچپن ہی سے برقعہ نہ اوڑھا تھا اور کالج جاتے ہوئے بس سٹاپ پر لڑکوں کے آوازے یا مردوں کی غلیظ نظریں اس کے لئے کوئی غیر معمولی سانحہ نہ تھیں۔ اس نے ہمیشہ ان باتوں کو خاموشی سے نظر انداز کیا تھا اور اب

تو اصغر کی معیت میں وہ اور بھی بے اعتنائی سے ان دل پھینک گروہوں کے پاس سے گزر سکتی تھی۔ اصغر کا غصہ کم کرنے کے لئے وہ ایسے بے لگام افراد کے بارے میں سنجھی ہوئی لڑکیوں کے پرائیویٹ لطیفے اور چٹکلے سناتی۔ اصغر اس کی باتیں توجہ سے سنتا مگر پھر بھی مال روڈ پر گھومتے یا انسٹوٹ میں کافی پیتے وقت اکثر اس کی مٹھیاں بھنچی ہی رہتیں۔

ماہ عسل کا دوسرا ہفتہ گزر رہا تھا۔ اصغر بستر پر دراز اخبار پڑھ رہا تھا کہ بیرے نے دروازے پر مودبانہ دستک دی۔ ثروت ڈرائنگ روم میں بال سنوار رہی تھی۔ اصغر نے بیرے کو اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ میز پر ناشتے کی ٹرے رکھ چکا تو آہستہ سے بولا "ساتھ کے کمرے والے شامی صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے۔"

"شامی صاحب؟ کون شامی صاحب؟" اصغر سٹ پٹایا۔

"جناب وہ تو خود کو آپ کے بہت پرانے دوست بتاتے ہیں۔" بیرے نے گھبرا کر کہا۔

"رات سے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ شاید استقبالیہ کلرک سے آپ کا پتہ چلا ہے انہیں۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

کچھ توقف کے بعد اصغر نے، "ہاں۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ انہیں کہو آج ہم بھوربن گالف کورس پر لنچ کے لئے مدعو ہیں۔ واپسی پر میں انہیں خود مل لوں گا۔"

بیرا کمرے سے باہر نکلا تو ثروت نے پوچھا "یہ شامی صاحب کون ذات شریف ہیں؟"

"ارے بھئی، ہمارے پرانے ہم جماعت ہیں۔"

"بہت دوستی ہے ان سے کیا؟"

"ہاں کبھی تھی۔"

"اور اب؟" ثروت نے چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو بس۔" اصغر نے پیار بھری نظروں سے ثروت کو دیکھا اور چائے کی پیالی گرتے گرتے رہ گئی۔

بھوربن سے واپسی پر اصغر، ثروت کو اپنے کمرے میں چھوڑ کر شامی سے ملنے گیا تو وہ ابھی سو کر اٹھا تھا۔ باتوں باتوں میں شامی نے اصغر اور اس کی بیوی کو رات کے کھانے کی دعوت دی تو اصغر نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ وہ دو دن میں مری سے واپس جا رہے ہیں اور ان کا رات کا کھانا باہر طے ہے۔ "اب تو تم صرف شادی شدہ لوگوں سے ملو گے نا۔" شامی نے کہا اور اصغر ہنس دیا۔ شامی کو اصغر کا انکار ناگوار گزرا لیکن وہ مسکرا دیا۔ اور یہ سوچ کر کہ کب وہ اپنی دو جوان بہنوں کی شادی سے فارغ ہو اور کب اس کی اپنی باری آئے، دل ہی دل میں مے نوشی کا پروگرام بنانے لگا۔ اسے اگلی صبح پنڈی لوٹنا تھا اور وہ آج کی شام ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ اصغر کے روکھے پن کے باوجود شامی نے اسے خانہ آبادی کی مکرر مبارکباد دی اور اصغر اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

شوکت اور سطوت دونوں بے حد مسرور تھے۔ لاہور سے مری جانے کے لئے لگژری کوچ میں جب وہ سوار ہوئے تو ان کی دو تین سال پرانی خواہش پوری ہو رہی تھی۔ یوں تو وہ اپنے ابا سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ ان کے بعض ہم جماعتوں اور پڑوسی بچوں کی طرح انہیں بھی موسم گرما کی تعطیلات میں مری بھیجا جائے۔ لیکن ان کے ابا ہمیشہ اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر انہیں ٹال دیتے۔ ایک دفعہ سطوت بے چارے نے کہیں

کہہ دیا۔ "ہمیں امی کے ساتھ ہی مری بھیج دیں" تو ابا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے دونوں بچوں کو یوں گھور کر دیکھا کہ بے چارے سہم گئے۔ شوکت امی کے پاس باورچی خانے کی طرف بھاگا اور انہیں بتایا کہ شاید سطوت کی پٹائی ہونے لگی ہے۔ ثروت فوراً ڈرائینگ روم میں آئی۔ سطوت جو اپنی ٹوڈو کا گتہ بچھائے اسے خاموشی سے گھور رہی تھی اپنی امی کی جانب لپکی اور ان سے لپٹ گئی۔

ثروت نے اصغر سے پوچھا کہ بچوں نے کیا خطا کی ہے جو انہیں اس طرح ڈانٹا گیا ہے تو وہ بولا "اکیلے تمہارے ساتھ مری جانا چاہتے تھے" ثروت کی بے اختیار ہنسی پر اصغر جھینپ سا گیا اور دونوں بچے حیرت سے اپنے ماں باپ کا منہ تکنے لگے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد ثروت نے بچوں سے کہا کہ اگر وہ سالانہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کریں تو آئندہ سال موسم گرما میں کم از کم ایک ہفتے کے لئے انہیں مری کی سیر کرائی جائے گی۔ جب دونوں بچوں کو یقین دلایا گیا کہ ابا بھی ان کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئے ہیں تو وہ دونوں مزید توجہ سے امتحان کی تیاری میں مشغول ہو گئے اور اب ابا انہیں راستے میں نئی نئی فیکٹریاں، کارخانے اور پل دکھاتے مری لے جا رہے تھے۔ پنڈی سے آگے بچے بضد ہوئے کہ انہیں اسلام آباد اور راول ڈیم دکھائے جائیں تو اصغر نے وعدہ کیا کہ مری سے واپسی پر ایک دن پنڈی رکیں گے اور انہیں ان جگہوں کی سیر بھی کرائی جائے گی۔

برائٹ لینڈ ہوٹل کے ڈبل روم سوئیٹ میں جب شام کو سب پہنچ گئے تو بچوں نے ضد کی کہ انہیں ابھی مال روڈ کی سیر کرائی جائے۔ اصغر نے پہلے تو اپنی تھکن کا بہانہ تراشنا چاہا۔ پھر ثروت کی درخواست پر گرم چائے پینے کے بعد بچوں کو لے کر باہر نکلا بھی تو انہیں مال روڈ سے ملحقہ بچوں کے پارک میں جھولے جھلا کر واپس لے آیا۔ شوکت اور سطوت نے اگلے دنوں کا پروگرام پوچھا تو ابا نے انہیں روزانہ صبح گھوڑ سواری کی اجازت دے دی اور کبھی تھیا گلی کی سیر اور ایوبیہ کی الیکٹرک چیئر لفٹ کے چکروں اور کبھی بھوربن اور لوئر ٹوپہ لے جانے کا وعدہ کیا۔ بچے بھی بیچارے سارے دن کے سفر سے تھکے ہوئے تھے، وہ انہی دلاسوں اور توقعات کو من میں سمائے سو رہے۔

دس برس پرانی ماہ عسل کی یادیں تازہ کرتے کرتے ثروت نے اصغر سے پوچھا "آپ ایک بات بتائیں گے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور پوچھو جانِ من۔"

"آپ مال روڈ سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں؟"

"مال روڈ؟ میں مال روڈ سے کیوں گھبرانے لگا؟"

"آپ کو میری جان کی قسم۔ سچ بتائیں آپ مال روڈ سے کیوں گریز کرتے ہیں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو صرف اس وقت سے خائف ہوں جب آج سے دس برس بعد سطوت جوان ہو کر اس سڑک پر گھومنا چاہے گی۔"

"یہ کوئی انہونی بات تو نہیں۔ میں نے بھی تو شادی سے پہلے مال روڈ پر گھومنے سے گریز کیا تھا۔" ثروت بولی۔

"ہاں مگر شوکت کو گھومنے سے کون روکے گا؟"

"اس کا کیا ہے۔ وہ لڑکا ہے شاید آپ کی طرح بالآخر سنبھل جائے۔"

"شاید" اصغر نے امید ظاہر کی اور ثروت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر گہری نیند سو گیا۔

حمیدہ رضوی

پیاسا

تو کیا واقعی یہ میں ہوں۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ پھر آئینے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور اب تو اس عجیب و غریب پیاس کا احساس چہرے سے بھی عیاں ہے۔ یہ شاید ڈوریَن گرے کی تصویر ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلکتے ہوئے ٹھوڑی پر پہنچ گئے۔ پھر اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ یہ چاروں طرف کیسی دھند کی دبیز تہیں ہیں۔ محرومی اور تھکن کے احساس کی ــــ اور اتنی شدید برف باری کے باوجود میرے اندر کا خلا اور اس خلا میں پیاس کا احساس شدید تر ہے ــــ اس نے جلدی سے گلاس میں پڑا ہوا یخ پانی حلق سے اتار لیا ــــ مگر ــــ

تو کیا یہ سب اس لئے ہے کہ ایسی ہی ایک برفانی رات اس نے اپنے بازوؤں پر سوئی ہوئی لڑکی سے ــــ نہیں اس بات کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ یہ وقت کا حسین چہرہ ہے مگر المیہ ہی یہ ہے کہ حسن کوئی مجرد شے نہیں ــــ تو پھر کیا بقول صبا کے REDEMPTION ضروری ہے ــ مگر میں تو SCEPTIC تھا ــــ اور ایسی برف باری میں تنویر جعفری کو اس لئے گھر جانے کی جلدی تھی کہ گھر پر وہ حسب وعدہ نہ پہنچا تو اس کی بیوی پریشان ہو گی ــــ یہ احساس کتنا لذت رساں ہے کہ انسان کی بیوی اس کا انتظار کرے۔ مگر میں نے تو ــــ اور میں نے تو گھر پہنچ کر ــــ اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے پھر ایک بار سارے کمرے کو گھورا ــــ اس نے دیکھا کہ صبا پلنگ پر سو رہی ہے اپنی شباب کی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ ــــ اور اف! وہ تو انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی ہے اور مجھے ڈس رہی ہے اوہ ہو ــــ اس نے آنکھیں ملیں ــــ اب میری نظر بھی کمزور ہو رہی ہے۔ پھر اس نے پانی پیا ــــ وقت کے گرد و غبار نے مجھے بہت عاجز کیا ہے ــــ ابھی کل کی بات ہے جب میں اس کمرے میں اسی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا ہوا اپنے آپ کو بیحد مظلوم محسوس کر رہا تھا اور اسی کمرے میں اُدھر امی کھڑی تھیں جن کا محض ایک بوسہ میرے اندر ہزار دکھ کا سا اثر پیدا کر دیتا ــــ میں یہ بھی سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ میں کب مظلوم تھا ــــ آہا یاد آیا کل جب میں یورپ سے تار دے کر بلایا گیا تھا اور پھر اس کی شادی کی تجویز اس کے سامنے تھی اور اسے وہ رشتہ قطعی ناپسند تھا یا پرسوں جب امی دادی کی خدمت گذاری اور ابو کے دیئے ہوئے دکھوں کا بوجھ اٹھائے سسکتی رہتی تھیں۔ اور ان کے چہرے پر کسی مزار ویراں پہ جلتے چراغ کی لو کی سی ویرانی کا تاثر ہوتا اور وہ آیا کی گود اور رحم و کرم پر پڑا امی کے پیار کو ترس جاتا ــــ لمحہ لمحہ تو میرے ٹوٹے دل پر منقش ہے اور یادوں کی چلمن سے جھلک دکھاتا ہے ــــ اس گھر میں اس وقت بھی اتنی ہی ویرانی تھی ــــ اس گھر کے مقدر میں صرف ویرانی ہے ــ یا بقول صبا کے جب انسان کسی کی خوشیاں چوری کر لیتا ہے یا دباؤ ڈال کر ڈاکہ ڈال لیتا ہے تو پھر ہزار حفاظت اور احتیاط کے باوجود اس کے احساس پر بھی ڈاکہ ہی پڑ جاتا ہے ــــ مگر نہیں یہ سب کچھ نہیں ــــ بات صرف اتنی ہے کہ جب اس نے آنکھیں کھولیں وہ آیا کی گود میں تھا جو اس کی پرورش اور دیکھ بھال کرنے کے علاوہ ہمیشہ اسے چاند نگر کا شہزادہ ثابت کرنے پر تلی رہتی اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ وہ چاند نگر کا شہزادہ تھا اور چاند سے زیادہ حسین ــــ مگر امی آخر کیوں دادی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتیں جبکہ وہ امی سے ذرا بھی نرمی سے پیش نہ آتیں بلکہ پھٹکارتی رہتیں، اور نتیجۃً

امی اس کی کسر اکثر اوقات نوکروں سے نکالتیں اور ابو تو اسے کبھی کبھی دن نظر نہ آتے اور جب آتے بھی تو گھر بھر کو سانپ سونگھ جاتا۔ وہ اگر تھوڑی دیر کو دادی کے پتیانے بیٹھ جاتے۔ دادی اپنی گٹھیا کی تکلیف کا ذکر کرتے ہوئے امی کے پھوہڑپن کا ذکر کرنا کبھی نہ بھولتیں اور ابو ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے امی کو دو چار جوتے لگانا کبھی نہ بھولتے۔ امی دوپٹے میں منہ چھپا کر سسکتیں اور اگر وہ دیکھ پاتا اور انا کے سر ہو جاتا کہ وہ اس سب کی وجہ بتائے تو انا کا اپنا چہرہ پیلا پڑ جاتا اور پھر وہ کسی ایسے شہزادے کی کہانی سنانے لگتی جو حسین ترین ہے اور اس کی جھلک پاتے ہی لڑکیاں دھڑا دھڑ بیہوش ہو جاتی ہیں اور آخر میں یہ کہ وہ شہزادہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا میرا منا حسن زیب ہے۔ اور پھر اسے پیاس لگنے لگتی اور اس کا دل چاہتا دنیا میں کوئی نہ ہو صرف اس کی ماں کی گود ہو اور وہ اس میں کلکاریاں مار رہا ہو ——— مگر یہ کہاں ہو سکتا تھا ——— وہ جب کبھی امی کے رونے کا سبب ہی انا سے پوچھتا تو وہ گھبرا کر بات ٹال دیتی "ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ ابو بڑے جلاد ہیں، میری زبان کاٹ دیں گے؟"

اور وہ خوفزدہ ہو کر انا کی گود میں منہ چھپا لیتا۔ ایسے ہی سہمے ہوئے دن اور سسکیوں بھری راتوں سے اٹھ کر وہ مسوری پہنچ گیا تھا ——— وہاں حسن تھا، رنگینی تھی، آزادی تھی اور ہر طرف پھیلا ہوا یہ خوشگوار احساس تھا کہ وہ نواب زادہ ہے اور حسین ترین بچہ۔ اس کی نازیبا حرکات کو بھی ان خوبیوں کے باعث سراہا جاتا کیونکہ وہ ذہین بھی بےحد تھا اور فرسٹ آیا کرتا تھا

اور آج جو چہرہ اس آئینہ میں ہے یہ سب حقائق اس کے ذمہ دار ہیں۔

جب وہ چھٹیوں میں گھر واپس آتا تو اسے قطعی خوشی نہ ہوتی۔ ابو حسب معمول دوستوں میں، شکار، تفریح میں اور انگریز دوستوں اور ان کی بیگمات کے ساتھ وقت گذارتے۔ امی سے بول چال قطعی بند ہو چکی تھی ——— بہت سی دوسری وجوہ کے ساتھ سب سے بڑی وجہ مخالفت ابو کے انگریز دوست تھے امی کے خیال میں انگریز پلید تھے۔ وہ عام طور پر دوسرے بنگلے میں رہتے۔ اس کی ملاقات ابو سے صرف چند لمحوں کی ہوتی۔ وہ مختصر سوالات کرتے، لہجہ ڈکٹیٹروں والا ہوتا۔ اس میں دور دور شفقت کا نام و نشان نہ ہوتا ——— وہ سہما ہوا سلام کر کے واپس آجاتا۔ دوسری ملاقات مسوری واپسی پر ہوتی ——— نفرت، جھنجلاہٹ اور ناخوشگواری کے پھیلے ہوئے کثیف بادلوں کے درمیان وہ زینہ بزینہ چڑھ رہا تھا۔ ابو سے چند لمحوں کا انٹرویو اس کی عجیب و غریب تشنگی کو اور بڑھا دیتا۔ وہ دھڑا دھڑ پانی پیتا ہوا ٹرین میں سوار ہو جاتا۔ البتہ امی کے پیار کا ایک بوسہ جیسے اس کی شخصیت کے تناؤ کو ایک دم کم کر دیا کرتا تھا۔

پھر بیس سالوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی سوائے اس کے کہ وہ علی گڑھ پڑھنے چلا گیا اور ایک طوفانی سیاہ رات جبکہ پائیں باغ کی دوسری طرف کتے زور زور سے رو رہے تھے دادی فوت ہو گئیں۔ گھر میں شاندار قسم کا ماتم ہوا۔ امی بین کرنے میں سب سے آگے تھیں اور اسے حیرت تھی کہ کیا دادی بھی ایسی مخلوق تھیں جن کے لئے رویا جائے مگر وہ رو رہی تھیں۔ سنا تھا دادی نے بھی امی کی طرح جوانی سسک کر اور بڑھاپا اکڑ کر گزارا تھا اس لئے دادی کی وفات پر انسانوں کے ہجوم میں اس نے پہلی بار محمد تنویر کو دیکھا تھا۔ مدھم اور سلجھے ہوئے مزاج کا لڑکا۔ وہ بہت خوبصورت مگر بہت دبلا تھا اور اس کے چہرے پر یتیمی برستی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس کا بہت مذاق بھی اڑایا تھا۔ مگر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اسے حیرت تھی کہ آخر یہ کیسا رئیس زادہ ہے جو ذرا بھی خود سر اور مغرور نہیں ——— دادی کے مرنے کے بعد تو امی کے مزاج کی جھنجلاہٹ ایک دم کم ہو گئی تھی۔ نوکروں کی کھوپڑیاں بھی محفوظ ہو گئی تھیں اور خود اس کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی تھی۔ اب تو امی اس کے جانے سے ایک دن قبل سارا دن اس کے پاس بیٹھ پیارے پیارے باتیں کرتیں مگر ابو جوں کے توں چنگیز خاں سا رویہ لئے تھے ——— اور ایسے ہی دور میں تو وہ یورپ چلا گیا تھا۔ ابو سے الوداع کہنے نہیں آسکے کیونکہ اسی دن صوبے کا گورنران کے ساتھ شکار کھیلنے کے لئے مدعو تھا۔ البتہ انھوں نے اس کے سر پر زندگی میں پہلی بار ہاتھ پھیرا اور اس کے آنسو نکل پڑے۔ مگر امی نے تو اسے خوب ہی پیار کیا اور روئیں بھی اور اس پیار کے نشے میں اس نے سوچا۔ کاش وہ مرجائے اور پھر دیکھے اس کے والدین اس کے لئے

کیسے رہتے ہیں۔

اور آج جب وہ یہاں یورپ کی واپسی پر کھڑا ہے تو ـــــ اس نے سوچا تھا ـــــ امّی اور ابو جو کبھی آپس میں بات بھی نہ کرتے تھے اس کی شادی کے معاملے میں مشترکہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اب تو دونوں باتیں بھی کرتے ہیں اور ابو نے اپنے تحکمانہ، تفریح اور انگریز نوازی کا شغل بھی ترک کر دیا ہے۔

وہ اسی آئینہ کے سامنے اس رات بھی بڑی بے چینی سے ٹہلتا رہا تھا۔ اس نے اسی آئینہ میں خود کو دیکھا تھا، وہ جس کا گول چہرہ، سرخ سفید رنگ، بڑی بڑی نیلی آنکھیں، خوبصورت ترشے ہوئے ہونٹ، چوڑی پیشانی پر گھونگریالے بال اور ہنسنے میں گالوں پر گڑھے، ایسی خصوصیات تھیں کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھنے والی بڑی بڑی ماسٹر پیس لڑکیاں اس پر مری جاتی تھیں۔ مگر لزبی ان سب میں حسین تھی۔ ڈانس، گانے اور ذہانت کسی چیز میں بھی تو اس کا کوئی مقابل نہ تھا۔ وہ اسے دیوانہ وار چاہتی تھی۔ اس کی چاہت میں اتنی گرمی تھی کہ وہ برصغیر کی کسی عورت سے اس محبت کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس کے پیار میں تو امّی کے پیار سے بھی زیادہ نشہ تھا۔ وہ خود اس کے پیار کی بھوکی نہ تھی، اسے تو صرف پیار کرنا آتا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا امّی سے کہے کہ جو چہرہ اس کے تصورات کو منور کئے رہا وہ تو ساری دنیا کو تیاگ کر اس کا منتظر ہے اور اسے چھوڑ کر محض آپ کی پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کر لینا میری اپنی ذات، میرے آئیڈیلز اور اس لڑکی پر ظلم ہے۔ اور یہ کہ امی اس کے معیار کی لڑکی اس برصغیر میں نہیں ڈھونڈ سکتیں۔ اس کا رنگ ہی اتنا خوبصورت ہے کہ ـــــ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں یہ سب کچھ امّی سے بھی تو کہا تھا مگر امّی ایک دم بپھر گئیں "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری کوکھ سے جنم لینے کے بعد بھی تم ایسے بے حیا ہو جاؤ گے کہ اپنے معاشقے کی داستان مجھے سنا کر جلاؤ گے۔ ارے اس پلید قوم نے تو میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی ـــــ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم غیر خون کی ملاوٹ برداشت نہیں کر سکتے۔ جس کے خون میں ملاوٹ ہو اسے جائداد سے محروم ہونا پڑتا ہے۔ انگریز عورتیں نگوڑی جانے کس کس کے گناہوں کی پوٹ ہمارے مردوں کے سر منڈھ دیتی ہیں۔ میرے لال کچھ تو سوچو، ہم کوئی بلبوکے بھی نہیں مر رہے ہیں کہ ڈپٹی کلکٹری کے لالچ میں فرنگی عورت کو گھر ڈال لیں۔" امی کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ کر امی کی طرف مڑا۔ امی کی آنکھوں میں آنسو تھے ـــــ تب اس نے بڑی نرمی سے امی سے سوال کیا تھا۔ "امی اس لڑکی میں جسے آپ نے میرے لئے پسند کیا، کون سی خاص خوبی ہے۔ ـ کہ آپ ـــــ"

"ارے خوبی ارے، اس کا حسب نسب ہی سب سے بڑی خوبی ہے مگر اس کے ساتھ وہ کم عمر بھی ہے، گو چھوٹی بھی اور بڑی نازک اور پیاری بھی ـــــ تم چاہو تو اسے دیکھ سکتے ہو ـــــ"

اس نے تصور کیا کہ ایک شرمائی، لجائی امیچیور سیکس کانشس لڑکی جسے کسی مرد سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی دل کا دورہ پڑ جائے، جسے سوسائٹی موو کرنے کا اور ڈانس کا سلیقہ بھی نہ ہو وہ اس جیسے حسین سوسائٹی گلیمر لڑکے کے ساتھ کیا چاند میں گہن نہ معلوم ہو گی ـــــ اسے پکا یقین تھا کہ وہ لڑکی خوبصورت تو در کنار مناسب بھی نہ ہو گی۔ اس نے بڑی سخت جھنجلاہٹ محسوس کی۔ بڑا زبردست احتجاج کیا مگر جب امی نے آنسوؤں کی برسات کے درمیان اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تو وہ ایک دم پگھل گیا۔ وہ کئی دنوں تک اپنی ہاری ہوئی ہمت کو سمیٹتا رہا ـــــ ایک لمحہ کو اسے یہ بھی خیال آیا کہ امی عمر کی بیکاری کے اس دور میں شاید دادی کا روپ دھارنا چاہتی ہیں اور ایک انگریز عورت یہ موقعہ مہیا نہیں کر سکتی تو اسے عورت کے وجود سے ہی نفرت ہو گئی ـــــ خود غرض مخلوق ـــــ مگر مجھے کیا آنے والی بھگتے گی۔ اس گھر کی اگر یہی روایت ہے کہ بیوی کو لا کر گھر میں سڑنے کے لئے ڈال دو اور خود عیش کرو تو یہی ہو گا ـــــ مگر میں تو آزادی نسواں کا حامی ہوں ـــــ پھر اسے ابو سے بھی نفرت محسوس ہوئی ـــــ تب اسے بڑی شدت سے

پیاس لگی۔ وہ تمام رات دھڑا دھڑ پانی پیتا رہا ـــــ اور نتیجتہً صبح زکام اور سر کے درد کی وجہ سے ناشتہ پر بھی نہ جا سکا گر پیاس کی شدت تو جب ہی کم ہوئی جب امی نے آکر اس کا سر دبایا اور پیار کر کے اسے ناشتہ کرایا ـــــ اور جب امی یہ کہہ رہی تھیں "اسی لئے تو میں کہتی ہوں جلدی سے بہو لے آؤں تاکہ تمہیں آرام ملے۔ تو اس نے امی کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو کر اتنا بڑا فیصلہ دے دیا ـــــ امی کے ہاتھ اس نے اپنی آنکھوں سے لگائے اور آنسوؤں کے درمیان امی کی پسند سے شادی کی حامی بھر لی۔

آخر میں امی کے سامنے بے بس کیوں ہو جاتا تھا؟

وہ دن بے حد عجیب و غریب کشمکش میں گذرے تھے ـــــ اسے یقین تھا کہ یہ شادی جو وہ کر رہا ہے قطعی ناکام ہوگی۔ پھر اس نے جھنجلاہٹ میں طے کیا کہ وہ اس لڑکی سے بات بھی نہ کرے گا۔ اسے چھوئے گا بھی نہیں۔ پھر آئندہ کوئی وارث نہ پیدا ہوگا نہ اسے خالص خون کی روایت کی بھینٹ چڑھنا پڑے گا

شادی سے ایک ماہ قبل جب وہ اپنے آرٹسٹ ہسپانوی دوست کے ساتھ اکتوبر کی چاندنی رات میں تاج محل کے گنبد پر نظر جمائے کھڑا تھا اور اسے لڑکی یاد آ رہی تھی تو اس ہسپانوی نے اسے یہ کہہ کر کیسا بور کیا تھا ـــــ "ڈیر نمبرا ـــــ میں سوچتا ہوں تمہاری ہونے والی بیوی جو یقینی طور پر کوئی پرنسس ہوگی کتنی حسین ہوگی ـــــ مجھے شہزادیوں کے اس حسین دیس کی لڑکیاں سحر خیز خوابوں کی مخلوق معلوم ہوتی ہے ـــــ یہاں کی سیاہ آنکھوں والی ہر لڑکی مجھے شہزادی لگتی ہے۔ پر اسرار اور سحر خیز مشرق کی یہ بیٹیاں ـــــ"

وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا ـــــ اُف۔ گدلے مٹیالے رنگ کی یہ جانوروں جیسی بے زبان اور سرد لڑکیاں اس گدھے کو شہزادیاں نظر آتی ہیں ـــــ اس نے چڑ کر سوچا تھا۔

"تم آرٹسٹ ہو نا اس لئے ہر بات میں خواہ مخواہ رومانس گھسا دیتے ہو، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اوہ ـ نو مائی ڈیر ـ!" پھر وہ رومانس، آرٹ، کلچر اور مشرق پر بحث کر کے اسے بور کرتا رہا ـــــ

بچھوا ہوا جسم کو سرد کئے دے رہی تھی، آتش دان میں کوئلے ہنس رہے تھے۔ گھر میں اتنی رونق اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی اور اسی کمرے میں امی کرسی میں بیزار سا بیٹھا تھا ـــــ اس نے پلٹ کر چاروں طرف دیکھا ـــــ اس مسہری کے سرہانے کمخواب کی مسند سے ٹیک لگائے۔ سرخ زری کے لباس میں چھپی وہ بیٹھی ہوئی تھی ـــــ مہندی اور زیوروں سے سجے ہوئے ہاتھ گھونگھٹ سے باہر تھے ـــــ تمام کمرہ پھولوں اور عطر کی سحر انگیز خوشبو سے بسا ہوا تھا ـــــ اس خوشبو سے اس کا ذہن سویا جا رہا تھا اور احساس جاگ رہا تھا ـــــ اس نے اپنی دولھن کے سجے ہوئے ہاتھوں کو قطعی گنوار پن قرار دیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا اس سحر اور اس تاثر سے بچنے کے لئے اس نے سوچا کہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا جائے مگر امی کا خیال آتے ہی ولولہ سرد پڑ گیا۔ ابھی تو وہ اسے پیار کر کے یہاں چھوڑ کر گئی تھیں۔ اُفوہ ـــــ امی نے اپنی شخصیت کا سحر اس لڑکی میں بھی منتقل کر دیا ہے کیا ـــــ پھر جانے کیا ہوا؟ ـــــ اس نے صبح کو دیکھا وہ لڑکی اس کے بازوؤں پر سوئی ہوئی تھی اور اس کی محراب دار پیشانی پر فتح کا غرور تھا ـــــ سوئی ہوئی وہ لڑکی اسے غیر معمولی طور پر اچھی لگی ـــــ مگر اس نے اس خیال کو دبا دیا ـــــ تب بہت سوچ سوچ کر اسے یاد آیا کہ اس نے تو صرف امی کی پسند اور ذوق کا اندازہ لگانے کے لئے بس گھونگھٹ اٹھایا تھا اور ـــــ یہ سب کچھ کیوں ہوا ـــــ یہ میری توہین ہے کہ میں اس لڑکی سے مات کھا گیا ـــــ میں شکست تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کو کچھ اس طرح پشیمانی کا احساس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی بہت شریف انسان پہلی بار طوائف کے گھر رات گذار کر آیا ہو ـــــ اس نے چن چن کر اس لڑکی میں بد صورتی تلاش کی اور طے کر لیا کہ یہ لڑکی جو فتح کے نشے میں مست سو رہی ہے، میں اسے اپنے قدموں پر جھکا دوں گا ـــــ میں اسے رونے پر مجبور کروں گا ـــــ ہونہہ! اس ملک میں بیوی کی اوقات بھی کیا ہے ـــــ وہ پلنگ سے اُٹھ کر آئینے کے سامنے آیا اور اپنے حسن کو دیکھ کر اسے لڑکی یاد آئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو

بھرآئے ـــــ یہ اس کی شادی کی پہلی رات تھی جو ایسے ذہنی دھچکوں کے ساتھ گذری۔

پھر ذہنی جھٹکوں کے اس بھنور میں اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی خاندان بھر میں بے حد مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ ابو جو اس سے کبھی بات نہ کرتے تھے بہو سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ نوکر اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے حالانکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی کھیلتی اور اس نے کبھی کسی کو نہیں ڈانٹا امی کے ساتھ تو اس کا خاص گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکتیں ـــــ اور یوں اس کا یہ خیال بھی غلط نکلا کہ امی دادی کا روپ دھارنا چاہتی ہیں ـــــ لوگ کہتے تھے کہ وہ بہت شوہر پرست ہے مگر اس نے تو اپنے میں بیوی سے متعلق کوئی گرمجوشی نہ پائی ـــــ وہ کبھی اچھی نہ لگی ـــــ اس نے دل میں تو جھنجلاہٹ کی آگ لگی تھی اور ماں اور بیوی دونوں عورتوں کے درمیان وہ کچلا جا رہا تھا ـــــ وہ احساس برتری اور احساس شکست کی چکی میں پستے ہوئے نجات کی راہیں تلاش کر رہا تھا۔

ہا ہا! ـــــ نجات! ـــــ اس نے آئینے میں دیکھا ـــــ نجات کے لئے REDEMPTION ضروری ہے صبا نے کہا تھا ـــــ

موسم بدل رہا تھا اور باہر جاگن کی ہوا کے دوش پر نامعلوم سی اداسی تھی ـــــ اس شام اس جگہ۔ اسی آئینہ کے سامنے وہ نارنجی ساری باندھے، نارنجی لپ سٹک لگائے، اپنے سیاہ بالوں کا جوڑا کرنے میں مشغول تھی تو وہ دیکھ کر مرعوب سا ہو گیا مگر پھر اس نے لاپروائی سے کندھے جھٹک کر کہا "نارنجی لپ سٹک تو بہت سفید رنگوں پر بھی ہے"

اس نے انگڑائی لے کر حیرت سے پوچھا ـــــ "سچ؟" پھر وہ مسکرا دی اور وہ اس کے جلووں کی تاب نہ لا کر جھنجلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

آخر یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا ہے۔ اس نے غصے میں خوب تیز کار چلاتے ہوئے سوچا۔

مشاعرے کی اس شام اسے بہت خوشی ہوئی تھی ـــــ وہ دونوں اگلی مخصوص نشستوں پر بیٹھنے کے لئے اپنی سیٹ کا نمبر دیکھ رہے تھے تو پیچھے سے کسی نے کہا تھا ـــــ "ہیلو راج کماری صبا ـــــ"

وہ مسکرا کر گھومی ـــــ "ہیلو ـــــ اوہ ـــــ موہن بھیا ـــــ اور تم کانتا ـــــ!"

"جی ہاں اور آپ اس گیہوئی ساڑی میں چمپے کی کلی بن کر کیا ظلم ڈھا رہی ہیں؟"

وہ جھینپ کر اپنے شوہر کی طرف مڑی ـــــ میری عزیز ترین دوست کانتا ـــــ اور ان کے بھائی موہن ـــــ اور یہ ـــــ" وہ کانتا کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی ـــــ اس نے قطعی خوش اخلاقی نہ دکھائی۔ اس کی سرد مہری پر صبا کا چہرہ اتر گیا اور وہ دونوں شرمندہ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

بہرحال ایک ہندو کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کی بیوی کا نام اس بے تکلفی سے لے ـــــ اس نے اپنی بداخلاقی کا جواز تلاش کر لیا تھا ـــــ رات کو واپسی پر وہ اپنی بیوی پر جھلا اٹھا ـــــ "یہ کون بدتمیز تھا جس نے تمہارا نام اس طرح لیا ـــــ راجکماری اوہ ـــــ!" اس نے طنز سے ہونٹ سکوڑے ـــــ

مجھے بہت افسوس ہے اس واقعے پر ـــــ میں نے ایک بار ایک ڈرامے میں راجکماری کا پارٹ لے لیا تھا۔ جب سے میری سہیلیاں مجھے اسی نام سے پکارنے لگی تھیں ـــــ اور موہن بھیا میری پیاری سہیلی کانتا کے بھائی اور ابو کے گہرے دوست کے لڑکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ ـــــ" اس نے بہت نرمی سے سمجھا کر کہا مگر وہ اکڑ گیا۔

شٹ اپ ـــــ تو گویا آج بھی وہ آپ پر اتنا ہی حق سمجھتے ہیں جتنا شادی سے پہلے تھا؟ اور یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کی شہر بھر سے دوستی تھی۔

یوں تو آپ بڑی خاندانی اور روایت پرست ہیں"

"حق؟ حق کیسا پلیز تہذیر صاحب ـــــ؟" اس نے احتجاج اور بے بسی کی ملی جلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مگر وہ جلی کٹی سنائے گیا اور وہ ایک دم خاموش

گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ یہ ایڈوانس، ایڈوانسڈ انگلینڈ، ریٹرنڈ لوگ کیوں ہر بات اپنے لئے جائز سمجھتے ہیں اور کیا وہ لندن سے محض اعتراض اور نفرت سیکھ کر آتے ہیں ——— مگر اس نے وہاں زیادہ دیر کھڑے رہ کر اس کے رونے کا منظر نہ دیکھا ورنہ اس کا لمحہ بھر کا فتح کا احساس خاک میں مل جاتا۔

اور اس نے تو اس بات کو بہانہ بنا کر اسے کئی دن رُلایا۔ اس کے کمرے میں بھی نہ آیا اور اس سے بولا بھی نہیں۔ پھر ایک رات امی اس کے کمرے میں آئیں اور اسے صبا کے کمرے میں لے آئیں اور پیار کر کے وہیں چھوڑ گئیں ——— اور جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا ——— وہ اُس کے سامنے جھک گیا ——— دوسری صبح وہ بہت خوش تھی، بالکل بچوں کی طرح خوش ——— مگر حسن زبیر! اس کی خوشی اس کی ہنسی تمہارے لئے ہمیشہ تضحیک کا سامان ہو جاتی ——— اور وہ اس کی شکست کا سمبل ——— تب ہی تو وہ اُسے ہر دم دق کرتا اور احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لئے اس کی نام نہاد مڈل کلاس وریوں کو جتاتا ——— وہ اپنے حسن ذہانت اور لیاقت کا غیر معمولی انداز میں تذکرہ کرتا۔ اور یہ کہ کس طرح اس پر ایک جہان فدا تھا اور کس طرح اس نے اس سے شادی کر کے اس پر احسان کیا ——— مگر اس نے کبھی تردید یا تائید نہیں کی اور وہ اس کی اس خاموشی سے اور چڑ جاتا۔

اس رات بے حد اداسی پھیلی ہوئی تھی اور خزاں کی سسکیاں فضا کے دوش پر بکھری ہوئی تھیں۔ اس شام ایک لفافہ پر صبا زبیر حسن کے نام سے اس نے ایک خوشنما جوڑا ——— "صبا! ہمارا نام کتنا بے جوڑ ہے ——— جیسے ہم خود ———" پھر اس نے زبیر حسن کاٹ دیا۔

وہ ریڈیو پر جھکی ہوئی تھی ایک دم چونکی ——— "خدا کے لئے ——— یہ کیا کیا آپ نے؟ ——— یہ بدشگونی ہوتی ہے۔" اس کی سانسیں ناہموار تھیں۔

"اونہہ اس سے کچھ نہیں ہوتا ———" اس نے بیزاری سے کندھے اچکائے ——— "نان سینس ——— تمہیں معلوم ہے۔ ہماری شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی تھی!" ——— پھر وہ ہنسا "ارے یہ کیا! ——— تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں کچھ بھی نہیں مجھے سب معلوم ہے۔ آپ کو ———" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی رہی ——— اور وہ خاموشی سے اسٹک کر باہر چلا گیا ——— اس نے اسے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ اس پر کیا گزری۔

اور جب وہ خیالات کے طوفان میں غرق باغ کے ایک گوشے میں لیٹا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ ان سب الجھنوں سے بچنے کے لئے یورپ چلا جائے تو ریگزاروں میں بارش کے قطروں کی طرح اسے لزّی مل گئی ——— وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا اور اس کا دل دھڑک رہا تھا ——— اور لزّی نے اسے کتنا پیار کیا تھا۔ اس پیار کے لئے وہ ترس گیا تھا۔ اس نے لزّی کی آغوش میں سر رکھ کر اس کی داستان سُنی ——— کس شدت سے اس نے دو ماہ تک حسن زبیر کا انتظار کیا ——— پھر تھیں وژن میجر فتح سنگھ سے اس کی ملاقات ہوئی جو بڑا مضبوط اور لمبا چوڑا اسمارٹ آدمی تھا چنانچہ حسن زبیر کی یاد کا غم بھلانے کے لئے اس نے میجر سے شادی کر لی ——— جو عنقریب افریقہ جانے والا ہے پھر ڈارلنگ میں ہوں گی اور تم ——— یوں بھی تم میرے ہو اور میں تمہاری ——— میں اولڈ فیشن باتوں کو پسند نہیں کرتی اور تم بھی ایڈوانسڈ ہو ——— وہ ہنسی ——— تب اس نے مسلمان کو یاد نہ رہا کہ وہ جو بیوی کا نام پکارے جانے پر اس لئے معترض تھا کہ پکارنے والا ہندو ہے، ایک غیر مذہب کی بیوی سے تعلقات استوار کرنے کا عہد و پیمان کر رہا ہے ——— بہرحال لزّی کے پیار کی فراخدلانہ پیش کش کو ٹھکرانا جہالت ہے اور بدتہذیبی بھی ——— وہ پیاسا تھا اور یہاں میٹھے ابل رہے تھے اور یہ بہت اچھا تھا کہ دوسرے دن صبا اپنے ابو کے ہمراہ میکے چلی گئی تھی ورنہ اس کی موجودگی اس کے لئے شدید ذہنی اذیت کا باعث ہوتی۔ اس کی غیر موجودگی میں ہی تو اس نے طے کیا تھا کہ صبا کی واپسی سے قبل ہی وہ یورپ چل دے گا لزّی کو لے کر مگر ساری تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی صبا واپس آگئی ——— امی کو پتہ چل گیا اور لزّی نے جنگ کے ان خوفناک بادلوں کے درمیان سفر کرنے سے انکار کر دیا ——— یورپ میں سرد جنگ جاری تھی اور کسی لمحہ یہ جنگ بھڑک کر خوفناک اور ہولناک ہو سکتی تھی مگر وہ پھر بھی جانے پر بضد رہا تو امی نے فیصلہ دے دیا کہ صبا کو

لے کر جانا ہو تو جا سکتے ہو۔

"امی آپ سوچیں تو اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاتے مجھے شرم نہ آئے گی؟ اس میں ہے ہی کیا؟"

چنانچہ امی پہلے تو برس پڑیں، پھر پیار کر کے اس سے منوا لیا کہ وہ صبا کو لے کر یورپ گھوم آئے ——— اور تو اور اس دن ابو نے بھی بہو کی حمایت میں اسے ڈانٹا اور تب رات بھر کی جھنجلاہٹ کے بعد اپنے کمرے میں اس نے وہ خوفناک فیصلہ کیا تھا۔

اس نے اپنا چہرہ پھر آئینے میں دیکھا، بیمار اور زرد ——— اے مسافر! اس رات کا فیصلہ اس سزا کا ذمہ دار ہے۔ یا لڑکی کی گرم آغوش اور پیار کی بارش ——— مگر لڑکی تو اس وقت شملہ میں کسی دوست کے پاس تھی اور اس کا شوہر قاہرہ جا چکا تھا اور وہ اب بھی حسن زبیر کی لڑکی تھی۔

سوئٹزرلینڈ میں جب اس کے دوست ملتے تو اس کی بیوی کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ——— تمہاری بیوی ریزرو ہونے کے باوجود شاندار ہے ——— ایک اطالوی کے خیال میں وہ مشرق کی طرح پراسرار اور حسین ہے ——— اس کے ایک جرمن دوست کی فرانسیسی بیوی نے تو حد ہی کر دی تھی یہ کہہ کر کہ ——— تم چاہے کتنے ہی حسین ہو تمہاری بیوی میں تم سے زیادہ حسن ہے۔ اس کے لئے دیئے رہنے کے اسٹائل میں شہزادیوں کا سا وقار ہے ——— اس کے لباس اور زیورات کے ذوق کی تعریفیں ہوتیں ——— تب وہ اور الجھ جاتا ——— بھئی حسن زبیر تمہاری خواہش بھی تو یہی تھی کہ تمہاری بیوی بہت سوشل ہو اور ہر محفل میں سراہی جائے پھر اب تم کیوں جلے جا رہے ہو؟ ——— مگر نہیں حسن زبیر بے غیرت نہیں ——— نہیں نہیں وہ بدصورت ہے اور اسے عام محفلوں میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ صبا قطعی بدصورت ہے اور یہ سب مجھے مل کر بدھو بنا رہے ہیں ——— مگر نہیں ان مردوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میری بیوی کی تعریف کریں ——— وہ اپنے حسد کا جواز تلاش کرتا۔

حسن زبیر! آخر یہ تمہاری شخصیت کا دوغلا پن تمہیں تباہ کر گیا ——— اس نے مغربی دریچے سے پائیں باغ میں جھانکتے ہوئے سوچا
وہ مشرقی تھا اور مغربی ہونا چاہتا تھا مگر ہو نہیں سکتا تھا ——— تب ہی تو وہ اکثر اوقات اسے ہوٹل میں تنہا چھوڑ کر باہر گھومتا رہتا ——— وہ لڑکی پھر بھی نہ روتی نہ اس کی خوشامد کرتی نہ لڑتی جھگڑتی نہ گڑگڑاتی ——— اور یوں اس کا احساسِ کمتری بیوی کو جلانے کی نت نئی ترکیبیں سوچتا اور اس کی پیاس بڑھ جاتی ——— اس کے لئے ہر حالت غیر موزوں تھی اور وہ ہر حالت کے لئے غیر موزوں ——— آخر اس کی منزل کہاں ہے؟ ——— میں کیا چاہتا ہوں؟ ——— اس نے اپنی جھنجلاہٹ سے تنگ آکر سوچا ——— یہ صبا ہی میری ساری پریشانیوں کا باعث ہے ——— ایک رات اس نے طے کیا ——— جب صبا اس کے بازوؤں پر سوئی ہوئی تھی اور صبا کے سحر کا وہ لمحہ گذر چکا تھا جب وہ بھول جایا کرتا تھا کہ صبا ایک بدصورت اور اس کے معیار سے گری ہوئی لڑکی ہے ——— اور اب اس کا ذہن جاگ رہا تھا ———

تب اس رات جب باہر بے تحاشا برف گر رہی تھی اور فضا بڑی سوگوار تھی، اس نے طے کیا کہ وہ صبا کو واپس بھیج دے گا ——— اور اس نے اس کے لئے جہاز میں سیٹ ریزرو کروا دی ——— اور اسے اطمینان سے کہہ دیا کہ تم واپس جاؤ میں بھی چلا آؤں گا ——— مگر ——— اس کے بعد اس نے اسے مزید جلانے اور اپنی مردانگی کا ثبوت دینے کے لئے دوسرے ہی دن طلاق نامہ بھیج دیا۔

حسن زبیر! اس لمحے جب جہاز اڑنے والا تھا اور اس نے تم سے رخصت ہوتے ہوئے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے تمہیں دیکھا تھا تو تمہارے جانے کس جذبے کو بڑی تسکین ہوئی تھی ——— تم نے محسوس کیا تھا کہ تم نے آج اسے شکست دے دی ——— مگر جانے کیوں طلاق نامہ بھیج کر تمہارا دل چاہا تھا کہ خودکشی کر لو ——— آخر ایسا کیوں تھا؟ ——— اس لڑکی سے اسے محبت نہیں تھی۔ اس لڑکی نے اسے کبھی ویسا پیار نہیں دیا جس کا وہ متمنی تھا ——— پھر کیوں؟ ——— شاید امی کا خیال ہو کہ ان پر کیا گذری ہو گی ——— اف امی ——— وہ ٹہلتا ہوا کوریڈار میں آ گیا۔ داہنی طرف امی کا کمرہ تھا ——— مگر وہ امی کے کمرے میں نہیں گیا۔ اس کے گھٹنوں کے درد میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

پھر لوگوں کے اس سوال سے تنگ آ کر کہ تمہاری بیوی کیوں چلی گئی اور اتنی سویٹ لڑکی کے بغیر تم کیسے یہاں رہ سکو گے، وہ دوسرے ہی ہفتے امریکہ چلا گیا ـــــ یہ نئی سرزمین اس کی من پسند سامان لئے اس کی منتظر تھی۔ وہاں ایک نہیں کئی لذتیاں محبت کے جام لئے اسے سیراب کرنے کو کھڑی تھیں ـــــ مگر اسے تو کوئی بیماری ہو گئی تھی ان دنوں پیاس کی، بلکہ وہاں جا کر یہ بیماری بڑھ گئی تھی ـــــ حالانکہ اس کا خیال تھا کہ اس تشنگی کی ذمہ دار صبا ہے۔ مگر صبا نے جا کر تو پیاس کے ساتھ ایک خلا بھی بخشی ـــــ اسے یقین تھا صبا میں کوئی ایسی بات ہی نہ تھی کہ انسان یاد رکھے۔ وہ کم عمر سی لڑکی ـــــ اس کا تو دل چاہتا تھا اس کی بیوی امی جیسی عمر کی ہو ـــــ مگر پھر بھی جانے کیوں ـــــ جب ہر رات کوئی نئی لڑکی اس کی آغوش میں ہوتی تو اس کی قربت کے بعد اسے عجیب بیزاری، پچھتاوے اور کمی کا احساس ہوتا ـــــ کچھ ایسی بات اس نے صبا میں پائی تھی جو اسے اور کہیں نہ ملی ـــــ تب وہ اس احساس کو، اس کمی کو مٹانے کے لئے وہسکی کے جام چڑھاتا اور بےخود ہو کر سو جاتا۔

پھر اس کے امّی ابّو باری باری چل بسے۔ امی نے اسے مرتے دم تک معاف نہ کیا بلکہ غصے میں ساری جائداد یتیم خانے کو دے دی۔ اسے امی کی موت نے بہت عاجز کیا تھا۔ اس رات اس نے اس غم کو بھلانے کے لئے پہلی بار خواب آور گولیاں کھائی تھیں اور غالباً اس کے بعد ہی اسے تنفس کی ہلکی شکایت شروع ہو گئی تھی، جو بتدریج بڑھتی گئی ـــــ تب وہ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا ـــــ اُف میں بوڑھا ہو رہا ہوں ـــــ وہ لرز جاتا ـــــ سوسائٹی میں اس کی اہمیت کم ہو رہی تھی اور پھر اس احساس سے اس کا دل بیٹھ جاتا۔

خزاں کی ایسی ہی ایک شام ـــــ اسی احساس میں ڈوبے ہوئے اس نے واشنگٹن کی لڑکیوں سے ایک پاکستانی کی بڑی تعریف سنی تھی اور یہ محض اتفاق تھا کہ اسی رات کلب میں اس سے ملاقات بھی ہو گئی ـــــ وہ یہاں انجنیئرنگ کی تعلیم کے لئے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا ـــــ شاید عنقریب ـــــ وہ سوکھا سا تنویر جعفری تھا جو ایک بڑا اسمارٹ اور حسین نکل آیا تھا مگر اس کی آنکھوں میں غم کی بدلیوں کا عکس اب بھی تھا ـــــ اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ـــــ ہاہا ـــــ جس لڑکی پر تنویر جی جان ہار چکا تھا وہ اسے بغیر کسی جد و جہد کے مل گئی اور پھر اس نے اسے ٹھکرا دیا ـــــ کیونکہ وہ لڑکی اس کے معیار کی نہ تھی ـــــ یعنی اس نے تنویر کے آئیڈیل کو ٹھکرا دیا ـــــ اسی خوشی کے جلوس میں وہ جا کر تنویر کی میز پر بیٹھ گیا تھا ـــــ تنویر کو وہ لڑکی اسی لئے نہ ملی کہ وہ مجھ سے کم تر ہے۔ اس کی ماں ایک کنیز تھی جس کے لئے اس کے باپ نے ساری دنیا پر لات مار دی تھی ـــــ اس نے تنویر کو مخاطب کیا ـــــ تنویر نے ناخوشگواری سے اس کے سلام کا جواب دیا اور مزید بات چیت کا امکان ختم کرنے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر کر فلور پر تھرکتے ہوئے جوڑوں کو دیکھنے لگا۔

ـــــ اسے ڈر ہو گا کہ مجھ سے باتیں کرنے میں کہیں دل کے زخم نہ کھل جائیں اس لئے میں ضرور اس سے باتیں کروں گا۔

”تنویر صاحب بھئی آپ ناراض کیوں ہیں؟ کچھ حال چال سنائیے؟ آپ کی تمنا زبیر کہاں ہیں؟ کیا شغل ہے ان کا؟“

”مسٹر زبیر میں باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں ـــــ اور یہ کہ مجھے بڑی خوشی ہے کہ صبا ابھی تک صبا زبیر ہے۔“

”تو پھر صبا تنویر کہہ دوں، کیا خیال ہے؟ VACANCY تو ہے FILL کر دو۔“

”زبیر صاحب ہوش میں آیئے ـــــ اگر ہضم نہ کر سکیں تو اتنی شراب چڑھانا ضروری نہیں ـــــ کیونکہ اس سے کوئی اسٹرلنگ کی قیمت نہیں بڑھے گی جناب محترم جس لڑکی کو آپ نے اجاڑا اس کا جواب جس دن مل گیا مجھے اطلاع ضرور دیجئے گا۔“

جو منہ ماری پھرتی ہیں، روز ایک، آتی ہے اس سے بہتر ـــــ میں تمہیں دکھاؤں گا۔ اگر وہ کسی کام کی ہوتی تو بس نہ گئی ہوتی ـــــ مگر میں پوچھتا ہوں حضور والا کو اتنا دکھ کیوں ہے ـــــ کیا کوئی خاص ـــــ“ اسے تنویر کو جلانے کا مزہ آ رہا تھا۔

”شٹ اپ ـــــ قسم خدا کی اگر صبا کے ہاتھوں کی خوشبو تمہارے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو میں تمہارے جبڑے توڑ دیتا۔“ اس نے میز پر مکا مارتے ہوئے

کہا ـــ "ہو ہی کہیں کے ـــ تم کہتے ہو مجھے کیا دکھ؟ ـــ میں خدا سے دعا کروں گا کہ اس مقدس لمحے میں جب وہ مجھ سے خوش ہو میری یہ دعا ضرور سُن لے کہ وہ میرا سارا دکھ تمہیں دیدے ـــ اور تمہارا ظرف ایسا نہیں کہ تم میری طرح دکھ کو سہار جاؤ ـــ"

"ہاہا ـــ اونچا ظرف آپ کا؟ ـــ" اس نے مضحکہ اُڑانے کے انداز میں تنویر کو نظروں ہی نظروں میں جتلایا کہ وہ ایک کنیز کے پیٹ سے ہے، مگر تنویر کو تو ایک بے حد حسین نوعمر لڑکی پکڑ کر فلور کی طرف لے گئی تھی اور وہ اب خوفزدہ سا خالی کرسی کو گھورے جا رہا تھا۔

سوسائٹی گلیمر مسٹر زبیر حسن! اس رات تم پہلی بار روئے تھے اور خوفزدہ تھے اور آئینہ تمہارا منہ چڑا رہا تھا۔ اور اس کے بعد ہی تو تمہارے جوڑوں میں ہلکا ہلکا درد بھی شروع ہو گیا تھا۔

اس برفانی رات کو ـــ امریکہ کے اس تفریحی مقام کے ریسٹ ہاؤس میں اس نے بڑی بے بسی محسوس کی ـــ وہ امریکن عورت جس کا وہ باقاعدہ خرچ اٹھا رہا تھا اور جو یہاں محض اس کی تفریح کے لئے آئی تھی اس سے یہ کہہ کر ـــ کہ چونکہ تمہارے گھٹنوں میں درد ہے اس لئے تم آرام کرو ـــ یعنی تنہائی کا غم کھاؤ ـــ خود ایک جرمن کے ساتھ چلی گئی تھی اور اسے معلوم تھا کہ صبح جب وہ واپس آئے گی تو اس کے چہرے پہ ندامت کا کوئی احساس نہ ہوگا اور اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ فوراً چیک کٹوالے گی۔

تب اسے سوات کے ریسٹ ہاؤس کی وہ رات یاد آئی جب اسے زکام اور معمولی بخار تھا اور صبا تمام رات اس کے لئے اس منجمد موسم میں جاگتی رہی تھی ـــ اس نے اس کا سر بھی دبایا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب وہ امی کے حکم سے ہنی مون منانے بھیجے گئے تھے ـــ مگر مجھے تو عورت کی اس حرکت سے چڑ تھی کہ عورت مرد کے قدموں میں گری رہے۔ اس نے امی کی وفاداریوں سے چڑ کر سوچا تھا کہ آخر اس برصغیر کی عورت میں عزتِ نفس کیوں نہیں ـــ تب وہ یہ سوچ کر لرز گیا کہ میرے وطن کی عورتیں آزادیٔ نسواں کے جھنڈے گاڑ کر اگر لڑکی یا اس امریکن عورت جیسی ہوجائیں تو کیا ہوگا ـــ میں تو اسی پیاس کا مارا اس سرزمین کو جنت سمجھ کر آیا تھا مگر اس بہتے اُبلتے چشموں سے بھی تو میری پیاس نہ بجھ سکی ـــ وقت کتنا بے رحم ہے ـــ میں آج کیوں بدل گیا ہوں ـــ وہ اتنی ساری عورتیں جو مجھے سوسائٹی گلیمر کہا کرتی تھیں اور اس کے بدلے میری جیب خالی کرالیتی تھیں، وہ سب کہاں ہیں؟ وہ میری اداسیاں کیوں دور نہیں کرتیں؟ ـــ یہ کون بتائے کہ کس نے کس کے ساتھ کھیلا کیا اور اس اٹھنگے میں میں آگیا۔

اس رات اس نے اپنی ڈائری میں دیکھا تو اسے پتہ چلا کہ اسے وطن چھوڑے چھبیس سال ہوچکے ہیں اور نئے اسلامی وطن کو وجود میں آئے ۱۸ سال۔ وطن کا خیال اسے اس لئے آیا کہ اس رات نیویارک میں بڑی سرگرمی تھی اور سنا تھا پاک بھارت میں جنگ چھڑی ہوئی ہے ـــ اسے زندگی میں پہلی بار وطن کی یاد آئی اور اسے اس احساس پر حیرت ہوئی ـــ اسی سال کے آخر میں اس نے وہ زمین چھوڑ دی جسے وہ جنت سمجھ کر آیا تھا اور وہ جنت ثابت ہوئی بھی تھی لیکن بڑھاپے میں وہ ایک عقوبت بن گئی تھی جہاں بوڑھے تنہائی کا بھار اٹھائے ماضی کے جزیروں میں سرگرداں رہتے ہیں اور اس سرزمین پر جس کے لئے اس نے اپنا حسن، جوانی اور دولت لٹائی تھی اسے آج کوئی الوداع کہنے والا نہ تھا۔

اور اس کے اپنے وطن میں اسے کوئی لینے نہ آیا۔ وہ اس سے پہلے آیا تھا تو اسی ایرپورٹ پر اسے نوکروں کی فوج کے ہمراہ امی لینے آئی تھیں ـــ ان امی اس کے اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک گناہگار ہے اور اپنی عقوبت کا بوجھ اٹھائے گھوم رہا ہے ـــ اسے ملٹن یاد آیا ـــ جنتِ گمشدہ میں اس نے شیطان سے میرے ہی بارے میں کہلوایا تھا کہ دوزخ تو اپنے ذہن میں ہوتی ہے اور جہنم کے شعلے انسان کے اندر سے اُٹھتے ہیں ـــ پھر صبا بھی یاد آئی جس نے اپنی مذہب پرستی کے حق میں کہا تھا کہ نجات بغیر REDEMPTION کے ممکن نہیں ـــ مگر میں تو SCEPTIC ہوں مجھے یہ سب بچکانہ باتیں نہیں سوچنی چاہئیں ـــ مگر جب وہ اپنی اکلوتی بچی ہوئی خاندانی کوٹھی میں پہنچا تو اس کا دل جیسے پھٹ کر اس کوٹھی کی در و دیوار کی ویرانی میں بکھر گیا۔

یہ دل تو ایک بجا ہیں بجا ہیں کرتا کھنڈر ہو گیا — میرے اندر کا SCEPTIC دغا دے گیا ورنہ — اس نے کرسی میں نیم دراز ہوتے ہوئے سوچا۔

یہاں کی ہر چیز اپنی جگہ پر ہے آنا کا بیٹا کوٹھی کی رکھوالی کر رہا ہے، مالی کا بیٹا اپنی وفاداری کی تکمیل کے لئے موجود ہے۔ نئی پود رخصت ہو چکی ہے اور تیز رفتار زندگی کے کاموں میں لگ گئی ہے — اب ایسی نسل کا ہے کو پیدا ہوگی جو ایسی وفادار ہوگی — اسی کمرے میں اس نے اپنی شادی کے خلاف احتجاج کیا اسی کمرے میں امی اسے پیار سے سمجھاتی رہیں۔ اسی کمرے میں اس نے اپنی شادی کی پہلی رات گذاری — اور اس سنگھار میز پر صبا کے سنگھار کا سامان بھی جوں کا توں رکھا ہے — جموں کا کہنا ہے کہ بڑی بہو نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ کی جائے — مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے زبیر حسن۔

اسے تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ ہنسے یا روئے — گھر کے بچے کھچے ذکر سیلوٹ مارنے کے انداز میں اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے باجماعت صبا کو یاد کر کے اس کا ماتم کیا اور منکر نکیر دل کی طرح میرے ضمیر کا احتساب کر ڈالا — کہ میں نے صبا کو کیوں طلاق دی۔

اسی رات صبا کی الماری میں کاغذات کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے اس نے ایک لفافہ میں ایک پرانے اخبار کی کٹنگ دیکھی جس میں صبا کے کالج میں ہونے والے اس ڈرامے پر تبصرہ تھا جس میں صبا ہیروئن تھی — صبا کے بارے میں ہی تو تھا — کہ — ہیروئن — کیا تھی بہار کے جھونکوں کا نازک خرام یا موسیقی کی لہروں کا نازک تاثر — مکالموں کی ادائیگی جیسے لہروں کا زیر و بم — اور اس کے ذہن نے کوئی تردید نہ کی — اسے یقین آگیا کہ واقعی صبا بہت حسین تھی۔ تب اس نے دیکھا کہ وہ اپنے پلنگ پر سو رہی ہے — اس نے انگڑائی لی اور مسکرا کر اٹھ بیٹھی — وہ پلنگ کی طرف بڑھا — میں اسے بتا دوں گا کہ میں ہار گیا ہوں — ہمیشہ سے ہارا ہوا تھا — مجھے معاف کر دو مگر — دہشت ترے کی — پلنگ تو خالی ہے — اس کے تصور میں سڈول جسم والی کم عمر اور جوان صبا بسی ہوئی تھی اور اسے یقین تھا کہ صبا کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتی — ثریا باجی اور راشد بھائی نے یہ سب کچھ بتا کر اسے اور پریشان کیا کہ — "صبا کی امی کو تم بالکل پسند نہیں تھے اور خاندان بھر کے لڑکے اس کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے مگر تمہاری امی نے آنچل پھیلا کر اس کے ابو سے بھیک مانگی تو وہ بہن کو خالی ہاتھ نہ بھیج سکے کیونکہ وہ رشتے کی بہن تھیں — اسی غم میں تو وہ ایک دم سال بھر کے اندر ختم ہو گئیں جب تم نے اسے طلاق دی — صبا سوئٹزرلینڈ سے واپس پاکستان آئی ہی نہیں — البتہ اس کے فوراً بعد اپنے ابو کے ساتھ پونا جا رہی تھی تو اسٹیشن پہ لمحہ بھر کو تمہاری امی اسے دیکھنے گئی تھیں — اور سنا اس نے تو ڈیڑھ لاکھ کی دین مہر کی پیش کش بھی شکریے کے ساتھ لوٹا دی — اور تم نے اس کی قدر نہ کی —"

وہ گم سم ثریا باجی کی شکل دیکھتا رہا اور دھڑا دھڑ پانی پیتے ہوئے سوچنے لگا کہ آخر ان سب باتوں کا کون ذمہ دار ہے۔ ایک بیوی اور چند بچے اب میں کہاں سے لاؤں۔ کاش وقت لوٹ جائے صرف ایک بار — بیماری بے چارگی اور تنہائی کے زہر سے بچنے ہی کو تو وہ اس شام مری کی برف باری دیکھنے چل پڑا — اور —

ہوٹل کے کوریڈار میں اس کی تنویر سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ آج اس نے کترا کر نکل جانا چاہا مگر وہ سامنے آگیا۔

میں آج صبا کا ذکر کر کے تنویر کے زخم نہیں کھولوں گا — اس نے تنویر پر ترس کھاتے ہوئے سوچا — مگر تنویر تو بڑی بے فکری سے ہنس رہا تھا۔

"سناؤ بھئی سوسائٹی گلیمر زبیر حسن — تمہاری امریکن بیوی اور بچے کہاں ہیں؟"

اس کے دل پر چوٹ لگی — "تمہیں غلط اطلاع ملی ہے — میں نے ایسا وبال نہیں پالا — البتہ تم اپنی بیوی کا حال سناؤ۔"

میری بیوی؟ ہاں بھئی میری بیوی، بھئی اسلام آباد میں ہے۔ وہ ان دنوں سفر کے قابل نہیں ورنہ ضرور آتی۔ صبا کی پسند کی ہوئی ہر چیز مجھے پیاری ہے اور وہ تو میری بیوی ہے۔ تمہاری دعا سے تین بچے بھی ہیں — امریکہ سے واپسی پر ہی تو میں صبا سے طویل چودہ سال بعد ملا تھا — اور اس نے بھی خالص بہنوں کی طرح میری شادی کی فکر شروع کر دی — مگر یہ تو بہت پرانی خبر ہے —"

صبا کا ذکر وہ نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے جان چھڑائی ——— "تو پھر کوئی نئی بات سناؤ"

ہاں بہت سی نئی باتیں ہیں۔ تم سن کر ضرور خوش ہو گے ——— " وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی میں بڑی بے رحمی تھی ——— "چلو تمہاری بیوی بچوں کی باتیں کریں ——— مگر کیا سناؤں کہانی تو ختم ہو گئی"

"کیسی کہانی تنویر؟ میرا مذاق نہ اڑاؤ ——— میں بہت دکھی ہوں"

"اوہ ——— تو تم بھی دکھی ہو سکتے ہو؟ ——— اور بھئی صبا سے بہتر روز آنے والی عورتوں میں ایک نے بھی تمہیں اس لائق نہ سمجھا کہ اس دور میں تمہارا ساتھ دیتی ———"

"تمہیں حق ہے۔ تم جتنا چاہو مذاق اڑاؤ" اس نے سرگوشی میں کہا ———

"نہیں میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ابھی واپس جانا ہوں اور شام سے پہلے گھر پہنچنا ہے ورنہ بیوی پریشان ہو گی ———

اس کے دل میں ٹیس اٹھی مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ اس عرصہ سے لڑکے نے ہمیشہ اسے خائف رکھا تھا۔ آج اس نے تسلیم کیا۔

تو چلو تمہاری بیوی بچوں کا حال سناؤں؟ ——— سوئٹزرلینڈ سے واپسی پر وہ پونا، یو۔پی اور بمبئی میں رہی اور سیاست میں خوب حصہ لیا ——— مسلم لیگی تھی ——— پھر پاکستان آ کر مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کام کیا ——— پھر اس کی صحت گرنے لگی اور وہ سیاست سے ریٹائر ہو کر اپنے بچے کی تربیت میں مشغول ہو گئی ——— لیاقت علی کی موت نے اسے سیاست سے بہت بددل کر دیا تھا ———"

"بچہ؟ ——— کیا صبا نے دوسری شادی کی تھی؟" زبیر چلا پڑا۔

"یار اب خود اپنا مذاق اڑا رہے ہو ——— کیا اس کی شادی ہوئی نہیں تھی؟ کیا شادیاں بار بار ہوتی ہیں؟ ——— اور کیا تم خود کو اس لائق بھی نہیں سمجھتے؟"

وہ جھینپ گیا ——— مگر ایک دم خوشی سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا ——— اس کے جوڑوں کا درد ایک دم جیسے غائب ہو گیا۔ شانے تن گئے جیسے جوانی لوٹ آئی ——— میرا بچہ! ——— مگر وہ ہے کہاں تنویر؟ جلد بتاؤ ———

"تاکہ تم صبا سے اپنا بچہ چھین لاؤ ——— ہے نا؟ ——— مگر اب اس کا امکان نہیں ——— سن رہے ہو؟ صبا چل دے گئی۔ وہ مرتے سے مر گئی پچھلے تہجد کے وقت سجدے میں ———"

اوہ ——— مگر میرا بچہ! وہ سوچ کر خوش ہوا۔ وہ تو میرا ہے اور وہ زندہ ہے، اس نے دل میں سوچا ———

"ارے بھئی سنو تو ابھی سے ڈر گئے ——— تنویر نے سگار کا کش لگا کر بات جاری رکھی۔

"ستمبر پینسٹھ کی جنگ میں اس کا بیٹا کیپٹن سلمان ——— چھمب جوڑیاں کے محاذ پر بڑی بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا"

"تم ——— تو تنویر ——— !" زبیر اتنی زور سے چیخا جیسے اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔

تنویر نے ایک لمحہ اس کا چہرہ تکتے تکتے بات ختم کی ——— "اپنی جرأت کے انعام میں اسے ہلالِ جرأت ملا تھا۔ صبا نے بیٹے کی شہادت کی خبر سنی تو وہ روئی پیٹی نہیں ——— بس چپ ہو گئی۔ صدر سے تمغہ لینے بھی چلی گئی مگر واپسی پر اس کی خاموشی بڑی مہلک ثابت ہوئی ——— اس سکوت نے سال بھر کے اندر اسے گھلا کر مار ڈالا ———

صبا بہت ظالم تھی۔ صبا کبھی نہیں روئی۔ اس کے اسی کٹھور پنے نے مجھے تباہ کیا۔ اس کی یہی خاموشی مجھے لوٹ لے گئی ——— وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ تنویر کیا کہہ رہا تھا۔

"اس کا بیٹا ہر معاملے میں ماں کی طرح تھا۔ سیاہ آنکھوں والا، ذہین، بہادر، مستقل مزاج اور سلجھا ہوا، بلند کردار اور باوقار —— اس کے دل پر ایک ایک لفظ چھری بن کر چل رہا تھا۔

میرا بچہ جسے میں نے دیکھا بھی نہیں ——

یہ کیسی سزا ہے خدا؟ —— تنویر کی دعا قبول ہو گئی۔ اس کا دکھ مجھے مل گیا۔

یہ کیسی REDEMPTION ہے؟ اس سے تو بہتر تھا کہ میں مر جاتا، مٹی میں مل چکا ہوتا یا پاگل ہو کر اس اذیت رساں احساس سے عاری ہو جاتا کہ ——

میں —— میں —— میرا بچہ اور صبا —— مگر نہیں مجھے بھٹکنا چاہئے —— اس نے سارے کمرے کا چکر لگایا —— ہر چیز اپنی جگہ پر ہے، موسم بھی وہی ہے جب میری شادی ہوئی، کمرہ بھی وہی —— شاید اسی کمرے میں میرے بچہ کا جنم ہوا ہو —— اُف شادی شدہ زندگی کے ان چھ مہینوں کی یاد جب میں خود کو بےحد مظلوم محسوس کر رہا تھا، مجھے ہمیشہ ڈسے گی —— یہ وقت کا گھپلا ہے۔ انسان بدلتا ہے —— اور وقت —— اس کے گھٹنوں سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں —— اور دل بیٹھ رہا تھا اور آنکھیں رو رہی تھیں اور پیاس نے اسے نڈھال کر رکھا تھا —— مگر —— کون ہے جو اذیت کے اس جہنم سے مجھے نکالے —— میرے حلق میں تو جہنم کا زقوم ابھی سے پھنس گیا ہے۔

اس نے نڈھال ہو کر صبا کے تکیے میں منہ چھپایا۔

باہر رات بہت اداس بھیانک اور ڈراؤنی تھی —— ہوا بین کر رہی تھی۔

اُف میں کتنا پیاسا اور مظلوم ہوں!

نکہت مرزا

مداوا

"ہم دونوں ہی دراصل نہایت اعلیٰ درجے کی بے وقوف ہیں ————" میں نے بے حد رسانیت سے سوچا اور گویا مطمئن ہو گئی پھر تیزی سے چلغوزے چھیلتے ہوئے میں نے سابقہ شگفتگی کے ساتھ اس سے باتیں شروع کر دیں۔

"یہ لڑکی۔ دیکھو تم اسے سمجھا لو اگر اس کے یہی چلن رہے تو میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔" کل رات جب میں مغرب کی اذان کے وقت سیڑھیوں پر قدم رکھ رہی تھی تو ابا اوپر لوہے کے جنگلے پر کسی ببر شیر کی طرح چنگھاڑ رہے تھے اور آج پھر ————

ایک طویل مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی اور اس کی نظریں بچا کر میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ چند لمحے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھتی رہی پھر انتہائی کرخت آواز میں پوچھا۔ "تم ہنسی تھیں نا؟"

میں نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے تو وہ تیزی سے اٹھی اور میرے قریب فرش پر بیٹھ کر میری گود میں اپنی کہنیاں ٹیک دیں ————

"بتاؤ تم کیوں ہنسی تھیں؟"

میں سنجیدہ چہرہ بنائے چلغوزے چھیل کر بکھر بکھر کھاتی رہی۔ "ہنسی تھی ———— میری مرضی ————!"

وہ جھلا اٹھی ———— "بتاؤ۔ بتاؤ نا کیوں ہنسی تھیں تم؟ ————"

"جاؤ نہیں بتاتی ————"

"نہیں بتاؤ گی؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں ————" میں اکتا کر چلائی اور اپنی گود میں رکھے ہوئے چلغوزے پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بستر کی پائنتی پر بے ترتیبی سے پڑے برقعے کو اٹھایا اور سخت بیزاری کے ساتھ اوڑھنے لگی۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھی عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر جب میں برقعہ اوڑھ چکی تو وہ تیزی سے اٹھ کر مجھ پر جھپٹی۔ ایک ہی جھٹکے میں میرا برقعہ نوچ کر کونے میں پڑی کرسی پر پھینکا۔ پھر مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر بستر پر گرا دیا اور تھوڑی سی جگہ پا کر خود بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔

باہر اندھیرا پھیلنے کو تھا۔ "اگر اس کے یہی چلن رہے تو میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔" ابا کے تیز تیز قدموں کے شور میں سے ابھرتی ہوئی آواز برابر میرا پیچھا کر رہی تھی۔

جی چاہا بے تحاشا ہنس دوں۔ ابا پیارے! اگر تم مجھے اس لڑکی کے ساتھ یوں پڑا دیکھ پاؤ تو ————؟

اس نے میرے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ پھر دیکھ لی اور انتہائی وحشت سے اپنے تیز نوکیلے دانت میرے شانے کے نرم

گوشت میں گاڑ دیئے۔ درد کی ایک لہر میرے سارے وجود پر چھا گئی اور اگر میرے پیارے ابا ـــــ میری ہڈی پسلی ایک کرنے والے ـــــ مجھے اس حالت میں دیکھ لیں تو ـــــ! میں درد کی شدت میں بھی قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکی۔

"تم مجھ پر ہنس رہی ہو ـــــ؟" مظلومیت سے اس نے پوچھا۔

"نہیں اے بے وقوف لڑکی۔ میں تو خوش ہوں اس لئے قہقہے لگا رہی ہوں۔" میں نے اپنے شانے کا زخم سہلاتے ہوئے کہا "مجھے بھی بتاؤ نا خوشی کیسے ملتی ہے؟ ـــــ مجھے بھی خوشی چاہیے ـــــ ہائے مجھے بھی تو خوشی چاہیئے نا ـــــ" بچوں کی سی معصومیت سے اپنی اندر کو دھنسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکا کر اس نے اصرار کیا۔

"میں تمہیں کیا خوشی دے سکتی ہوں بی بی؟" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ خوشی تو خود ہماری اپنی ذات کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ میں تمہیں کیا خوشی دے سکتی ہوں بھلا؟"

وہ خاموشی سے چہرہ اٹھائے مجھے دیکھتی رہی تب میری زندہ دلی لوٹ آئی اور میں نے ہنس کر کہا تم خوش ہونا چاہتی ہو نا۔ تو لوگوں کو خوب دھوکا دو۔ ان کی توقعات کو جھٹلاؤ۔ ان کی امیدوں پر پانی پھیر دو اور پھر بیٹھ کر ان کے بنتے بگڑتے چہرے یاد کرو اور قہقہے لگاؤ ـــــ"

وہ پاگلوں کی طرح میرا چہرہ تکنے لگی۔ پھر گویا کسی باہمی سمجھوتے کے تحت ہم دونوں ہی ہنس دیں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ ہم دونوں نہایت اونچے درجے کی بے وقوف تھیں اور ایک دوسرے کو مزید بے وقوف بنانے کی کوشش میں مگن ـــــ

"آج پھر تم دیر سے لوٹیں۔" بھیا خدا جانے کس لمحے میرے کمرے میں گھس آئے تھے اور چپ چاپ اپنا سگار ہونٹوں میں دبائے میری طرف سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔ "گڑیا۔ خدا کے لئے کچھ دیر سنجیدگی سے مجھ سے باتیں کرو۔"

میں نے کتاب گود میں اوندھا دی اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی ـــــ "جی۔ کہئے؟"

وہ چند لمحے دکھ سے اس ضدی اور سرکش لڑکی کو دیکھتے رہے۔ پھر انتہائی نرم آواز میں بولے۔ "گڑیا۔ تم اس لڑکی کا ساتھ چھوڑ دو۔"

میں نے غصے سے کتاب اٹھا کر فرش پر پھینک دی۔ "تو آپ کو ابا نے سکھا پڑھا کر بھیجا ہے؟"

انہوں نے میرے غصے کی قطعی پرواہ نہ کی اور اسی نرم آواز میں کہنے لگے۔ "ابا سے تو اس مسئلے پر میری کبھی گفتگو ہی نہیں ہوئی گڑیا ـــــ"

"مسئلہ! ـــــ یعنی اب میری اس سے دوستی ایک مسئلہ بن چکی ہے! خوب بھیا! خوب!"

وہ میرے لہجے کے طنز سے کچھ شرمندہ سے ہو گئے اور اٹھ کر میرے بستر پر آ بیٹھے۔ "ہاں گڑیا! اب تمہارا اس کا ساتھ سارے گھر کے لئے ایک مسئلہ بن چکا ہے۔"

میں نے درشتی سے ان کا ہاتھ جھٹکا اور پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ "بھیا آپ تو میرے اور اس کے ساتھ کی باتیں یوں کر رہے ہیں جیسے وہ کوئی بدمعاش، لچا لفنگا لڑکا ہو جس کا میرا ساتھ گھر بھر کے لئے ایک مسئلہ بن چکا ہو۔"

بھیا خاموشی سے سگار پیتے رہے۔

"آپ چاہتے کیا ہیں بھیا؟" میں نے اکتاہٹ سے پوچھا "آپ کو اس کے آنے جانے پر اعتراض کیا ہے؟ کیا آپ کو اس کے چال چلن

پر اعتراض ہے؟ کیا آپ کو ہمارے چال چلن پر اعتراض ہے؟ بولئے نا بجا، جواب دیجئے۔"

بجا بستر پر سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ "دیکھو گڑیا ایسی باتیں نہ کرو۔" پھر میری طرف سے پیٹھ موڑتے ہوئے شکستہ سی آواز میں کہنے لگے۔ تم اس سے ملنا جلنا بے شک جاری رکھو۔ کیا ہوا اگر کسی رات ابا کا ہارٹ فیل ہوگیا تو ——— تمہیں ان کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟"

میرا جی چاہا کہ چلا کر کہہ دوں کہ ہاں بجا مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں بجا۔ بس مجھے اس کی ضرورت ہے جو مجھے بے وقوف بناتی ہے اور جسے میں بے وقوف بناتی ہوں۔ مگر اس کے باوجود ہم دونوں بے انتہا خوش ہیں پھر میں نے چڑچڑے پن سے کہا۔ "مگر بجا، یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ اس کے ساتھ ملنے جلنے سے ابا کا ہارٹ کیوں فیل ہونے لگا۔ ابا کا ہارٹ تو تب فیل ہو اگر میں کسی لڑکے سے ———"

بجا نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ "فضول بکواس بند کرو گڑیا۔" پھر وہ آہستہ سے مڑے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

بیچارے میرے بجا! میں نے افسردگی سے سوچا۔ گھر بھر میں صرف یہی ایک شخص ہے جو مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور اب یہ بھی ——— اگر یہ بھی ابا کی احمقانہ باتوں پر مجھ سے بدگمان ہو جائے تو۔ اٹھ کر میں نے سلیپر پہنے۔ کتاب فرش سے اٹھا کر میز پر رکھی اور بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گئی۔ ٹیبل لیمپ جلا کر میں نے تکیئے کے نیچے سے پیڈ نکالا اور اوندھے منہ لیٹ کر خط لکھنے لگی ——— اسے جو میرا واحد سہارا تھی۔

یہ گھر کبھی بھی بھرا پرا نہ تھا۔ یہ چھوٹا سا آنگن ہمیشہ سے تنہا اور اداس تھا۔ بجا اور میں۔ میں اور بجا۔ یہی کل کائنات ہے اس مختصر سے گھروندے کی۔ اور اس ننھی منی کائنات میں اس گھرانے نے کبھی ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں گزارا۔

میں روہانسی ہو کر تکیئے سے سر اٹھا کر گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھتی ہوں۔ کہیں آسمان کا کوئی گوشہ تک نظر نہیں آتا اتنی گھٹی گھٹی محدود زندگی! اے خدا! کیا تیرا جہنم اس سے بھی بدتر ہوگا ——— اماں اوپر سے چلا چلا کر مجھے آوازیں دے رہی ہیں۔ میں اوپر اور نیچے کے سنگم میں ہوں۔ یہ کمرہ جو سیڑھیوں کے عین درمیان واقع ہے اور جس میں کبھی سامان بھرا رہتا تھا، اب میرا کمرہ ہے میرا کمرہ! میں طنز سے مسکراتی ہوں۔ اندھیرے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتی ہوں، ہلکے ہلکے اندھیرے میں یہ چھوٹا سا نیچی چھت والا کمرہ کسی ایسی کال کوٹھڑی کی یاد دلاتا ہے جیسے کالے دیو دور دیسوں سے بھگائی ہوئی شہزادیوں کے لئے بنوایا کرتے تھے ——— دور دیسوں سے بھگائی ہوئی شہزادی! ——— بے اختیاری میں میرا ایک قہقہہ کمرے کے اندھیرے میں گر پڑا۔ بسا اوقات خود اپنا ہی قہقہہ کانوں کو کیسا ناگوار گزرتا ہے۔ اماں کی آوازیں بدستور جاری ہیں۔ اکتا کر میں اٹھتی ہوں اور سلیپر گھسیٹتے ہوئے اوپر کی سیڑھیاں چڑھتی ہوں۔ دن چڑھ آیا ہے اور ابھی مجھے تیار ہو کر کالج جانا ہے۔

یہاں پہنچ کر وہ لڑکی رک جاتی ہے۔ تو کیوں نہ اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر میں اس کی بھولی بسری باتیں آپ کو سنا دوں۔ میں کہ اسے اس دنیا میں بسنے والے ہر شخص سے بہتر طریق پر جانتی ہوں کہ اس کی ہمزاد ہوں ——— یہ دبلی پتلی نازک سی گڑیا آنگن میں ادھر سے ادھر پھرا کرتی مگر کبھی ماں کا چہرہ اسے دیکھ کر گلنار نہ ہوا، نہ کبھی باپ نے جھک کر اسے گود میں اٹھایا اور نہ ہی ایک محبت کرنے والے باپ کی مانند اس کی دلچسپی کی باتیں کیں۔ وہ مذہبی مبلغ تھا اور اس کی ماں اسے بچپن ہی سے باپ کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے اسے باپ کے کارنامے خوب چٹخارے لے لے کر سنایا کرتی مگر وہ باپ کی راہ پر نہ چل سکی۔ (بجا کی الگ بات ہے جو اب ایک بینک کا مینیجر ہے) وہ ننھی سی بچی محبت چاہتی تھی، توجہ چاہتی تھی جسے حاصل کرنے کے لئے وہ سرکشی کی حد تک ضدی

بن گئی تھی) مگر یہ سب کچھ چھین کر اسے کیا دیا جا رہا تھا؟ عقاید اور ان کے سخت اصول، جہنم کا خوف اور ایک جبار و قہار خدا ———
انہی دنوں کہ وہ ابھی دس برس کی نیم پختہ ذہن کی لڑکی تھی، ایک رات چپکے سے یہ خیال اس کے ذہن میں آیا کہ ابا جو اتنی عبادت کرتے ہیں، اتنی نمازیں پڑھتے ہیں اور ہمہ وقت تسبیح ہاتھ میں لئے پھرتے ہیں۔ پھر اتنے اتنے دنوں کے لئے باہر بھی جاتے ہیں اور زمین پر سوتے ہیں۔ تو پھر بھی اللہ میاں ان سے خوش کیوں نہیں ہیں۔ اگر اللہ میاں اس کے ابا سے خوش ہوتے تو ان کے پاس بھی بڑی سی کوٹھی ہوتی اور شمو کی طرح کی لمبی سی کار اور اتنے بہت سے آدمی کام کرنے کے لئے ——— اور شمو کے ابا نے تو کبھی کلمہ بھی نہیں پڑھا ———
یہ اس کے نیم پختہ ذہن کا اپنے انتہائی مذہبی ماحول سے بغاوت کا پہلا بیج تھا۔ ایک سہ پہر کو باورچی خانے میں اماں کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے چپکے سے اماں سے یہی پوچھا۔ اماں دو ایک لمحے توے پر پڑی روٹی کو بیکار ہی الٹا پلٹا کیں۔ پھر اونچی آواز میں بولیں۔ "اس سے بڑھیا عیش تو خدا وند تعالےٰ نے جنت میں ہمارا کر رکھے ہیں بچی!" پھر کچھ سوچ کر انہوں نے ہاتھ روکا۔ "اور یاد رکھو، یہ جتنے بھی لوگ یہاں چمکتی کاروں اور بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں، یہ سب وہاں بھیک مانگتے پھریں گے۔ جہنم کے دروازے ایسے ہی لوگوں کے لئے کھلے ہیں۔"
اماں کی باتوں سے وہ اور بھی مایوس ہو گئی۔ ایسی کوٹھی کا اسے کوئی فائدہ نظر نہ آیا جسے شمو دیکھ کر جل نہ سکے۔ شمو تو جہنم میں بھیک مانگے اور وہ جنت میں بڑی سی کوٹھی میں رہے اور لمبی سی کاریں گھمائے یہ خیال اسے قطعی خوش کن نہ لگا۔ مزا تو جب آتا کہ شمو جنت ہی میں بھیک مانگتی اور اس کی کوٹھی کے پورچ میں منمناتی نظر آتی۔ ایسے ہی خیالات سے اس کے ذہن میں گرہ سی پڑ گئی۔ ابا سے تو وہ دور تھی ہی اب وہ ابا کے طرز زندگی سے بھی دور ہو گئی)؟

بہ حوالی دو چشمت، حشم بلا نشستہ
چوں قبیلہ گرد لیلیٰ ———

وہ حسب معمول فارسی کے اشعار گنگنا رہی تھی۔ میں نے اچانک ڈوبتے سورج کے احساس سے اپنے جسم میں ایک کپکپی سی محسوس کی اور لحاف کو جسے ٹانگوں پر پھیلائے، میں اس کے بستر میں لیٹی ہوئی تھی، اور گردن تک کھینچ لیا۔ وہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گئی، اور میرے کندھے کے نیچے سے اپنا بازو نکال کر مجھ پر جھک آئی۔ "کیا ہوا جانم؟" اس کے لہجے کا پیار ہمیشہ چھلک چھلک پڑتا۔
"کچھ نہیں۔ یوں ہی ذرا سردی محسوس ہوئی تھی۔"
وہ شعر ادھورا چھوڑ کر باہر چل دی۔ اس کی پشت پر بھورے بالوں کی موٹی سی چوٹی بھاری کولہوں کی گردش کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ مجھے یہ سب اس قدر مضحکہ خیز لگا کہ جی چاہا اس سے پوچھوں "کبھی تم نے چلتے ہوئے پیچھے سے اپنے آپ کو دیکھا ہے؟" مگر اپنے سوال کے احمقانہ پن پر میں خود ہی ہنس دی ——— بہ حوالی دو چشمت ——— اللہ جانے پورا شعر کیا تھا۔ اور اسے یہ کیسی عادت تھی کہ ہر بات، ہر کام ادھورا چھوڑ کر اٹھ جاتی ——— پھر وہ پلٹی تو گرم پانی کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔
"تم میری عادتیں بگاڑ دو گی۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔
"تو کیا پہلے تمہیں شک تھا، وہ پورا منہ کھول کر شرارتی ہنسی ہنسی۔
اس کے ہنسنے کے اس انداز سے مجھے کیسی نفرت تھی، مگر ابا میاں! میں تمہاری ضد میں اسے برداشت کروں گی اور کرتی رہوں گی کہ میری قوت برداشت تم سے تو خیر بڑھ کر ہے۔ باہر اندھیرا پھیلنے کو ہے اور مجھے اب چل دینا چاہیے۔ میں کچھ خوف زدہ ہو کر سوچتی ہوں۔ یہاں سے چار کوس دور میرا باپ لوہے کے جنگلے پر کسی ببر شیر کی طرح دھاڑ رہا ہوگا اور گا ہے گا ہے باورچی خانے میں جھانک کر کہتی،

زرد رو اماں پر برس پڑتا ہوگا — "تمہاری اس لڑکی نے تو میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ کہیں سے اسے زہر ہی لا دو —" لیکن زینے پر میری ایڑی کے شور سے ان کی گرج تھم جاتی ہے، وہ مجھ پر گرج برس کر دیکھ چکے ہیں۔ میں اماں کی طرح کی عورت تو ہرگز نہیں ہوں کہ ان کی دھاڑ پر خوفزدہ ہو کر رونے لگوں۔ میں نے ابا کو ترت ترت جواب دیئے تھے اور سنتی ہوں اس رات ابا نے مارے رنج کے کچھ بھی نہ کھایا تھا اور بیٹھے بیٹھے صبح کر دی تھی۔

اور اب اس کی دوست کا قصہ بھی مجھ سے سن لو۔ وہ اپنی دوست کو بالکل نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو ایک مداوا تھا۔ اس کے دل میں پیدا ہونے والے نئے نئے جذبات کے درد کا۔ تپتی دوپہر اور سرد شاموں میں جب اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتیں جب اس کے اعصاب چٹخنے لگتے تو اس کے دل میں کیسی عجیب سی خواہش پیدا ہوتی — اور اس لڑکی نے جسے وہ دوست کہتی تھی۔ اس کی اس خواہش کا راز پا لیا تھا اور اس نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ دونوں دراصل انتہائی بے وقوف تھیں کہ اپنی خواہشوں سے خوفزدہ تھیں — سو یہ محض مداوا تھا ان کے لئے، کہ جن کے سامنے صحیح راستہ نہ تھا — وہ ایسے گھروں سے تعلق رکھتی تھیں جہاں مردوں سے نفرت کا درس دیا جاتا تھا اور وہ غیر شعوری طور پر اس نفرت کو جھٹلاتے ہوئے اور شعوری طور پر اسے اپناتے ہوئے عاجز آ چکی تھیں۔ خود اپنی ذات سے فراری تھیں۔ اپنے گھر سے، اپنے ماحول سے فراری تھیں اور ایک دوسرے کی دوسرا نفس میں چاہت کا دم بھر کے وہ ایک دوسرے کو کیسے کیسے دھوکے نہیں دیتی تھیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ اور میں غلط نہیں کہہ سکتی۔ میں کہ اس کی ہمزاد ہوں)؟

گلی میں صبح کا ہنگامہ شروع ہو چکا ہے۔ میں دیر سے اسی کروٹ پڑی ہوں۔ رات سے ایک پل کو بھی آنکھ نہیں لگی۔ اوپر آنگن میں کھڑ بڑ شروع ہو چکی ہے اور ابھی تک اماں نے ایک آواز بھی نہیں دی۔ آج اماں کا ہے کو مجھے بلائے گی۔ رات — رات کا خیال آتے ہی میرے جسم میں بے چینی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ ساری رات رونے سے سوجی ہوئی لال انگارہ سی آنکھیں ایک بار گی پھر چھلک آتی ہیں۔ میں مر کیوں نہ گئی! تعجب سے میں سوچتی ہوں۔ ابا نے اتنا بڑا الزام بھلا اور اماں کی موجودگی میں مجھ پر لگایا اور میں بٹر بٹر انہیں دیکھے گئی۔ ایک لفظ بھی تو اپنی مدافعت میں نہ کہہ سکی جرم نہ کرتے ہوئے بھی مجرم قرار پائی۔ جی چاہا ابھی اٹھ کر اوپر جاؤں اور ابا کے ضعیف سے ڈھلکے ہوئے شانے جھنجھوڑ کر پوچھوں — مگر کیا پوچھوں! پوچھنے کو بچا ہی کیا ہے — میں بے بسی سے سوچتی ہوں اور آنسو پھر میرے رخساروں پر بہنے لگتے ہیں۔ بھیا چپ چاپ سیڑھیاں اتر کر میرے کمرے میں چلے آتے ہیں۔ الجھے ہوئے بال اور نیند سے بوجھل سرخ آنکھیں لئے وہ خاموشی سے میرے بستر پر بیٹھ گئے اور دایاں ہاتھ اٹھا کر میرے آنسو پونچھے۔ میں نے آنسوؤں سے بھری بوجھل آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ وہاں بھی نیند اور آرام کا ایک شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے بھیا کا ہاتھ پکڑا اور اسے آنکھوں سے لگا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

"گڑیا" بھیا نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر میرے آنسو پونچھے۔ پھر میری طرف دیکھ کر دبے لہجے میں کہا "گڑیا مجھے یقین ہے۔ ابا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم کیوں رو رو کر اپنی جان ہلکان کر رہی ہو۔ اٹھو اب منہ ہاتھ دھو لو —" انہوں نے میرا بازو کھینچ کر مجھے اٹھانا چاہا۔ "میں آج ہی پوری بات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ سب کسی محلے دار کی شرارت ہے۔" انہوں نے آہستگی سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے "لو اب تم بھی اٹھو — اٹھو ناں —" انہوں نے مجھے بھی اٹھایا اور نیچے غسل خانے بھیج دیا۔

"یہ اب کالج نہیں جائے گی" کانپتی ہوئی مگر تحکمانہ آواز میں اماں بولیں۔

میں بھا کے ساتھ ابھی ابھی ناشتہ کے لئے باورچی خانے میں آئی تھی، اس نیچی سی پیڑھی پر بیٹھتے میرا دم گھٹنے لگا۔

"وہ کس لئے؟" بھا نے غصے سے مگر دھیمی آواز میں پوچھا۔

"اس کے باوا نے کہہ دیا ہے۔ ہمت ہے تو جا کر پوچھ لو ——" اماں نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا اور انڈہ تلنے لگیں۔

میں ڈگمگاتے قدموں سے اٹھنے لگی تو بھا نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پھر سے بٹھا لیا "گڑیا کا لج جائے گی" فیصلہ کن آواز میں وہ بولے اور ناشتہ کرنے لگے۔

"تو نے ہی تو اس کا ستیا ناس کیا ہے۔ دو کوڑی کا نہ رکھا اسے ——" اماں چلا چلا کر بھا کو کوسنے لگی۔

بھا نے کچھ نہ کہا، خاموشی سے تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ چند نوالے زبردستی مجھے کھلائے اور مجھے لے کر باہر نکل گئے۔

"سو بات یہ ہے جانم کہ ابا میاں کو رات یہ شک پیدا ہوا ہے کہ میں تم سے ملنے نہیں بلکہ —— بلکہ ——" بستر پر اوندھے پڑے میں نے تکیے کے نیچے سے پیڈ نکال کر اسے خط لکھنا چاہا۔ مگر رنج اور غم نے ذہن کو ایسا بولا دیا تھا کہ کچھ بھی نہ لکھ سکی اور پیڈ پر سر اوندھا کر کے چپکے چپکے روتی رہی۔ بھا اپنے آفس جا چکے تھے۔

(پھر اس لڑکی کا باہر نکلنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اب یہ مجھ سے سنو میں جو اس کی ہمزاد ہوں کہ وہ خود یہ سب کیسے سنائے۔ وہ جسے بچپن ہی سے کچھ ایسی تعلیم دی گئی تھی کہ وہ مردوں کو نجس اور ناپاک سمجھنے لگی تھی۔ وہ جسے ماں نے ہمیشہ مردوں کے تاریک اور گھناؤنے پہلو ہی دکھائے تھے جس نے آج تک کسی مرد پر ایک بھی پوری نگاہ نہ ڈالی تھی۔ اس پر یہ الزام ہے کہ وہ ایک مرد سے ملنے جاتی ہے —— اور یہ الزام بھی اس کے باپ کی طرف سے عائد ہوا تھا۔ وہ جو اب جان چکا تھا کہ اس کی بیٹی اپنے بس میں نہیں، وہ اپنی بیٹی کے سامنے کیونکر اپنی بے بسی کو قبول کرتا۔ سو یہ اس کی طرف سے آخری وار تھا۔ اب وہ بے بس نہیں رہا۔ اب سارا اختیار ایک دم سے اس کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ یہ انقلاب جو راتوں رات آیا، اسے یک لخت سارے حقوق سونپ گیا ہے اور وہ سرکش ضدی ضدی لڑکی جو بے بس ہونا نہیں جانتی تھی۔ اب باپ کے ہاتھوں بے بس ہے۔ بھا نے کیسی کیسی کوششیں کیں بات صاف کرنے کی، مگر بات صاف نہ ہوئی اور الجھتی گئی اور گڑیا کو گھر پڑے مہینہ ہونے کو آیا اور وہ اپنی واحد دوست کو آنسو بھرے خط لکھتی رہی اور بھا انہیں پوسٹ کرتے رہے کہ صرف یہی خدمت وہ اپنی چہیتی بہن کی بخوبی بجا لا سکتے تھے)

از در دوست چہ گویم، بہ چہ عنوان رفتم　　　ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرمان رفتم

فارسی شعر پڑھتے ہوئے مجھے اس کی کیسی کیسی یاد آئی، وہ جو فارسی اشعار کی دلدادہ تھی اور اٹھتے بیٹھتے ہر بات پر فارسی شعر پڑھا کرتی تھی۔ آج حاجی مراد صاحب، کہ رشتے میں میرے باپ ہیں، مذہبی تبلیغ کی خاطر سات دنوں کے لئے کہیں جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک موقع ہے میں سوچتی ہوں۔ مجھے خوش ہونا چاہیے کہ ایک ماہ کی قید کے بعد اب سات روز شہر ممنوع کا در وا ہوگا۔ مگر مجھے اب اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ کوئی تمنا نہیں ہے۔ لیکن کیوں؟ میں تعجب سے سوچتی ہوں۔ کیا اس ایک ماہ میں میرے احساسات مردہ ہو چکے ہیں؟ کیا اب میں خوشی اور غمی میں امتیاز کرنا بھول چکی ہوں؟!

اس سہ پہر، مدت کے بعد، میں نے اپنے پسندیدہ انتہائی خوب صورت کپڑے پہنے اور وہ ہلکا پھلکا زیور بھی جو میں خاص خاص مواقع پر پہنا کرتی تھی۔ پھر میں آئینے کے سامنے بیٹھ کر دیر تک سنگار کرتی رہی ——— تو تو یوں بناؤ سنگار کر رہی ہے گویا تجھے اپنے محبوب کے پاس جانا ہو ——! چپکے سے میرے کان میں کسی نے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کوئی بھی تو نہ تھا۔ کمرے میں صرف میں ہی میں

تھی — تو پھر یہ میں نے ہی سوچا ہوگا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر سوچا اور آئینے کی طرف اپنے عکس میں اس سوچ کا جواز ڈھونڈنا چاہا۔ آئینے میں ایک دم سے وہ رات ابھری ——— لوہے کے جنگلے پر چنگھاڑتے ہوئے ابا ——— اماں اور بھا سر جھکائے۔ اور میں ——— پتھرائی ہوئی آنکھیں لئے ان کے چہرے کی طرف بے بسی اور بے چارگی سے دیکھتی ہوئی ——— انتقام کا لاوا میری نس نس میں پھوٹ بہا۔ "یہ حاجی مراد سے انتقام کا وقت ہے!" میرے کان میں پھر سرگوشی ہوئی مگر اب کی میں نہ گھبرائی نہ پریشان ہوئی بالوں میں پن اڑاتے ہوئے میں آسودگی سے مسکرائی۔

بس سٹاپ پر میں مستورات کے حصے میں اکیلی تھی۔ مردانے میں خوب بھیڑ تھی۔ میں نے چہرہ مردانے کی طرف موڑتے ہوئے غور سے دیکھا تو دل خواہ مخواہ ہی دھڑکنے لگا اور پیشانی پسینہ سے نہا گئی۔ آج تک کبھی اس قسم کا خیال ذہن کے پاس منڈلایا تک نہ تھا۔ میں نے پھر جی کڑا کر کے مردانے حصے پر نگاہیں جما دیں۔ چند لڑکے میری ہی عمر کے تھے۔ شریر سے، شور و غل مچاتے ہوئے۔ یا پھر بوڑھے ——— دھنیاں باندھے، عجیب بیزار صورت بنائے بس کے انتظار میں جمائیاں لیتے ہوئے ———

بس آئی اور چل بھی گئی۔ میں کھڑی رہی۔ مردانہ پھر بھرنے لگا۔ وہی کم عمر طالب علم اور بوڑھے یا ادھیڑ عمر بیزار صورت آدمی ——— بسیں آتی اور گزرتی رہیں اور میں انتقام کی آگ میں سلگتی مستورات کے حصے میں کھڑی رہی ——— پھر سامنے کی سڑک پر سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک لمبا تڑنگا سا آدمی آیا اور عین میرے سامنے چہرہ کر کے مردانے میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے خاصا قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ مگر چہرے پر سے شرافت چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ وہاں ایک عجیب بے حیائی اور آوارگی کے ڈیرے تھے۔ وہ غالباً کافی دیر سے سڑک کی دوسری طرف سے میری نقل و حرکت کا مشاہدہ کر رہا تھا کیوں کہ اس کی بے باک نظریں کچھ بولتی ہوئی اور ہاتھ کچھ بے ہنگم سے اشارے کر رہے تھے۔ میرے ماتھے پر پسینہ پھر بہ نکلا۔ میں نے گھبرا کر اپنی پوزیشن بدلی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ جی میں آیا بس کا انتظار ترک کر دوں اور پیدل ہی گھر چل پڑوں۔

"تو حاجی مراد سے انتقام لے گی؟" کان میں پھر سرگوشی ہوئی۔ میں نے اچانک ہی پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی کھڑا اپنی بے باک نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ یک بارگی میں نے ہاتھ اٹھایا۔ نقاب الٹنے کے لئے۔ اور وہ انتہائی بدذاتی سے مسکرانے لگا اور آہستہ سے میری طرف بڑھا ———"

"گڑیا مجھے یقین ہے ابا کو غلط فہمی ہوئی ہے ———" بھا اپنی سنجیدہ آواز میں مجھ سے مخاطب تھے ——— بھا! ——— میرے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا ——— بے وقوف لڑکی! تو حاجی مراد کی بیٹی ہی نہیں ایک چہیتے بھائی کی اکلوتی بہن بھی ہے ——— وہ جو تیرا بھائی بھی ہے اور دوست بھی ——— جو تیری بہن بھی ہے اور تیری سہیلی بھی ——— جو تیری ماں بھی ہے اور تیرا باپ بھی ———

کانپتے ہاتھوں سے میں نے نقاب برابر کی اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بھاگنے لگی ———

غلام رسول تنویر

نیا آدمی

چوہدری فضل دین کو تین چیزیں نئی رکھنے کا خبط تھا۔ نئی بیوی، نئی کار اور نیا مزارع۔ وہ جب بھی کار کا ماڈل بدلنے کا سوچتا، اکثر یہ بات درست نکلتی کہ وہ پرانی عورت سے اکتا گیا ہے اور کسی نئی عورت سے جائز یا ناجائز ناطہ جوڑنے میں کوشاں ہے۔ جونہی وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوتا، کار کا ماڈل بھی بدل جاتا۔ نئی کار کے ساتھ ہی اسے آمدنی بڑھانے کا خیال آتا اور وہ فوراً پرانے مزارعین کو نکال کر کوئی نئے مزارع رکھ لیتا۔ مدتوں سے یہ اس کا معمول تھا جو ہر پانچویں چھٹے سال دہرایا جاتا۔

وہ جب سکول سے فارغ ہو کر کالج میں ہمارے ساتھ شامل ہوا تو سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی کار میں اپنے والد کے ہمراہ آیا۔ اس زمانے میں کار رکھنا اتنا ہی بڑا عجوبہ تھا جتنا اس زمانے میں کسی کالے کا کسی گوری عورت سے شادی کرنا یا شہر سے ہٹ کر بنگلہ بنا کر رہنا یا انگریزی سوٹ کے ساتھ فیلٹ ہیٹ پہننا۔ چنانچہ جب وہ چند دن کار میں بیٹھ کر کالج آیا تو ایک دم سب لڑکوں کی نظر میں آگیا۔ لڑکے لاشعوری طور پر اس کی طرف کھنچنے لگے اور وہ بھی یوں سب کے قریب آ گیا جیسے برسوں سے اس کلاس میں پڑھتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پوری کلاس کے ساتھ گھل مل گیا۔ پہلے دن میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اور پھر وہیں جم گیا چونکہ میرے اور اس کے مضامین ایک ہی تھے اس لئے ہم دونوں آپس میں بہت بے تکلف ہو گئے۔

وہ ہوسٹل میں رہنے لگا اس لئے اس کی کار اب کبھی کبھار نظر آتی۔ ویسے بھی آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کار کے سائے سے باہر آنے لگی تھی اور اس کی ذاتی صلاحیتوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کلاس میں وہ ہر بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور کلاس سے باہر دیگر سرگرمیوں میں بھی۔ جلد ہی فٹ بال ٹیم میں وہ سنٹر فارورڈ لے لیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ کالج یونین کی سنٹر فارورڈ لائن میں پہنچ گیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو برس میں وہ ایک بہترین مقرر بن گیا اور تیسرے سال یونین کا صدر اور کالج بھر کی مرکزی شخصیت۔۔۔ لڑکوں سے اس کا یارانہ تو ضرب المثل تھا ہی، لڑکیوں میں بھی وہ یوں جا بیٹھتا جیسے ان کا پرانا ہمجولی ہو۔ ان تین برسوں میں اس نے تین کامیاب اور تین ناکام معاشقے کئے لیکن وہ سب کے سب بے ضرر قسم کے معاشقے تھے۔ سنتے تھے کہ با ضرر قسم کے معاشقے وہ کالج سے باہر کرتا ہے۔

جب وہ تیسرے سال میں تھا تو کار اس کے پاس ہی رہنے لگی۔ شاید اس کے والد نے نئی کار خرید لی تھی۔ یہ بھی سنا تھا کہ نئی کار کے ساتھ اس کے والد نے کسی نئی عورت سے بھی کوئی تعلق قائم کر لیا تھا۔ چونکہ میری اس سے بہت بے تکلفی تھی اس لئے میں نے ایک دن تنہائی میں اس سے پوچھا کیا اس کے والد نے نئی کار خرید لی ہے؟ وہ کہنے لگا کہ ظاہر ہے نئی کار کی آمد کے بغیر مجھے یہ کار نہیں مل سکتی تھی۔ جب میں

نے نئی عورت کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔ اس کے ٹالنے کے انداز میں کوئی غم یا غصہ نہیں تھا۔ بس یوں محسوس ہوا جیسے وہ بات کوئی اتنی اہم نہ ہو کہ اس کے متعلق اتنے تجسس سے کام لیا جائے۔

اس سے اگلے سال اچانک اس کا والد فوت ہو گیا۔ والد کی تمام تر جائیداد کا وہ اکلوتا وارث تھا۔ اس کی نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ والدہ بچپن میں ہی چل بسی تھی۔ وہ دو چار عورتیں جو جائز یا ناجائز طور سے اس کی سوتیلی ماں ہونے کی دعوے دار تھیں انہیں اس نے بڑی خوش اسلوبی سے کچھ دے دلا کر فارغ کر دیا۔ اس کے بعد ایک دو مہینے بے قاعدگی سے کالج آیا اور پھر یکایک غائب ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد اس نے مجھے ایک خط لکھا اور میرے علاوہ، دو چار دیگر دوستوں کو بڑی محبت اور خلوص سے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی اور ہمیں لے جانے کے لئے اپنی کار بھیج دی۔ ہم خوشی خوشی اس کے گاؤں گئے اور دو دن وہاں رہے۔ اس کی زمین ارد گرد کے کئی دیہات میں پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ گاؤں مرکز میں تھا۔ اس کی آبائی حویلی گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھی۔ یہ ایک قلعہ نما مکان تھا جو بہت بڑا تھا۔ مکان تین اطراف سے سرسبز کھیتوں سے گھرا ہوا تھا۔ مشرقی رخ پر کوئی میل دو میل کے پھیر میں ایک چٹیل میدان تھا۔ یہ سب زمینیں اس کی ملکیت تھیں بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ زمینوں کا یہ سلسلہ بے حد و حساب تھا۔ اس آبائی جاگیر میں آدھی سے زیادہ زمین غیر آباد اور بنجر تھی۔ ان میں سب سے بڑا بنجر قطعہ یہی چٹیل میدان تھا جو اس حویلی کے مشرق میں پھیلا ہوا تھا۔

اس جاگیر کی ابتدا نہ جانے کس طرح ہوئی۔ کسی مغل تاجدار کی نظر کرم سے یا غدر میں کسی انگریز کی جان بچانے کے صلے میں یا فوج میں لوگوں کو بھرتی کرانے کی بنا پر یا اینوں کا سر سرکار عالیہ میں پیش کرنے پر کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن چوہدری فضل دین نے جو کہانی اس ضمن میں سنائی وہ ان سب سے مختلف تھی۔ وہ باوجود اس کے کہ چوہدری مشہور تھا خود کو ترکی النسل کہلاتا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ اس کے جدامجد کسی ترک فاتح کے ساتھ یہاں آئے اور یہیں آباد ہو گئے اور یہ تمام علاقہ ان کا مفتوحہ تھا۔ بہرحال بات کچھ بھی ہو یہ ایک حقیقت تھی کہ چوہدری فضل دین اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔

مہینے میں ایک آدھ دفعہ وہ ہمارے پاس ضرور چکر لگاتا یا کار بھیج کر ہمیں بلا لیتا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر ہم ادھر ادھر بکھر گئے لیکن میرا اور اس کا رابطہ قائم رہا اور ہم باقاعدگی سے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ وہ سب پرانی چیزوں سے اپنا تعلق قائم رکھتا تھا سوائے ان تین چیزوں کے جن کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں۔ اول اول میں اس کی اس عادت پہ بہت چڑتا رہا، قطع تعلق کی دھمکی بھی دی لیکن وہ نہ تو یہ عادت چھوڑتا تھا نہ مجھے۔ کار کے ساتھ ہی اس کی داشتہ بدل جاتی اور ساتھ ہی مزارع بھی۔ اس کے نت نئے مزارع بدلنے پر میں بہت لال پیلا ہوتا لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال جاتا کہ جس طرح نئی عورت نئے مرد پہ محنت اور محبت صرف کرتی ہے اسی طرح نیا مزارع نئی زمین پر محنت اور محبت صرف کرتا ہے حالانکہ اس کی دونوں باتیں غلط تھیں۔ نہ تو اس کی نت نئی بیویوں کی محبت زیادہ بار آور ثابت ہوئی نہ ہی نئے مزارع کی محنت۔ اس کی تمام تر اولاد صرف ایک لڑکے پر مشتمل تھی اور زمین کی پیداوار وہی تھی جو غالباً اس کے جد امجد کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی۔

چوہدری فضل دین زندگی میں غم کو ہمیشہ گناہ سمجھتا رہا۔ اس لئے میں نے کبھی اسے افسردہ نہیں دیکھا۔ اسے اگر تھوڑی بہت پریشانی تھی تو یہی کہ اس کا لڑکا آفتاب خاندان کی کئی پشتوں کی روایات سے باغی تھا۔ وہ نہ تو کار رکھنے کے حق میں تھا نہ عورت۔ مزارعوں کو بدلنا

اس کے نزدیک مذہب بدلنے کے مترادف تھا۔ وہ صرف کتابیں پڑھتا تھا۔ چوہدری فضل کو اس کی یہ حرکات سخت ناپسند تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنے قالب میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتا تھا جس طرح وہ خود ہو بہو اپنے والد کی تصویر تھا۔ لیکن بیٹا تھا کہ وہ باپ کے ہر روپ سے روگردان تھا اور ہر انداز سے آزاد۔ چوہدری جن خاندانی روایات کو اپنے شکوہ کی علامت گردانتا تھا، بیٹا انہیں اپنے اندوہ کی وجہ بیان کرتا تھا۔ باپ بیٹے میں خوب بحث ہوتی، بیٹا کتابی باتیں کرتا اور باپ تجرباتی۔ بیٹے کو باپ کے تجربات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ باپ کو بیٹے کی کتابوں سے۔ دونوں سوچ کی کھیتی میں اپنا اپنا بیج بونے پہ مصر تھے۔

ان کی جاگیر پہ زرعی اصلاحات کا دور بھی آیا لیکن زرعی اصلاحات کے باوجود چوہدری نے اپنے بیٹے اور بیویوں وغیرہ کے نام زمین منتقل کر کے تقریباً ساری کی جاگیر بچا لی۔ بنجر زمینوں کو آباد کرنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ اسے بھی خاندانی روایات کا ایک حصہ سمجھتا تھا بلکہ شاہانہ استغنا کا ایک جیتا جاگتا ثبوت۔ لیکن بیٹا اسے صریحاً بے حسی اور لاپروائی پہ محمول کرتا تھا اور اس خاندانی روایت کو انسان کش اور قوم دشمنی سے منسوب کرتا تھا۔ باپ بیٹے کی یہ بات سن کر مسکرا دیتا اور کہتا کہ بنجر زمینوں کی آبادی میں مجھے تمہاری مزید دولت کی بھوک نظر آتی ہے اور بیٹا جب کسی بھوکے یا ننگے انسان کو دیکھتا تو فوراً باپ سے کہتا کہ اس کی روٹی کے غاصب آپ ہیں۔ جب باپ کسی مزارع کو بدلنا چاہتا تو بیٹا باپ کو چنگیز خان کا فلسفہ سناتا اور جب بیٹا مزارعین سے آزادانہ ملتا تو باپ اسے آباؤ اجداد کے قصے سناتا۔ دونوں باپ بیٹوں میں یہ دلچسپ نوک جھونک اکثر ہوا کرتی۔ چوہدری فضل دین اس بات سے خوش تھا کہ کم سے کم بیٹے کی ضد میں مردانہ پن تو ہے۔

باپ بیٹے دونوں ایک عرصے سے اپنے اصولوں پہ اڑے ہوئے تھے لیکن چوہدری فضل دین کو پورا یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن بیٹے کی رگوں میں اس کا خون ضرور جوش مارے گا اور وہ خود اسے نئی کار خریدنے کا مشورہ دے کر اور پرانی کار اپنی تحویل میں لے کر قدیم خاندانی روایات تازہ کرے گا لیکن بیٹا تھا کہ کار کا نام تک نہ لیتا تھا۔ بس کتابوں کے پیچھے پڑا رہتا یا کسانوں کے پاس بیٹھ کر جانے کیا کیا منصوبہ بندیاں کرتا رہتا چوہدری کو کار کا ماڈل بدلے کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ بیٹے پر نظر جمائے ہوئے تھا کہ کب مرتی ہوئی روایت کو سہارا دیتا ہے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت جوان کا روپ دھار چکا تھا لیکن بقول باپ، بیٹے میں ابھی مردانہ پن نہیں آیا تھا۔ چوہدری اب کچھ چڑچڑا سا ہونے لگا تھا کیونکہ ڈھلتے ہوئے چوہدری فضل دین کی نسلی دھوپ بیٹے کے روپ سے روز بروز دور ہٹتی جا رہی تھی۔ چوہدری کے چہرے پر سائے دراز ہو رہے تھے لیکن بیٹا اپنے اسی مقام پر کھڑا تھا جہاں سے وہ بجھتے ہوئے پدری الاؤ سے خاندانی روایات کا چراغ جلانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ تنگ آ کر چوہدری نئی کار لے آیا اور دھڑا دھڑ مزارعوں کو بدلنے لگا لیکن اس مثلث میں نئی بیوی کی کڑی ابھی تک غائب تھی۔ شاید اس میں پہلی چار بیویوں کی تعداد حائل ہو گئی تھی۔ میں نے اس خاندانی تثلیث میں اس تیسری کڑی کا سراغ لگانے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کچھ یوں محسوس ہوا جیسے چوہدری کی یہ خاندانی روایت لنگڑی ہو گئی ہو۔ ادھر باپ کار لایا ادھر بیٹا اس بات پر مصر ہو گیا کہ وہ حویلی کے سامنے چٹیل میدان کو آباد کرنا چاہتا ہے اور اس پہ کم از کم ایک سو مزارع آباد کرنا چاہتا ہے۔ باپ جن مزارعوں کو نکال رہا تھا بیٹا انہیں اس نئی زمین پر لگانے پر تلا ہوا تھا۔ باپ بیٹے میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی تھی۔ چوہدری کچھ چڑا ہوا تھا لیکن بیٹا ٹھنڈے ٹھنڈے طریقے سے اپنی بات منوانے پہ مصر تھا۔ یہ جنگ جاری تھی اور یہ چٹیل میدان بنائے فساد بن گیا تھا اور ان کی روزمرہ بحث یا تو اس میدان سے شروع ہوتی یا اس پہ ختم ہو جاتی۔۔۔۔

(۲)

ادھر ملک میں ایک اور جنگ کا آغاز ہو رہا تھا۔ میں اس دن چوہدری کے پاس ایک خاص مقصد کے لئے گیا تھا۔ رات چوہدری اور میں دیر تک جاگتے رہے۔ وہ پھر پھر کر بات اپنے بیٹے پر لے آتا۔ شاید اس کے لئے زندگی کا ہر مسئلہ اب اس مسئلہ میں آ کر گم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس کا قدیم خاندان لاوارث ہو رہا ہو اور اس سرزمین پر سے اس کے آباؤ اجداد کا نام مٹنے والا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بول رہا تھا لیکن میں ہوں ہاں کر رہا تھا کیونکہ میرا ذہن چوہدری کے گاؤں سے کہیں دور اپنے گاؤں اعوان شریف میں لگا ہوا تھا جہاں بھارت نے چند دن ہوئے گولہ باری کی تھی اور میرا گھر بالکل تباہ ہو گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرے تمام گھر والے میرے پاس تھے ورنہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس تصور ہی سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ میں اپنے خاندانی مکان کے کھنڈر دیکھ کر آیا تھا۔ چوہدری سے کچھ رقم بطور قرض حسنہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن چوہدری تھا کہ ملکی حالات سے بالکل بے نیاز اپنی ذات میں گم تھا۔ تمام دن میرے بار بار ریڈیو پر لپکنے کی وجہ سے اسے بھی کچھ حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ابھی تک میں نے اسے اپنے گھر کی تباہی کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ گیارہ بجے رات تک ہم بار بار ریڈیو پر خبریں سنتے رہے۔ اب آزاد اور پاک فوج جموں سے صرف چند میل اور کشمیر کی آزادی سے صرف چند گھڑیوں کے فاصلہ پر تھی۔ سوچتے سوچتے نہ جانے مجھے کب نیند آ گئی۔

صبح ہم دونوں بہت دیر سے اٹھے اور ناشتے میں خاصا دن چڑھ گیا۔ خبروں کا وقت گزر چکا تھا لیکن میں خبریں سننے کے لئے سخت بیتاب تھا۔ اخباروں میں جنگ کی تفصیلات دیکھتے دیکھتے خبروں کا وقت ہو گیا۔ چوہدری کا بیٹا آفتاب اور میں ریڈیو سے لگ کر بیٹھ گئے۔ چوہدری بھی بے دلی سے آ بیٹھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ خبروں سے ایک پل پہلے ہوا میں چار پانچ دفعہ سیٹی سی گونجی۔ ہمارے جسم میں ایک لہر سی جاگی جو پہلی خبر کے ساتھ ہی بدن میں ایک برق بن کر دوڑنے لگی اور ہم بیٹھے بیٹھے بھٹی کی طرح دہکنے لگے۔ بھارت نے رات کی تاریکی میں پاکستان پر بزدلانہ حملہ کر دیا تھا خبریں جاری تھیں اور جسم میں ایک آگ سی پھیل رہی تھی۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے ایک ہی لمحہ میں ہم جست لگا کر اس دنیا سے کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ پلک جھپکنے میں سارے ماحول ساری اشیاء کی ماہیت بدل گئی۔ تمام جسم میں بار بار گرم گرم سی تھرتھری اٹھتی اور جسم تانبے کی طرح تپ کر کانوں کے پاس سینک دینے لگا۔ ہمارے وجود تحلیل ہو ہو کر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔ تمام گاؤں میں یکایک شور مچنے لگا اور لوگ کھیتوں سے اٹھ اٹھ کر اس شور میں شریک ہونے لگے۔ وہ شور کبھی ہم تینوں کے وجود میں سے اٹھتا ہوا محسوس ہوتا اور کبھی ہمارا وجود گاؤں کے اس شور میں تحلیل ہونے لگا۔ ریڈیو کی آواز سارے ماحول ساری اشیاء کو پگھلاتی جا رہی تھی۔ سارا گاؤں سارے گاؤں، ساری زمین ساری زمینیں، سارا علاقہ سارے علاقے چند منٹوں میں یوں پگھل کر ایک ہو گئے جیسے فضا میں کوئی ایٹم بم پھٹا ہو اور تمام تر اشیاء ڈھل کر ایک شے میں تبدیل ہو گئی ہوں۔ جب بارہ بجے صدر کے منہ سے لا الٰہ الا اللہ نکلا تو سارے پاکستان میں سوائے اللہ کے اور کچھ نہ تھا۔

وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ چوہدری اتنا بے چین تھا کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ فرط جذبات سے اس کا رنگ زرد تھا اور جسم پر ہلکا سا لرزہ۔ اس کا بیٹا گم سم بیٹھا تھا لیکن اس کا چہرہ یوں دمک رہا تھا جیسے وہ کسی بھٹی کے سامنے بیٹھا ہو۔ مجھے اپنا کچھ ہوش نہ تھا کہ میں کہاں تھا اور کہاں نہیں تھا البتہ دماغ بہت کچھ کرنے کے لئے سوچتا جا رہا تھا لیکن میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ میرے دماغ کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ میری ناک سے دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ میں کچھ کرنے کے لئے مرا جا رہا تھا لیکن میرے کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ میرے وجود میں گویا بم پھٹ رہے تھے گولیاں بھی سنسنا رہی تھیں لیکن میں زندہ تھا۔

ہر لمحہ ہر گھڑی رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ ایٹم کی آگ پھیل رہی تھی۔ جو لڑ رہے تھے وہ کھلی برق تھے جو واگہہ، پٹھانکوٹ، جام نگر، ہلواڑہ تک پھونکتے ہوئے نکل گئے تھے۔ جو نہیں لڑ رہے تھے وہ نہد بھٹیوں کی طرح اپنی ہی آگ میں جل رہے تھے۔ وہ وجود کی اس آگ کو کہاں برسائیں، انہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

یہ پورا دن ایک سال کے برابر تھا اور وہ رات ——— چاندنی میں گھناؤنی ہوئی ایک پوری کربناک صدی کی طرح طویل رات جو گزرتی ہی نہیں تھی جو رک رک کر رہ جاتی تھی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں کہ میں نے کس طرح گھٹ گھٹ کر تین سال سے تین دن اور تین صدیوں کی سی تین راتیں گزاریں۔ چوتھی صدی کا آغاز ہو چکا تھا جب ریڈیو نے دشمن کی چھاتہ فوج سے خبردار کیا۔ نہد بھٹیوں کے منہ کھل گئے جو چیز جس کے ہاتھ میں آئی وہ لے کر میدانوں، ویرانوں اور کھیتوں میں نکل گیا۔ ریڈیو کا یہ اعلان کھولتے ہوئے انسانوں پر عمل کی ایک راہ کھول گیا۔ ہم میدان عمل میں نکل چکے تھے۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ چوہدری کی حویلی کے ساتھ چٹیل میدان ہی ایک ایسا ویرانہ تھا جہاں دشمن بآسانی چھاتہ فوج اتار سکتا تھا۔ گاؤں کے ارد گرد باقی حصوں میں جا بجا درخت پھیلے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے بیشتر اس میدان میں گاؤں کے نوجوانوں کی ٹولیاں مختلف مقامات پہ اپنا اپنا کام سنبھال چکی تھیں اور چوہدری ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ آفتاب گاؤں کے دوسرے نازک حصوں میں گشت پر چلا گیا لیکن یہ رات خاموشی سے گزر گئی۔

دوسری رات بھی ایسی ہی خاموش تھی۔ چوہدری اور میں ٹیلوں میں پھیلے ہوئے اس چٹیل میدان میں گاؤں کے نوجوانوں کو مختلف جگہوں پر بٹھا کر لوٹ رہے تھے۔ چاندنی میں پورے کا پورا میدان آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ دور مشرق کی طرف سے ایک آواز ابھری اور چند ہی لمحوں میں دو طیارے انتہائی سرعت سے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ ابھی ان کی آواز فضا میں ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان میں سے ایک طیارہ تیزی سے لوٹتا ہوا نظر آیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میدان کا چکر لگا رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بیک وقت ایک ہی خیال ہمارے ذہنوں میں آیا کہ نازک گھڑی آگئی ہے۔ ہم تیزی سے ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گئے طیارہ بہت نیچے اتر آیا تھا اور چاندنی میں انتہائی سرعت سے عین ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہماری توقع کے خلاف ابھی تک اس میں سے کوئی چھاتہ بردار نہیں کودا تھا۔ ہماری رائفلوں کا رخ طیارے کی طرف تھا۔ جونہی وہ رعد کی طرح گرجتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر آیا اس میں سے ایک سیاہ سی شے تیر کی طرح نکلی ہماری رائفلوں نے اسے نشانہ بنایا لیکن پلک جھپکنے میں ایک ایسا قیامت انگیز دھماکہ ہوا کہ ہم زمین پر آ رہے۔ ہمارا دماغ معطل ہو کر رہ گیا جب ہمیں ذرا ہوش آیا تو گاؤں کی طرف گرد و غبار کے گہرے بادل اٹھتے ہوئے نظر آئے اور ایک کہرام مچا ہوا محسوس ہوا۔ ہم اندھا دھند گاؤں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ گرد و غبار میں ہر چیز گم تھی۔ ہم گاؤں کے قریب پہنچ گئے تھے لیکن راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم راستہ بھٹک گئے۔ صرف گاؤں سے اٹھتے ہوئے شور کی رہنمائی میں گرتے پڑتے جا رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ذرا آگے گئے تو دیکھا کہ لوگ ایک سمت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہم نے بھی وہی سمت اختیار کی۔ چاروں طرف سے لوگ، صرف ایک سمت بڑھ رہے تھے اور جہاں جا کر وہ شور رکتا تھا وہ ——— وہ چوہدری کی حویلی تھی جس کا آدھے سے زیادہ حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں کہ اس کے بعد ہم کیا کرتے رہے۔ زنان خانہ محفوظ تھا لیکن آفتاب کا نام آہستہ آہستہ لوگوں کی زبان پہ گردش کرنے لگا اور پھر سارا گاؤں مجنونانہ ملبے پر ٹوٹ پڑا۔ کسی نے بتایا کہ حویلی کے اس حصہ میں آفتاب چند دیہاتی نوجوانوں کے ساتھ بیٹھا ہوا قومی دفاعی فنڈ کا حساب کر رہا تھا۔ یہ بیان نمبردار کے لڑکے فیض کا تھا جو ان کے پاس سے اٹھ کر کھیتوں میں رفع حاجت کے لئے چلا گیا تھا چند ہی لمحوں میں کئی سو ہاتھوں نے تمام ملبے کو چھان ڈالا۔ ملبے کے نیچے سے دو نوجوانوں کی لاشیں نکلیں۔ تین نوجوان شدید طور پر زخمی ہوئے تھے جن

میں سے ایک آفتاب بھی تھا جو بے ہوش تھا۔

قریبی شہر سے طبی امداد آنے تک ایک نوجوان اور چل بسا۔ آفتاب اور دوسرے نوجوان کو فوری طور پر خون دیا گیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد دوسرا نوجوان ہوش میں آگیا لیکن آفتاب کی بے ہوشی گہری ہو رہی تھی۔ اس کی نبضیں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ چوہدری گم سم بیٹے کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اس سارے واقعہ کے دوران وہ ایک دفعہ بھی نہیں بولا تھا۔ اس کی چپ سے مجھے تشویش ہو رہی تھی۔

صبح ہو گئی۔ سارا گاؤں چوہدری کی حویلی کے ملبے کے ارد گرد بیٹھا تھا۔ بم حویلی سے ذرا فاصلے پر چٹیل میدان میں گرا تھا۔ چونکہ حویلی گاؤں سے ہٹ کر تھی اس لئے گاؤں کے کسی دوسرے مکانوں کا اتنا نقصان نہیں ہوا تھا۔ ریڈیو پاکستان سے جنگ کی خبروں کے نشریہ میں بتایا گیا کہ رات دشمن کے ایک طیارے نے آبادی پر بمباری کی۔ آکاش وانی کی خبر تھی کہ رات ان کے بمبار طیارے نے فلاں ہوائی اڈے پر بم پھینکا اور اڈہ بالکل تباہ کر دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ جونہی یہ خبر نشر ہوئی چوہدری کے بدن میں ایک لرزہ سا پیدا ہو گیا اور اس نے پہلی دفعہ سر اوپر اٹھایا اور چٹیل میدان پر نگاہ ڈالی پھر بیٹے کو گھورتے گھورتے سر جھکا لیا۔ دشمن نے چٹیل میدان کو ہوائی اڈہ سمجھ لیا تھا۔ سارا گاؤں یہ خبر سننے کے بعد چٹیل میدان کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے واقعی وہ کوئی ہوائی اڈہ ہو۔

آفتاب کے چہرے پر موت کی زردی گہری ہو رہی تھی۔ ہزاروں نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں جن میں سے بیشتر نمناک تھیں۔ ارد گرد کے تمام دیہات سے مرد، عورتیں اور بچے اکٹھے ہو گئے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے اور عورتوں کے دامن دعا کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ چوہدری کا بیٹا اس علاقے میں کتنا مقبول تھا یہ مجھے آج معلوم ہوا۔ نہ جانے وہ ان لوگوں کے درمیان کیا کچھ گزارتا تھا کیونکہ ہر نگاہ میں اس کے لئے وہ پیار تھا جو کسی بیٹے یا بھائی کے لئے ہوتا ہے۔ اگر کوئی عورت بے قابو ہو کر رو دیتی تو چوہدری چونک کر بیٹے کی طرف دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی ایک برق سی لہرا جاتی۔ بیٹے کو سانس لیتے ہوئے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

دو دن اور دو راتیں یوں ہی گزر گئیں۔ آفتاب کی حالت میں ذرا بھر فرق پیدا نہیں ہوا۔ مختلف وقفوں سے اسے خون یا گلوکوز دیا جا رہا تھا لیکن وہ زندگی اور موت کی سرحد پر معلق تھا۔ موت و حیات کے درمیان معرکہ گرم تھا۔ یہاں بھی اور پاکستان کی سرحدوں پر بھی۔ اس علاقے کے لوگوں کی نگاہیں دونوں محاذوں پر برابر جمی ہوئی تھیں۔ حالات کچھ یوں محسوس ہوتے تھے جیسے آفتاب بھی پاکستان کے کسی محاذ کا کوئی زخمی سپاہی ہو کیونکہ ملک کے ان حالات کے باوجود وہ مقامی لوگوں کو نہیں بھولا تھا۔ ہر وقت چاروں کھونٹ سے دیہاتیوں کا تانتا بندھا رہتا لیکن چوہدری کو کچھ خبر نہ تھی کہ کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے۔

(۳)

آفتاب کو بے ہوش ہوئے اڑتالیس گھنٹے ہو گئے تھے۔ ابھی دن پوری طور پر طلوع نہیں ہوا تھا کہ مؤذن کی آواز فضا میں پھیلنے لگی۔ چوہدری بیٹے کے پاس بیٹھا تھا۔ اذان کی آواز پر اس کے جسم میں ایک لرزہ سا پیدا ہوا۔ میں بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا، اس کے سنگین چہرے پر پھیلی ہوئی زردی میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ اس نے پہلی دفعہ زبان کھولی اور پانی مانگا۔ اسے دودھ کا گلاس دیا گیا جسے وہ پانی سمجھ کر پی گیا۔ پھر سارے گاؤں نے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں پہلی دفعہ یہ دیکھا کہ چوہدری کی آنکھوں میں موتیوں کی طرح دو موٹے موٹے آنسو ابھرے اور پلکوں پہ آکر یہ رک گئے۔ لیکن ان آنسوؤں کو زمین پر گرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ چوہدری وہ آنسو آنکھوں ہی آنکھوں میں

پی گیا۔ اس نے آنسو کیا پئے اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ زردی سرخی میں تبدیل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگا۔ پھر یہ شوخی اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ اس نے سر اٹھایا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہ حویلی کے ملبے پر پڑی۔ پھر وہ چٹیل میدان میں آ کر رک گئی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ سرعت سے اٹھا اور میدان کی طرف لپکا جیسے اس نے وہاں کسی دشمن کو گھات میں بیٹھا دیکھ لیا ہو۔ لوگ اس کے لیے راستہ چھوڑ رہے تھے۔ میدان میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے مدمقابل کا بھرپور جائزہ لیتا ہے —— وار کرنے سے پہلے —— وہ اس حالت میں کچھ عرصہ وہاں کھڑا رہا۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ تیزی سے مڑا اور حویلی کی طرف بڑھا۔ ملبے کے ڈھیر کے گرد گھوم کر وہ حویلی کے زنان خانہ کی طرف آیا جو سلامت تھا۔ حویلی کے اس حصہ کی پشت پر چوہدری کی نئی کار گرد و غبار میں اٹی ہوئی کھڑی تھی۔ ایک میکانکی سے انداز میں چوہدری کار میں بیٹھ گیا۔ ہزاروں کا مجمع تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے کسی کلدار پتلے کی طرح چوہدری نے کار کو سٹارٹ کیا اور ایک ہی جھٹکے سے کار یوں زناٹے سے آگے بڑھی کہ ایک دو دیہاتی اگر اچھل کر الگ نہ ہوتے تو کار کے نیچے آ جاتے۔ گرد کا ایک غبار اٹھا اور چوہدری کار سمیت اس میں غائب ہو گیا۔

تمام دیہاتی دم بخود غبار کے اٹھتے ہوئے بادل کو دیکھ رہے تھے۔ یہ سب یوں یکا یک ہو گیا تھا کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ کیا ہوا۔ جب ذرا دیہاتیوں کے حواس درست ہوئے تو ہر آدمی دوسرے آدمی سے سوال کر رہا تھا کہ چوہدری کو کیا ہوا اور وہ کہاں چلا گیا۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ میں بھی دم بخود تھا فوراً آدمی گھوڑوں پر ادھر ادھر دوڑائے۔ کچھ لوگوں کو شہر کی طرف دوڑایا کیونکہ کار کا رخ شہر کی طرف تھا۔ بعد میں دوپہر تمام لوگ ناکام واپس آ گئے۔ چوہدری کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر کچھ لوگوں کو دریا کی طرف بھیجا گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں شام نے آ لیا۔ ادھر آفتاب کی بے ہوشی اور گہری ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نا امید ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ سوجھتا نہیں تھا کہ کیا کریں۔ بیٹا نزع کے عالم میں تھا اور باپ لاپتہ۔ شام ابھی ڈھلی نہیں تھی کہ ہزاروں دیہاتیوں نے یک وقت دور سے گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنی۔ سب نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ غبار کی ایک لکیر تیزی سے اوپر اٹھ رہی تھی ایک انجانا سا خوف فضا میں پھیلنے لگا۔ پھر دور سے دو ٹینک دو ٹریکٹروں کی شکل اختیار کر گئے۔ ان کی رفتار بہت تیز تھی اور ان کی گڑگڑاہٹ سے سارا ماحول گونج رہا تھا۔ پھر سب دیکھنے والی آنکھ پھٹی کی پھٹی رہ گئی کیونکہ آگے آگے جو ٹریکٹر آ رہا تھا اسے چوہدری چلا رہا تھا۔ وہ ٹریکٹر پر اسی طرح کلدار پتلے کی طرح جما ہوا تھا جس طرح وہ کار میں بیٹھ کر گیا تھا۔ صرف اس کے بازو متحرک تھے۔ اس کے سرخ تنے ہوئے چہرے پر آنکھیں ساکن تھیں اور وہ سرخ ساکن آنکھیں چٹیل میدان پر لگی ہوئی تھیں۔ ٹریکٹر میدان کی طرف یوں بڑھ رہا تھا جیسے ٹینک دشمن کی طرف بڑھتا ہے۔ میدان میں پہنچ کر ٹریکٹر ایک لمحہ کے لیے رکا۔ چوہدری کے جسم میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے مدمقابل کا بھرپور جائزہ لیتا ہے —— وار کرنے سے پہلے —— اس نے ایک لمحہ کے لیے بیٹے کی چارپائی کی طرف دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے ٹینک یوں آگے بڑھایا جیسے کوئی حملے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ خشک زمین کے سینے پر آرہ چلتے ہی غبار کا بادل سا اٹھا جو دوسرے ٹریکٹر کے بادل میں شامل ہو کر فضا پر محیط ہو گیا۔ دو ٹریکٹر چٹیل میدان کو روندتے جا رہے تھے۔ میدان کے کنارے پر کھڑا ہوا سارا گاؤں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے لیکن ان کی آوازیں ٹریکٹروں کے شور میں دب گئیں۔

شام کب ڈھلی اور رات کا آغاز کب ہوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہ دو ٹریکٹر جادو کی مشین کی طرح چل رہے تھے اور ان کے شور سے کر خاک رات کا سناٹا ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا۔ خشک میدان کی بالائی سطح کی طرح جس پر لکیروں کا ایک جال بڑی سرعت سے ابھر رہا تھا۔ اس شور سے تمام علاقہ گونج رہا تھا جیسے یہاں بھی جنگ کا کوئی محاذ کھل چکا ہو۔

میں بڑی بے چینی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ٹریکٹر چل رہے تھے اور رات رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ چوہدری ایک پر اسرار خاموشی سے کام میں مصروف تھا اور کسی کو جرأت نہ تھی کہ اسے مخاطب کرے۔ اس نے اور دوسرے ٹریکٹر کے ڈرائیور نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ بس مسلسل کام میں لگے ہوئے تھے اور ساری آبادی ایک استعجاب کے عالم میں انہیں چاندنی رات میں کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

میں ادھر ڈاکٹر کا ہاتھ بٹا رہا تھا جو دوپہر کے بعد سے آفتاب کو لمحہ بہ لمحہ موت سے بچانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ اس عالم میں آدھی رات سے زیادہ گزر گئی۔ اس وقت ڈاکٹر آفتاب کو گلوکوز دے رہا تھا جب کہ آفتاب کا ہاتھ ذرا سا ہلا۔ اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی اور تھوڑی دیر بعد وہ مدھم سی آواز میں کراہا۔ حادثے کے بعد یہ پہلی آواز تھی جو اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔ کراہنے کی یہ آواز ذرا اونچی ہوئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کہ اس کے پپوٹے ہل رہے ہیں اور وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں۔ آہستہ آہستہ آنکھوں کا زاویہ بتانے لگا کہ اس کے کان ٹریکٹر کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ پھر اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے کچھ کہا۔ میں اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ اس نے شاید کہا۔ "ٹینک؟" میں نے کہا "نہیں ٹریکٹر"۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا تنفس درست ہو گیا تھا۔

کسی نے بھاگ کر چوہدری کو اونچی آواز میں بتایا کہ آفتاب ہوش میں آگیا ہے۔ سنا ہے یہ آواز سن کر وہ یوں چونکا جیسے کوئی نیند سے ہڑبڑا کر جاگتا ہے۔ وہ ٹریکٹر سے کود کر ادھر بھاگا لیکن پھر مڑا اور دوسرے ٹریکٹر کے ڈرائیور کو شاید یہ تاکید کی کہ وہ کام جاری رکھے۔ باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیٹے کی آنکھوں میں چمک تھی اور باپ کی آنکھوں میں اتھاہ پیار جس میں بڑے بڑے سمندر گم ہو جائیں۔ اس نے بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی پیشانی پر جھک گیا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو بیٹے کی پیشانی پر پانی کے دو قطرے پھیلے ہوئے تھے۔ پس منظر میں ٹریکٹر کی آواز گونج رہی تھی۔

صبح ہوئی تو سارا ماحول بدلا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف جا رہے تھے اور گاؤں میں زندگی معمول پر آ رہی تھی۔ جہاں کل چٹیل میدان تھا وہاں اب تاحد نگاہ لکیروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ گو لکیریں زیادہ گہری نہیں تھیں لیکن میدان اب ایک وسیع کھیت میں تبدیل ہو چکا تھا آفتاب تمام رات جاگنے کے بعد اب بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔ ایک فاتح کی طرح جس نے بڑی جدو جہد کے بعد موت کو شکست دی تھی۔ ڈاکٹر کے خیال میں وہ اب خطرے سے باہر تھا۔

چوہدری دور میدان کے دوسرے حصے میں ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ ٹریکٹر کی یہ آواز ساری رات ایک لمحہ کے لئے نہیں رکی تھی۔ اس وقت دوسرے ٹریکٹر کا ڈرائیور جی بھر کر ناشتہ کرنے کے بعد سامنے جھکے ہوئے درخت کے نیچے زمین پر چادر بچھائے گہری نیند سو رہا تھا لیکن چوہدری کسی قسم کی تھکن کے احساس کے بغیر کام میں مصروف تھا۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا اور نہ کچھ کھانے کے لئے تیار ہی تھا۔

دوپہر کے وقت جب آفتاب جاگا تو اسے پھلوں کا رس دیا گیا۔ چوہدری نے پہلی دفعہ بیٹے کے ساتھ ناشتہ کیا۔ دوسرا ٹریکٹر دوبارہ حرکت میں آچکا تھا اور اس کی وہ آواز جاری تھی جسے شروع ہوئے اٹھارہ گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ آواز آفتاب کے لئے مسیحا بن کر آئی تھی۔ یہ آواز اسی طرح جاری رہی۔ تین دن گزر گئے اور یہ آواز نہ رکی۔ آفتاب گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھنے لگا۔

چٹیل میدان کا تمام تر سینہ کمل چکا تھا۔ اب اس کے چاک پانی کے منتظر تھے۔ اس اثنا میں ایک اور ٹریکٹر ڈرائیور آگیا تھا اور نہ جانے کس ہدایت کے تحت دونوں ٹریکٹر ڈرائیور گاؤں کے ارد گرد دیگر بنجر زمینوں پر ٹریکٹر چلانے کے لئے چلے گئے تھے۔ ٹریکٹر کی آواز ہر وقت کسی نہ کسی طرف سے آتی رہتی کیونکہ وہ باری باری سے اس آواز کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ پھر مجھے یکا یک گاؤں چھوڑنا پڑا۔ ملک کے ان غیر معمولی حالات میں میں سات آٹھ دن گھر سے بغیر اطلاع غائب رہا تھا۔ اس اثنا میں اہل خانہ پر کیا بیتی یہ ایک الگ مضمون ہے جسے یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ شہر آتے ہی میں چند اہم مسائل میں الجھ گیا۔ جنگ رک گئی لیکن میرے مسائل بدستور الجھے رہے اور میں کچھ اس ڈھنگ سے مصروف کار رہا کہ باوجود سخت کوشش کے آفتاب کی خیریت دریافت کرنے کے لئے فی الفور گاؤں نہ جا سکا بلکہ کافی عرصہ بعد مجھے دوبارہ وہاں جانے کا موقعہ ملا۔

(۴)

بس سے اترنے کے بعد میں نے چوہدری کے گاؤں کے لئے ایک ٹانگہ کرائے پر لیا۔ سردی اپنے جوبن پر تھی لیکن دھوپ کی ہلکی ہلکی تمازت فرحت بخش تھی۔ راستہ وہی تھا جس پر میں نے مدتوں سفر کیا تھا لیکن آج اس راستے پر چلتے ہوئے مجھے بہت سی چیزیں اجنبی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس چھوٹی سی مسجد کے ساتھ ایک اجاڑ قطعہ زمین تھا جہاں بے شمار جھاڑیاں تھیں لیکن اب اس کی جگہ یہاں دھان کے سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ مسجد سے ایک میل آگے پرائمری سکول کے عقب میں ایک چٹیل میدان تھا لیکن وہ میدان اب غائب ہو گیا تھا اور وہاں سکول کے ارد گرد سڑک تک دھان ہی دھان کے کھیت تھے۔ چاروں طرف جدھر نگاہ اٹھتی تھی افق تا افق زمین نے دھانی لباس پہن رکھا تھا جس میں کہیں کہیں زردی کی جھلک نمایاں تھی۔ سبزہ تھا کہ آنکھوں میں سرور بن کر اتر رہا تھا۔ خوشبو تھی کہ چاروں طرف فضا میں رچی ہوئی تھی۔ پرانے کنوئیں کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ وہاں ایک چھوٹا سا ٹیوب ویل لگا ہوا تھا اور پانی اور سبزے کا سیلاب تھا کہ کنوئیں کی منڈیر تک آیا ہوا تھا۔ جس راستے پر کبھی دھول اڑتی تھی وہاں اب جا بجا پانی کھڑا تھا اور ارد گرد جہاں کبھی جھاڑ جھنکار سے نگاہ دوچار ہوتی تھی وہاں قدم قدم پر سبزہ استقبال کر رہا تھا۔

ذرا آگے بڑھے تو پرندوں کی پرواز کی آواز کے ساتھ ساتھ ٹریکٹر کی وہی مانوس آواز میرے کانوں میں پڑی جسے میں اسی حالت میں چھوڑ کر یہاں سے گیا تھا۔ پرانے کنوئیں سے آگے بھی سبزہ جوبن پر تھا۔ یہاں سے آدھ میل آگے ایک ایسے وسیع ویرانے میں سے گزرنا پڑتا تھا جہاں سے رات کے وقت گزرنے کی بہت کم لوگوں کو ہمت ہوتی تھی۔ دن کے وقت بھی یہاں سے گزرتے ہوئے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ ابھی ہم وہاں نہیں پہنچے تھے کہ دور آندھی سی اٹھتی نظر آئی۔ ذرا قریب گئے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ تمام تر ویرانہ جھاڑیوں سے صاف تھا۔ اس کے ایک حصے میں دو ٹریکٹر بنجر زمین کا سینہ چاک کر رہے تھے۔ دوسری طرف ہزاروں کی تعداد میں جوان مرد اور نو عمر لڑکے کدالوں آہنی پھاوڑوں اور بیلچوں کی مدد سے زمین کھود رہے تھے۔ تیسری طرف سینکڑوں ہلوں میں جتے ہوئے بیل قطار اندر قطار چل رہے تھے اور ان کے ہانکنے والوں میں اکثریت بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے دیہاتیوں کی تھی۔ عجیب منظر تھا۔ ہر شخص ایک جوش کے عالم میں یوں مصروف کار تھا جیسے یہ سارا کام اس کے کندھوں پر آ پڑا ہو۔ ہمارے گھوڑے کے سُم خود بخود رک گئے۔ کوچوان مبہوت سا ہو کر یہ انوکھا منظر دیکھ رہا تھا۔ میں خود ایک ایسی کیفیت سے دوچار تھا جس میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔ انسانی محنت کو اتنے منظم، وسیع اور پر شکوہ انداز میں کبھی بصورت عمل نہیں دیکھا تھا۔ اس وسیع عمل میں اتنا جلال تھا کہ ہم مرعوبیت کے عالم میں نہ جانے کتنا عرصہ وہاں کھڑے رہے۔ کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ویسے بھی گرد و غبار اتنی شدت سے اٹھ رہا تھا کہ صاف صاف کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہم اس غبار کے سمندر میں اتر گئے اور بڑی مشکل سے پار اترے۔

جب میں گاؤں پہنچا تو وہاں نہ چوہدری تھا اور نہ آفتاب۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں اسی جگہ گئے ہوئے تھے جہاں ٹریکٹر چل رہے تھے۔ چوہدری کی حویلی کی تعمیر جاری تھی۔ حویلی کے سامنے ایک نئی دنیا بسی ہوئی تھی جہاں کبھی بنجر چٹیل میدان تھا وہاں اب نودمیدہ گندم کی فصلیں تا حدِ نگاہ پھیلی ہوئی تھیں۔ جس آسمان پر کبھی غبار کی چادر چڑھی ہوئی تھی اب دھوپ میں اس کی نیلاہٹ نودمیدہ سبزے کی آمیزش سے ایک وسیع فنی شاہکار کو جنم دے رہی تھی۔ ہر چیز اپنا چولا اتار چکی تھی اور میں اس جہانِ نو میں ایک نوارد کی طرح ہر ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہم نے گڑھا کھود کر کنواں بنا دیا تھا وہاں ایک ٹیوب ویل نصب کر دیا گیا تھا۔

بعد دوپہر چوہدری اور آفتاب سرتاپا مٹی میں اٹے ہوئے آ پہنچے۔ میں یہاں کی ہر شے کی طرح پہلی نگاہ میں ان دونوں کو بھی نہیں پہچان سکا۔ ہم نے ایک لمحے کے لیے کچھ اس انداز سے ایک دوسرے کو دیکھا کہ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے اور پھر ایک دوسرے سے لپٹ کر بچوں کی طرح قہقہے لگاتے رہے۔ آفتاب بڑے تعجب اور بڑے پیار سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں باپ بیٹا پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند اور شگفتہ نظر آ رہے تھے۔ چوہدری تو ایک دفعہ پھر سے جوان ہو گیا تھا۔

غسل اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم اسی وسیع کھیت کے کنارے دھوپ میں چارپائیوں پر جا بیٹھے۔ آفتاب زیرِ تعمیر حویلی میں معماروں کے پاس چلا گیا جو حویلی کی پرانی اینٹوں سے نئی عمارت کی چنائی کر رہے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ میرا دل چوہدری سے پوچھنے کو چاہتا تھا غالباً وہ اس سے گریز کر رہا تھا کیونکہ کئی دفعہ موضوع کا رخ اس طرف ہوا لیکن چوہدری کنی کاٹ گیا۔ بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے براہِ راست چوہدری سے اسی کی کار کے متعلق پوچھا۔ وہ ہنس کر کہنے لگا کہ اس نے کار بیچ کر ہی وہ دو ٹریکٹر خریدے تھے۔ اس بات پر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا وہ بات تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں اس تمام عرصے میں مسلسل یہ سوال گردش کرتا رہا تھا کہ اس صبح چوہدری کو کیا ہوا تھا کہ اذان کی آواز کے ساتھ ہی اس کے جسم میں ایک لرزہ سا پیدا ہوا، پھر دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں ابھرے اور آنکھوں ہی میں ڈوب گئے لیکن آنسو کیا ڈوبے ان آنکھوں میں کوئی سورج اتر گیا کیونکہ اس کا چہرہ ایسا شفق گون ہوا جیسے سارے جسم کا خون گردن سے اوپر سمٹ آیا ہو۔ پھر اس کا چٹیل میدان کی طرف سرعت سے بڑھنا، سرخ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنا پھر ادھر کی طرف مڑنا اور۔۔۔ اور۔۔۔ یہ مناظر مسلسل میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا تھا۔ چنانچہ آخرکار میں نے جرأت کر کے اس سے یہ پوچھ ہی لیا کہ اسے اس وقت یکایک کیا ہوا تھا۔ اس نے ہنس کر سر ڈال دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے کچھ عرصے بعد پھر یہ سوال دہرایا وہ بدستور سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور میری طرف دیکھنے کی بجائے اس کھیت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھ سے یہ سوال متعدد دوست پوچھ چکے ہیں لیکن میں نے اس کا جواب دینے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ تم اگر زیادہ ہی مصر ہو تو جو کچھ مجھے یاد ہے وہ سن لو۔ اذان کی آواز سے پہلے کا مجھے کچھ ہوش نہیں۔ میرا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا لیکن جیسے ہی اذان کی پہلی آواز میرے کان میں آئی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک صدی بعد نیند سے جاگا ہوں۔ میرے ذہن میں سارے واقعات ایک ایک کر کے تازہ ہونے لگے۔۔۔ اور جب مؤذن نے بلند آواز سے کہا "الصلوٰۃ خیر من النوم" تو میں مکمل طور پر بیدار ہو گیا۔ اس حویلی اور اس میدان کی تمام تاریخ میرے سامنے ایک کتاب کی طرح کھل گئی اور اس پر صدیاں سالوں میں اور سال لمحوں میں بدلتے ہوئے نظر آئے۔ وقت اوراق کی طرح الٹے رخ چلنے لگا اور میں۔۔۔ اور میں۔۔۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہے۔" پھر وہ ایک بے خودی کے عالم میں نودمیدہ گندم کے ننھے ننھے پودوں کو قطار اندر قطار میلوں تک پھیلے ہوئے دیکھ کر والہانہ انداز میں کہنے لگا "دیکھو یہ ننھے ننھے سرسبز پودے لاکھوں قطاروں میں سبز پوش سپاہیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ یہ افق تک پھیلی ہوئی صف بہ صف کھڑی ہوئی فوجیں جب جوان

ہوں گی تو کیا ان کے سامنے کوئی دشمن دم مار سکے گا؟"

یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر ایک ایسا جلال آگیا جیسے کسی عظیم فوج کو دیکھ کر اس کے سپہ سالار کے چہرے پر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اسی جلالی کیفیت میں کہنے لگا "تم جانتے ہو ٹریکٹر چلاتے ہوئے میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن آہستہ آہستہ علاقے کے ہر کسان کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں کس محاذ پر ٹینک چلا رہا ہوں —— جوں ہی میرے ٹینکوں نے لوگوں کی بنجر زمینوں کا رخ کیا لوگ خود بخود اس جنگ میں کودنے لگے۔ کون کس کی زمین پر کام کر رہا ہے یہ احساس ختم ہو گیا۔ جب لوگوں کے ذاتی ویرانے ختم ہو گئے تو سرکاری بنجر زمینوں کا رخ کیا گیا۔ اب اس علاقے کے تمام ویرانوں میں سبز پوش سر اٹھائے کھڑے ہیں اور روز بروز ان کا قد بڑھ رہا ہے ... سرکاری زمینوں کے انتظام کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں بنا دی گئی ہیں جو مشترکہ آمدنی سے ٹریکٹر خرید کر میرے ٹریکٹروں کی طرح لوگوں کی بلا معاوضہ امداد کریں گی۔"

وہ ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ کہہ گیا۔ پھر ایک دم رک گیا جیسے اپنے منصوبے کا ایک دم انکشاف کرنا چاہتا ہو۔ کیا خبر یہ منصوبہ اس کے بیٹے کا ہو جسے بیان کرتے کرتے اسے یہ احساس ہو گیا ہو۔ اس کے چہرے پر عزم اور شکوہ کی کیفیت اسی طرح تھی۔ وہ سرسبز میدان کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس وسیع کھیت کا تازہ تازہ پھوٹا ہوا شباب اس کے چہرے پر چھلک رہا تھا۔ چوہدری وہ چوہدری نہ تھا۔ وہ تو بالکل ایک نیا آدمی تھا۔

میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک سوال کوندا —— "نیا آدمی چوہدری تھا یا اس کا بیٹا آفتاب؟" سوال پھر بڑی تیزی سے کوندا اور لاشعوری طور پر میری نگاہیں ادھر ادھر آفتاب کی تلاش میں اٹھیں اور پھر بجلی کی سی تیزی سے مجھے یہ جواب مل گیا۔ میں نے دیکھا آفتاب معماروں کی مدد سے حویلی کی پرانی اینٹوں سے نئی عمارت اٹھا رہا تھا اور اس پرانی حویلی کے درمیان ابھرتی ہوئی دیوار کی اوٹ میں اس کا جسم پوشیدہ تھا۔ دھوپ میں چمکتا ہوا صرف اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھتے دیکھتے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس بڑی حویلی سے ایک آفتاب ابھر رہا ہو اور اس کی نرم نرم دھوپ دیوار کی اوٹ سے حویلی کے اوپر نیلگوں آسمان میں اور افق تا افق پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں میں پھیل رہی ہو۔ میں دم بخود ابھرتا ہوا وہ نیا آدمی دیکھ رہا تھا اور دور سے ٹریکٹروں کی مدھم مدھم صدا آ رہی تھی۔ کسی مسیحا کے تنفس کی طرح ....

ثریا مسعود علی

صبح اور شام

آج میں لاہور سے کراچی واپس آگئی ہوں۔ آنے اور جانے کے جذبات میں جو شدید تضاد ہے اسے محسوس کر کے روح میں بڑا گہرا گھاؤ محسوس ہو رہا ہے۔ زندگی با مقصد ہوتے ہوئے بھی بے مقصد معلوم ہو رہی ہے۔

میں جہاں آرا سے تقریباً پچیس سال بعد ملنے لاہور گئی تھی۔ جہاں آرا میرے اسکول اور کالج کے زمانے کی بہت پرانی دوست ہے۔ اب اس دوستی میں پچیس سال حائل ہو گئے تھے۔ وقت اور فاصلے جذبے کے خلوص کو دبا تو ضرور سکتے ہیں لیکن مٹا نہیں سکتے۔ میں اس تمام عرصے میں جہاں آرا کو نہ بھول سکی۔ وہ اور اس کا کردار ایک اَن مٹ نقش تھا جسے میں نے سراہا تھا، چاہا تھا، رشک کیا تھا۔ وہ اسکول اور کالج کی روح رواں تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ بہترین تھا۔ وہ منجھی ہوئی مقررہ تھی۔ نہایت عمدہ کھلاڑی تھی۔ ہر ایک سے بے جھجک مدلل بات کر سکتی تھی۔ اردو تو خیر مادری زبان ٹھہری، انگریزی میں بھی وہ بلا تامل گھنٹوں آسانی سے بولتی چلی جاتی تھی۔ ایک عجیب وقار تھا اس کی ذات میں۔ اس کا قد لمبا، جسم نہایت موزوں، رنگ گندمی، چہرہ گول، پیشانی کشادہ، ابرو سیاہ اور کسی قدر گھنے، آنکھیں کالی، روشن اور نہایت ذہین تھیں۔ چھوٹی سی ناک، چھوٹا سا دہانہ، بھنچے ہوئے ہونٹ، وہ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر جو ذہانت اور عقلمندی جھلکتی تھی وہ اس کے وجود کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ایک پرکشش انفرادیت تھی جو ہر ایک سمجھ بوجھ والے انسان کو کچھ دیر کے لئے متوجہ کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

کالج میں نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پرنسپل سے اپنے حقوق منوائے جا رہے ہیں۔ کالج کے سٹاف اور طالبات میں ٹھن گئی ہے۔ ماحول میں تناؤ اور کھنچاؤ کی کیفیت ہے۔ لیکن دو ٹوک بات کرنے کی کسی میں جرأت نہیں۔ ایسے میں جہاں آرا پیش پیش ہے۔ پرنسپل کے دفتر میں جہاں آرا کا وفد موجود ہے۔ اس کی تیز، شفاف اور غیر جذباتی آواز گونج رہی ہے۔ وفد کے ارکان میں سے کبھی کبھار ایک دو اور دبی دبی سی آوازیں بھی سنائی پڑ جاتی ہیں۔ بے ربط سے جملے بول دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں آرا کا سا گمبھیر انداز کہاں۔ پرنسپل قائل کر رہی ہیں۔ نرمی سے، محبت سے اور کبھی کبھی پیشہ ورانہ رعب اور دبدبے سے بھی۔ لیکن جہاں آرا ہے کہ ذرا ادھر نہیں پڑتی۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتی۔ پھر ان سب باتوں میں گستاخی کا عنصر کہیں نہیں ہے۔ ایک باوقار لہجہ ہے۔ ایک جوان ولولہ ہے۔ ایک دل آویز شخصیت ہے۔ سب متاثر ہو جاتے ہیں جہاں آرا سے۔ کھیل کا میدان ہے۔ جہاں آرا بجلی بن کر کوند رہی ہے۔ ایک پارہ ہے کہ تڑپ رہا ہے۔ پھر چہرے پر غرور کی جھلک نہیں۔ ایک انکساری ہے ایک سادگی ہے لیکن خود اعتمادی سے مملو۔

مباحثوں میں جہاں آرا کی وجہ سے دوسرے اداروں کی ٹرافیاں آ رہی ہیں۔ انعامات مل رہے ہیں۔ تعلیمی دوڑ میں پوری کلاس میں اول۔ استاد ہیں تو وہ جہاں آرا پر مفتون۔ طالبات ہیں تو انہیں جہاں آرا پر ناز۔ پھر اس کی موہ لینے والی سادگی! اسید ھے سادے انداز میں بنائے ہوئے بھورے

بال، سفید وائل کی رنگین باڈر والی ساری۔ معمولی سوتی بلاؤز۔ چہرہ مصنوعات سے بالکل پاک۔ البتہ کپڑے بغیر شکن کے۔ کلف لگی کھڑکھڑاتی ساری جوتے پالش کئے چمکیلے ——— صاف، سادہ اور باوقار۔

کالج میں کوئی تقریب ہو، جہاں آرا سب میں پیش پیش ہے۔ ڈرامے لکھ رہی ہے۔ ڈائرکٹ کر رہی ہے لیکن خود حصہ نہیں لے رہی ہے۔ طالبات تقریب کے لئے نئے نئے ڈیزائن کے لباس تیار کر رہی ہیں۔ رنگا رنگ کے پروگرام مرتب ہو رہے ہیں۔ رنگین آنچل لہرا رہے ہیں۔ ریشمین ملبوس سرسرا رہے ہیں۔ خوشبوؤں کا سیلاب امڈ آیا ہے۔ لیکن جہاں آرا جو تقریب کی روح رواں اور ڈراموں کی جان ہے، بدستور سفید سوتی لباس پہنے مسکراتی پھر رہی ہے، دوڑ رہی ہے اور دوڑ دوڑ کر کام کر رہی ہے۔ اپنے ریشمین کپڑے اس نے ان لڑکیوں کو بانٹ دیئے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

میں جہاں آرا کے پیچھے پڑی ہوں۔ "تم خدا کے لئے یہ جوگ اتارو۔ کوئی کام کے کپڑے پہنو۔ کہو تو میں تمہاری الماری سے کوئی کپڑے نکالوں۔" وہ کھلکھلا کر ہنس رہی ہے۔ "نہیں بھئی خدا کے لئے نہیں۔ ریشمی کپڑوں میں مجھے اپنی شخصیت بدلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں دب جاتی ہوں۔ کچھ گھٹن کا سا احساس ہوتا ہے۔ لیکن دوسروں کو بنا سنورا دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوتی ہے۔ اس دنیا کے رنگ کو پورا کرنے کے لئے ایک میں بھی سہی۔ میرا رنگ بھی سہی۔"

وہ سب میں مل کر بھی سب سے الگ ہے۔ اسے کسی سے جلن نہیں۔ کسی سے حسد نہیں۔ وہ کیوں کسی سے جلے اور حسد کرے۔ وہ نہ سمجھتے ہوئے بھی سمجھتی ہے کہ اخلاقی بلندی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

ہوسٹل میں کوئی بیمار ہو۔ جہاں آرا تیمارداری کر رہی ہے۔ کوئی غمگین ہے، جہاں آرا اسے ہنسا رہی ہے۔ کوئی تنہا ہے۔ جہاں آرا اس کی دمساز ہے۔

یہی جہاں آرا میری گہری دوست تھی۔ ہم ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ہم جماعت تھے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ میں جو ایک اوسط درجے کی طالب علم تھی، کچھ شرمیلی بھی تھی اور کسی میدان میں جہاں آرا کے ساتھ قدم نہیں ملا سکتی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے میری شخصیت پر پردہ سا پڑا رہتا۔ اس تمام ذہنی تضاد کے باوجود کوئی قدر ہم میں ایسی مشترک تھی جس نے ہم دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا۔ اب سوچتی ہوں کہ شاید وہ سادگی اور خلوص کی قدر تھی۔

بی۔ اے کرنے کے بعد میری شادی کر دی گئی تھی اور میں آزادی کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ کراچی آ گئی۔ چند برسوں تک ہم میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس نے ایم۔ اے کیا پھر وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے انگلستان چلی گئی تھی اور خطوط کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اتنا میں نے ضرور سنا تھا کہ وہاں بھی اس نے بڑی شاندار کامیابی حاصل کی تھی اور نوکری کر لی تھی اور وہیں پر اس نے کسی پاکستانی صاحب سے شادی بھی کر لی تھی۔

اور آج میں جہاں آرا سے پچیس سال کے بعد مل کر واپس آ گئی ہوں۔ یہ سب ایک طویل داستان ہے کہ اتنے سال ہم کیوں نہ مل سکے۔ زمانے کے اتفاق اور زندگی کے تقاضے راہوں کی سمتیں بدلتے رہتے ہیں۔ وہ انگلستان کافی مدت رہنے کے بعد لاہور آ گئی تھی اور وہاں ایک سرکاری دفتر میں نہایت ذمہ دار عہدہ پر فائز تھی۔ جب مجھے کسی نہ کسی طرح اس کا پتہ معلوم ہوا تو میں نے اسے فوراً خط لکھا۔ خط لکھتے ہوئے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عمر رفتہ کو آواز دے رہی ہوں۔ وہاں سے فوراً جواب آیا۔ سیدھا سادا، پر خلوص اور بناوٹ سے دور، کہیں

بھی انگریزی کی چھاپ نہ تھی۔ لب و لہجہ صاف شفاف اردو کا تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ اس عورت کا خط ہے جو مدتوں باہر رہی ہو۔ میرے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا۔ اس کی قابلیت، لمبی لمبی ڈگریوں اور شاندار تعلیمی ریکارڈ سے میں بوکھلائی ہوئی تھی کہ خدا جانے اب اس عورت سے میں کوئی ذہانت کا جملہ بھی بول سکوں گی یا نہیں لیکن اس کے جواب نے سارے شکوک رفع کر دیئے۔

ایک دو خط اور آئے۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ سوائے اس کے کہ "آن ملو۔" میرے شوہر نے جب میری اتنی بے تابی دیکھی تو انہوں نے مجھے لاہور جانے کے لئے اکسایا۔ ویسے بھی مجھے تبدیلی کی ضرورت تھی۔ ہانڈی اور ڈوئی کے چکر سے تنگ چکی تھی۔ جہاز میں سیٹ روک لی گئی۔ جہاں آرا کو اطلاع دی گئی اور میں اپنے شوہر اور تینوں بچوں کو کراچی ایئرپورٹ پر مسکرا مسکرا کر ہاتھ ہلاتے دیکھتی دیکھتی لاہور کی طرف اڑ گئی۔ مارچ کی خوب صورت صبح نے لاہور میں میرا استقبال کیا۔ ہواؤں میں خوشبو بسی تھی اور پتے پتے پر بہار تھی۔ صبح کے اجالے میں زندگی کے دکھوں کے داغ نہ تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر آئی جہاں آرا وہاں موجود تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ایک لڑکا، ایک لڑکی۔ میں نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وقت کے نقوش اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ کہاں اٹھارہ بیس سال کی نوجوان لڑکی اور کہاں پینتالیس کی ادھیڑ عورت۔ بالوں میں سورج کے تار چمک رہے تھے۔ آنکھوں کے کناروں پر ایک دو جھریاں تھیں۔ چہرے پر وقت کے نشان تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ میں اسے پہچان نہ سکوں۔ وہی شان تھی۔ چوٹی کے بجائے بالوں کا سادہ جوڑا تھا۔ صاف ستھری سفید سوتی ساڑھی تھی۔ سفید بلاؤز تھا۔ چہرہ اب بھی تمام لوازمات سے پاک تھا۔ جسم قدرے فربہ ہو گیا تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ ناگوار گزرے۔ چہرے پر تبسم اور سنجیدگی کا امتزاج تھا۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔ میں نے اپنے آنسو بمشکل روکے۔ اس نے بڑی شفقت سے میرا ہاتھ تھاما پھر اپنے دونوں بچوں سے میرا تعارف کروایا۔ لڑکا انیس سال کا تھا اور لڑکی اٹھارہ کی۔ ان دونوں کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ ان میں مجھے بناوٹ کی جھلک نظر آئی۔ ان کے لباس میں بھی نفاست سے زیادہ بھڑکیلا پن تھا۔ انہوں نے جس انداز سے مجھے دیکھا اس میں اجنبیت تھی، کچھ تکبر سا تھا اور مجھے قدرے تمسخر سا بھی محسوس ہوا۔ انہوں نے خاصی سرد مہری سے مجھے سلام کیا۔ اس میں خلوص کی سادگی اور جذبے کی گرمی نہ تھی۔ کھنچے کھنچے دیئے ان بچوں کا رویہ تھا۔ لیکن میں نے اسے کچھ جدید تہذیب کے تقاضے سمجھ کر اور کچھ جہاں آرا کی گہری دوستی کے جذبے کے تحت نظر انداز کیا۔ جہاں آرا ہنستی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھی۔ میرا سامان رکھوا دیا گیا۔ وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے برابر بیٹھی۔ دونوں بچے پیچھے بیٹھ گئے۔

جہاں آرا نے ہنستے ہوئے کار اسٹارٹ کی۔ "ہاں تو کہو اب ہم کہاں سے اپنی داستان چھیڑیں؟" اس نے زندہ دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"جب آتش جوان تھا" میں نے برجستہ جواب دیا۔ "اس لمحے سے اپنی داستان سناؤ۔ جب تم وقت کے پردوں میں گم ہو گئیں اور میں تمہیں تلاش کرتے کرتے اپنی زندگی کی راہوں میں کھو گئی۔"

"بہت خوب۔" وہ پھر ہنسی "ارے ابھی تک تم تو ویسی ہی ہو۔ وہی نرمی اور گرمی اور سادگی۔"

"تم بھی تو نہیں بدلی ہو جہاں آرا۔"

"قانون قدرت اٹل ہے دوست۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "جو لوگ بدل جاتے ہیں وہ فطرت سے بغاوت کرتے ہیں۔"

اسی طرح کی نوک جھونک، بے تکی باتوں، ننھے منے فلسفوں کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے ہم ایک چھوٹے، لیکن خوشنما بنگلے کے اندر

داخل ہو گئے۔ اس تمام عرصے میں جہاں آرا کے بچوں نے ہماری باتوں میں بالکل مداخلت نہیں کی۔ وہ یا تو خاموش رہے یا ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور وہ جب بھی بولے انگریزی میں بولے۔

ہم گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ میں تجسس اور شوق میں چاروں طرف نگاہ دوڑا کر جہاں آرا کے شوہر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن مجھے کسی ایسے آدمی کا وجود نظر نہیں آیا جو جہاں آرا کا شوہر نظر آتا ہو۔ البتہ ایک نوکر ضرور نمودار ہوا جس نے میرا سامان اتروایا۔ گھر میں ایک چھوٹا لان تھا۔ لیکن وہ خاصہ بے پرواہی کا شکار نظر آتا تھا۔ گھاس کہیں کہیں جلی ہوئی تھی۔ کہیں ضرورت سے زیادہ لمبی تھی۔ پودے غفلت کا شکار ہونے کے باعث بجھے بجھے افسردہ سے تھے۔ گملوں کے رنگ میلے اور پھیکے تھے۔ پھولوں پر رنگ و روپ اور خوشبو کے بجائے یتیمی برس رہی تھی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی مجھے اپنی روح بوجھل محسوس ہونے لگی۔ دل کو جیسے کسی غم نے نوچ لیا۔ گھر میں کچھ کمی تھی۔ کس چیز کی کمی تھی معلوم نہیں ہو سکا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ مجھے میرا کمرہ دکھایا گیا۔ صاف ستھرا تھا۔ لیکن اس کا تاثر کچھ خوشگوار نہ تھا۔ ڈرائینگ روم سادہ طریقے سے آراستہ تھا۔ بلکہ سپاٹ طریقے سے سونے کے دیگر دو کمرے جو ایک بچوں کا تھا اور ایک جہاں آرا کا کچھ عجیب طرح کی بدنظمی کا شکار تھے۔ کمروں میں سامان بے ترتیبی سے پھیلا ہوا تھا۔ مسہری پر کپڑوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ سنگھار میز پر دھول اٹی ہوئی تھی۔ کتابیں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف گلدان کے پھول مرجھائے ہوئے حسرت سے تک رہے تھے۔ میرا دل اندر سے رو رہا تھا۔ یہ کیا ہو گیا ہے جہاں آرا کو۔ کیا جہاں آرا بیوہ ہو گئی ہے؟

میں خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ جہاں آرا کی شگفتہ آواز مجھے اپنے قریب سے سنائی دی۔ "نہیں میری دوست جہاں آرا بیوہ نہیں ہوئی ہے۔ حیران مت ہو۔ میں انسان کی فطرت کو سمجھتے ہوئے بھی زندگی کی گتھی کو سلجھا نہیں سکی۔ تمہارے نقطہ نظر سے زندگی کی بازی میں نے ہار دی ہے۔"

"کیا مطلب؟" یہ رات کا وقت تھا۔ اب ہم کھانے سے فارغ ہو کر باہر لان پر آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ گو چاندنی چٹکی تھی۔ لیکن رات بوجھل بوجھل گراں گراں تھی۔ وہ صبح امید شام غم میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جہاں آرا کے بچے اندر اپنے اپنے امتحانوں کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہم دونوں دوست تنہا تھے۔ ایک پراسرار سا سناٹا فضا میں سانس لے رہا تھا۔

"شوکت برا آدمی نہیں تھا۔ لیکن ہم دونوں کی طبیعت میں جو زبردست تضاد تھا۔ اس نے ہم دونوں کی سمتیں بدل ڈالیں۔" جہاں آرا کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں کوئی درد نہ تھا کوئی دکھ نہ تھا۔ ایک عجیب سپاٹ اور سادہ سی آواز تھی۔ "بیس سال پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ شوکت آکسفورڈ میں میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دونوں کے خیالات بظاہر بہت ملتے تھے۔ دونوں ایک ہی انداز سے سوچتے تھے۔ کسی بات پر اختلاف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ہم دونوں کی برابر عزت تھی۔ دونوں کا تعلیمی ریکارڈ بہترین تھا۔ جب ہم ساتھ دیکھے جانے لگے تو کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ ہمارے انگریز دوست بھی ہم دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر انہیں تکمیل کا احساس ہوتا تھا وہ بھی ایک شاندار زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ میں بھی ایک اعلیٰ تعلیمی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہو۔ اس کے نام کے آگے ڈگریوں کی قطار ہو۔ اونچے عہدے پر فائز ہو اور بڑی بڑی کانفرنسوں اور مجلسوں میں وہ دونوں میاں بیوی سب سے پیش پیش رہیں۔"

اس نے قدرے رک کر پوچھا "بور تو نہیں ہو رہی ہو۔"

"نہیں تو۔ میں تو ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"میں ان طویل برسوں کو مختصر الفاظ میں مقید کروں گی۔ تم خالی جگاہوں کو خود ہی بھر لینا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ہماری شادی ہو گئی۔"

"محبت کی شادی؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا "محبت کی نہیں، دماغ کی شادی۔ شادی کے کچھ عرصے تک تو ہم لوگ خوش رہے۔ نہ شوکت نے میرے کسی پروگرام میں خلل ڈالا۔ نہ میں نے اس کے کاموں میں مداخلت کی۔ لیکن رفتہ رفتہ شوکت گم رہنے لگا۔ وہ اکثر کھویا کھویا اور تھکا تھکا نظر آنے لگا۔ میں نے جب ایک روز وجہ پوچھی۔ تو وہ تلخی سے مسکرا کر بولا۔ "جہاں آرا تم برا نہ ماننا۔ لیکن ہم دونوں کی مسلسل مصروفیات نے زندگی کا لطف ختم کر دیا ہے۔ میں جب تھکا ہوا گھر آتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ تم گھر پر موجود ہو۔ گھر کی ہر چیز میرا استقبال کر رہی ہو۔ گھر صاف ستھرا ہو۔ چائے تیار ملے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ جب گھر پہنچتا ہوں تو تم خود اکثر گھر نہیں پہنچی ہوتی ہو۔ گھر کی ہر چیز ویران اجاڑ نظر آتی ہے جب خود چائے تیار کرنی پڑتی ہے تو شادی کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ اس کا مقصد ہی فوت ہوتا دکھائی دیتا ہے۔" میں یہ سن کر ششدر رہ گئی۔ یہ شوکت کو کیا ہو گیا۔ اس پر بھی جاہل مردوں کی طرح شوہریت سوار ہو چکی تھی۔ پھر بھی میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "تو پھر شوکت تم کیا چاہتے ہو؟" "یہ چاہتا ہوں کہ تم نوکری چھوڑ کر گھر پر رہو۔" میرے اوپر جیسے بجلی گر پڑی۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے شوکت۔ تم اپنے نظریوں سے پھرتے جا رہے ہو۔" وہ بولا "فطرت انسان کو زندگی کے بہت سے درس دیتی ہے۔ مجھے اپنے سوچنے کا انداز بدل لینا پڑا ہے۔" بہرحال یہ نہ ہو سکا۔ میں صرف حصول علم کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ میری فطرت گھر بیٹھنے سے بغاوت کرتی تھی۔ میری عمر بھر کی ریاضت، تعلیمی دوڑ میں سب سے سبقت لے جانے کی عظیم کوشش اور بھرپور تعلیمی کامیابیاں شادی کے آستانے پر آخر کیسے دم توڑ دیتیں۔ کیا آپ سورج سے گرمی اور پھول سے خوشبو چرا سکتے ہیں۔ نہیں۔ اسی طرح جہاں آرا اور کتابیں لازم و ملزوم تھیں۔ شوکت نے یہ سب کچھ جانتے بوجھتے مجھ سے شادی کیوں کی۔ اسے ایک سیدھی سادی گھریلو بیوی کی ضرورت تھی تو میری راہ کیوں روکی؟ میں تو شادی نہ کرنے کا تقریباً عہد کر چکی تھی۔

اس نے شادی سے پہلے اپنی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔" اس کی آواز میں قدرے سختی تھی۔

"تم کو شوکت سے شاید محبت نہیں تھی۔ اگر تمہیں اس سے محبت ہوتی تو تم اس پر سب کچھ قربان کر دیتیں۔"

"مجھے شوکت سے نفرت بھی نہیں تھی۔ محبت اور نفرت دونوں بڑے طوفانی جذبے ہیں مجھے تو وہ پسند تھا۔ مجھ میں محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ ہم دور ہونے لگے۔ وہ دھیمے لہجے میں مجھ پر اکثر اعتراض کرتا۔ گھر کے ماحول کو بے کیف بتاتا۔ گھر کی آرائش کو بے جان کہتا۔ میرے لباس کو بے رنگ خیال کرتا جب ظفر پیدا ہوا تو لندن کی زندگی میں چھوٹے بچے کے ساتھ نوکری کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام معلوم ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح بچے کو نرسری میں چھوڑ چھوڑ کر میں کام پر جاتی رہی۔ شوکت کو بچے سے بہت محبت تھی۔ آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ شوکت بالکل دیسی انداز میں بچے کو بگاڑتا اور گنواروں کی طرح لاڈ کرتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے ظفر سے محبت نہیں ہے۔ آخر کون ماں اپنے بچے سے محبت نہیں کرے گی۔ ہاں میں بچے کے ساتھ مل کر بے ہنگم قہقہے نہیں لگا سکتی تھی۔ اس سے بے جا لاڈ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک تو مجھے فرصت نہیں تھی۔ دوسرے تم جانتی ہو کہ میری افتادِ طبع اس قسم کے چونچلوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں اگر مامتا کے جذبے کا اظہار کرنا بھی چاہوں تو کر نہیں پاتی ہوں۔ میں جذبات کے اظہار سے عاری ہوں۔ شوکت اور میں بظاہر کبھی نہیں لڑے ہم میں جاہل میاں بیوی کی طرح کبھی تو تو میں میں نہیں ہوئی۔ وہ بھی بڑے نپے تلے انداز میں بات کرتا اور میں بھی بڑے ٹھنڈے لہجے میں اس کی باتوں کا جواب دیتی۔ لیکن ایک خلیج تھی جو حائل ہوتی جا رہی تھی۔ پردے تھے جو پڑتے جا رہے تھے۔ اب ہم بہت کم ایک دوسرے سے بات کرتے

وہ موضوع جن پر ہم گھنٹوں بغیر ستائے بولتے رہتے تھے۔ اب یا تو ختم ہو گئے تھے یا شوکت کو اب اونچی اونچی باتوں سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک عام معمولی مرد کی دماغی سطح پر آ گیا تھا جسے عمدہ کھانے، صاف ستھرا گھر، گول مٹول ہنستے مسکراتے بچے اور ایک سیدھی سادی تابعدار اور فدوی قسم کی بیوی کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کے باوجود گھر کے ماحول کو خوشگوار بنانے کی اپنی طرف سے کافی کوشش کی۔ لیکن میں نے جو کام کرنا چاہا وہ بگڑ جاتا۔ کھانا پکاتی تو وہ مزے کا نہ بن پاتا۔ گھر کی صفائی کرتی تو اس میں بھدا پن پیدا ہو جاتا۔ بچوں کو بہلاتی تو وہ اور چیخ چیخ کر زمین و آسمان ڈھا دیتے۔ میں پریشان گھبرائی گھبرائی پھرتی۔ ایسے میں شوکت ایک طنز بھری مسکراہٹ لئے ہوئے آتا۔ ہر چیز کو قاعدے سے لگاتا۔ بچوں کو کچھ ایسی خوبی سے سنبھالتا کہ وہی چیختے چلاتے بچے ہنستے مسکراتے اس کے کندھوں پر سوار ہو کر مجھے منہ چڑاتے ہوئے معلوم ہوتے اور میں کھسیا جاتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں نے شوکت سے شادی کر کے کوئی جرم کیا ہے۔ اب ہمارے دو بچے تھے۔ شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے۔ بچے نستم پشتم پل رہے تھے۔ دونوں بچے ظفر اور نازلی باپ سے مانوس تھے۔ مجھ سے وہ کچھ جھینپتے تھے۔ بچے باپ کے ساتھ بیٹھے دیوانہ وار قہقہے لگا رہے ہیں اور میں جہاں کمرے میں داخل ہوتی ایک دم ہنسی کا فوارہ رک جاتا۔ بچے شرما جاتے اور شوکت سختی سے ہونٹ بھینچ لیتا۔ ایسا کیوں تھا میری دوست۔ میں سمجھ نہیں سکی۔ میں اپنے بچوں کے قہقہوں میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ لیکن کوئی چیز اندر سے مجھے روک دیتی تھی۔ میں ایسا کر نہیں پاتی تھی۔ آخر یہ زندگی کب تک گزرتی۔ اس کا انجام وہی ہوا جو ہونا تھا۔ شادی کو آٹھ سال گزر گئے تھے کہ شوکت بولا "جہاں آرا کاش ہم دونوں صرف دوست رہتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہم دونوں میاں بیوی بننے کے قابل نہیں تھے۔" میں نے بھی رنج سے کہا "شوکت مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں خوشی نہیں دے سکی۔ میری غلطی تھی کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔" وہ بے حد نرمی سے بولا "نہیں جہاں آرا یہ غلطی تمہاری نہیں تھی۔ میری تھی نہ تم نے مجھے غلط سمجھا۔ نہ میں نے تمہیں۔ اصل میں میں نے اپنے آپ کو غلط سمجھا تھا۔ تم تو وہی ہے۔ تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تم نے جان بوجھ کر میرے ساتھ کوئی برائی بھی نہیں کی ہے۔ میرا ہی نظریہ حیات بدل گیا ہے جہاں آرا۔" وہ اس وقت بڑا افسردہ تھا اور میں بھی اس کے لئے رحم محسوس کر رہی تھی۔ آخر پھر وہ بولا "جہاں آرا مجھے تم بہت پسند ہو۔ میں تمہیں کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ زندگی جو انسان کو صرف ایک مرتبہ ملتی ہے بجھاب کھینچی کھینچی نظر نہیں آتی آؤ دوست ہم وہیں لوٹ جائیں جہاں سے ہم نے یہ زندگی شروع کی تھی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن میں پرسکون تھی۔ نہ ہلچل تھی، نہ طوفان تھا نہ اضطراب جیسے کوئی مسافر چلتے چلتے پگڈنڈی بدل ڈالے۔ بس کچھ اس قسم کا احساس تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ آٹھ سال کی رفاقت پل بھر میں ختم ہو رہی تھی لیکن مجھے کچھ ایسا زیادہ رنج بھی نہ تھا۔ جس قرب میں دوری ہو اس کو لاکھوں سلام۔ علیحدگی کے بعد میں ایک اور فلیٹ میں چلی گئی جو شوکت کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ بچے شوکت ہی کے پاس رہتے تھے۔ میرے پاس بھی آتے۔ لیکن شاید باپ کے مجبور کرنے پر۔ ایسے آتے جیسے کسی اجنبی کے پاس آئے ہوں۔ مجھ سے بات کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی موضوع نہ ہوتا۔ شرمائے شرمائے خاموش بیٹھ کر چلے جاتے۔ انہیں بچوں کی زبان باپ کے سامنے ایک لمحے کو نہیں رکتی تھی۔ بے معنی لطیفے، چٹکلے، قہقہے اور قصہ کہانیوں کی بھرمار سی پڑتی رہتی اور شوکت بھی انہیں کی ذہنی سطح پر آ کر دیوانہ وار قہقہے لگاتا۔ اس قدر تعلیم یافتہ شوکت، کئی عمدہ کتابوں کا مصنف، مانا ہوا ماہر تعلیم یہ سب کیسے کر پاتا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ زندگی کے دو سال یوں بھی گزر گئے۔"

جہاں آرا خاموش ہو گئی۔ میرے دل میں غم کا ایک طوفان تھا جو پھوٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ میری عظیم دوست قدرت نے اتنا اعلیٰ دماغ دے کر کہیں تیرے ساتھ ناانصافی تو نہیں کی۔ میں نے پھر پوچھا "تو پھر شوکت نے دوسری شادی کی؟"

"ہاں کی۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیا کسی انگریز عورت سے؟"

وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی "کمال کرتی ہو بیٹی۔ کیا وہ آسمان سے گر کر کھجور پر اٹکتا۔ وہ مغرب میں زندگی بسر کرنے والا شخص خالص مشرقی دل رکھتا تھا۔ ہماری علیحدگی کے دو سال بعد وہ پاکستان چھٹی پر آیا اور اس نے اپنے رشتے کی بہن سے شادی کر لی۔ وہ ایک عام گھریلو لڑکی تھی۔ سیدھی سادی، میٹرک پاس، نہایت تابعدار اور خاموش سی۔ شادی کے بعد اسے لے کر وہ لندن آ گیا۔"

"اور تمہیں افسوس تو ہوا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"افسوس کیوں ہوتا۔ یہ تو قدرتی نتیجہ تھا۔ وہ زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا چاہتا تھا۔ بچے چند ماہ میرے پاس رہنے کے بعد پھر باپ کے پاس چلے گئے۔ انہوں نے بڑے ضبط اور حوصلے سے نئی زندگی کو قبول کر لیا تھا۔ شوکت کی نئی بیوی اس کے معیار پر پوری اتری۔ وہ شوکت کے اشاروں پر چلتی تھی اور شاباش ہے اس عورت کو کہ اس نے بچوں کے بھی دل جیت لئے۔ اسی طرح ایک سال اور گزر گیا۔ میری طبیعت ایک دم لندن سے بیزار ہو گئی۔ میرے زیادہ تر عزیز پاکستان آ چکے تھے مجھے اپنا وطن یاد آیا۔ اپنے عزیزوں کا خیال آیا اور آخر کار میں نے پاکستان آنے کا ارادہ مصمم کر لیا۔ اس وقت ظفر دس سال کا تھا اور نازی کا عمر نو سال تھی۔ جب شوکت نے میری واپسی کا پروگرام سنا تو اسے بہت رنج ہوا۔ اسے بچوں کا خیال تھا۔ بہر حال میں اس کے بچوں کی ماں تھی اور اسے معلوم تھا کہ میں اپنے خشک طریقے سے بچوں سے محبت بھی کرتی ہوں۔ میری زندگی ہمیشہ نہایت سادہ رہی۔ شان و شوکت سے تم جانتی ہو کہ مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میری آمدنی کافی تھی۔ اپنا ذاتی خرچ نکال کر میرے پاس جو کچھ بھی بچتا میں بچوں کے نام جمع کرا دیتی تھی اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بچے میرے ساتھ جائیں گے۔ شوکت نے جب سنا تو بہت پریشان ہوا۔ اسے بچوں سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ میں نے اس سے کہا "میں جانتی ہوں کہ تمہیں ان سے محبت ہے اور وہ بھی میری نسبت تم سے مانوس ہیں لیکن میں ان سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی۔ تمہارا کیا ہے شوکت۔ تمہارے پاس نئی جوان بیوی ہے۔ تم دوسرے بچوں کے باپ بن سکتے ہو لیکن میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں رہا۔" شوکت گم سم مجھے تکتا رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور گہرا غم تھا۔ وہ بڑے کرب سے بولا "جہاں آرا مجھے تم کتنی پسند ہو۔ میرا دل اب بھی تمہارے لئے روتا ہے۔ کاش ہم دونوں ایک ساتھ زندگی گزار سکتے۔ میں جب بھی تمہارا، تمہاری تنہا زندگی کا خیال کرتا ہوں تو اپنے آپ کو گناہ گار محسوس کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں جہاں آرا کہ یہ میری خود غرضی تھی جس نے ہم دونوں کو جدا کر دیا۔ اس احساس سے جو ذہنی اذیت مجھے ہوتی ہے اس کا اندازہ نہ تم لگا سکتی ہو نہ میں بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں آرا ....." اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر میری بیوی جوان ہے تو تم بھی تو جوان ہو۔ تم بھی دوسری شادی کر کے نئے بچوں کی ماں بن سکتی ہو" .... "یہ خیال بھی بے کار ہے۔" میں نے ہنس کر کہا جب تم جیسے بہترین انسان کے ساتھ میں نہ رہ سکی تو کسی اور کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تم تو وہ مرد ہو جس کی ہر عورت تمنا کرتی ہے شوکت۔" شوکت نے مجھے چونک کر بھرپور انداز میں دیکھا۔ "تو پھر تم نے میرا ساتھ کیوں نہیں دیا؟" "یہ میری قسمت ہے۔" پھر ہم دونوں خاموش رہے۔ نیک دل شوکت اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر بچوں کو میرے ساتھ بھیجنے پر تیار ہو گیا۔ بچے گو باپ سے مانوس تھے۔ لیکن حیرت انگیز حد تک باپ کے فرمانبردار تھے شوکت نے ان سے کہا کہ وہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں انہیں لندن بلایا کرے گا۔ انہیں ممی کے پاس رہنا چاہیئے کیونکہ ممی تنہا ہیں۔ اور ان سے کہا کہ ممی کا کہنا ماننا۔ کبھی انہیں تنگ نہ کرنا۔ ان کا بہت خیال رکھنا۔ میں شوکت کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی اس نے اپنے بیٹے میں

جذبات کا جوار ابھی دبائے رکھا لیکن مجھے تکلیف نہیں دی۔ وہ ایک بڑا انسان ہے۔ وہ ایک عظیم شخصیت ہے۔ ۔ ۔ ۔"

جہاں آرا خاموش ہو گئی۔ رات کافی گزر گئی تھی۔ ہر طرف سکوت تھا۔ میرا دل بہت بھاری تھا۔ جہاں آرا بھی افسردہ تھی۔ فضا کچھ عجیب پراسرار سی ہو رہی تھی۔ آخر میں نے کافی دیر بعد بہت آہستہ سے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہوتا؟ وہی ہوا جس کا میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ میں بچوں کے ساتھ پاکستان آ گئی۔ یہاں مجھے کافی جلدی نوکری مل گئی۔ بچوں کو اسکولوں میں داخل کروا دیا۔ اب مجھے یہاں آئے ہوئے بھی نو سال گزر گئے ہیں۔ زندگی کا سفر جاری ہے۔ اس عرصے میں بچے چار دفعہ لندن جا چکے ہیں۔ شاید وہ دل میں مجھ سے کچھ شاکی ہیں۔ میں بھی اب سوچتی ہوں کہ شاید میں نے انہیں پاکستان لا کر غلطی کی۔ بچوں کے پاس شوکت کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں۔ ہر خط میں مجھے بھی سلام اور دعائیں بھیجتا ہے۔ اس کے بھی دو بچے اب اور ہیں۔ اس کی بیوی بھی اکثر بچوں کو خط لکھتی رہتی ہے۔ باقی تم خود سب کچھ دیکھ لینا۔"

جہاں آرا کی یہ داستان سن کر مجھے جس قدر ملال ہوا میں بیان نہیں کر سکتی۔ تمام رات میں بستر پر کروٹ بدلتی رہی۔ یہ وہی جہاں آرا تھی جس نے زندگی کے کتنے مختلف میدان مارے تھے۔ جس نے کبھی ہار نہیں مانی تھی۔ جس نے شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ آج یہی عورت زندگی کی بساط میں صحیح مہرہ نہ چل سکی۔ اس نے زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار دی۔ شاید اب بھی وہ اپنی ہار کو اپنے اصولوں کی جیت سمجھتی ہے۔ وہ خوش ہے کہ اس نے اپنے اصولوں کی خاطر اپنی شخصیت کو نہیں بدلا۔

میری وجہ سے جہاں آرا نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ جب صبح ہوئی تو گھر میں عجب بدنظمی کا عالم تھا۔ بچے کالج جانے کے لئے ادھم مچا رہے تھے۔ نوکر ناشتے میں دیر کر رہا تھا۔ جہاں آرا کچھ پریشان سی کھڑی تھی۔ ظفر بی۔ اے آخری سال میں تھا اور نازلی پہلے سال میں۔ دونوں بچے خاصے ضدی اور خودسر معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے دل میں ماں کا کوئی لحاظ نہ تھا۔ وہ کافی چڑچڑے انداز میں ماں سے بول رہے تھے وہ گھر کے بے ہنگم نظام کے لئے ماں کو ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ ان کے دل میں گھر آئے ہوئے مہمان تک کا لحاظ نہ تھا۔ آخر خدا خدا کر کے ناشتہ ہوا اور وہ کالج چلے گئے۔ ظفر بہت حد تک ماں سے ملتا تھا۔ دونوں بچے اچھے خوب صورت تھے۔ نازلی شاید باپ سے ملتی تھی۔ نہایت ستھرا نقشہ تھا۔ رنگ بھی خوب صاف تھا۔ اگر چہرے پر کچھ چڑچڑے پن کے اثرات نہ ہوتے تو وہ ایک بڑی پیاری بچی کہی جا سکتی تھی۔

میرے شوہر نے مجھے ہنڈیا ڈوئی کے چکر سے نجات دینے کے لئے لاہور بھیجا تھا لیکن میں یہاں دوسرے چکروں میں الجھ گئی۔ میں نے سارا گھر صاف کروایا۔ جھاڑ پونچھ کی گئی۔ ہر چیز کو قاعدے سے جگہ پر رکھا گیا۔ گلدانوں میں تازہ پھول لگائے۔ میلے پردے بدلے۔ ڈرائنگ روم کو اس طرح آراستہ کیا کہ اس کا تاثر کچھ خوشگوار ہو گیا۔ جہاں آرا محبت سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری مدد کرتی رہی اور بار بار کہتی رہی "تم کتنی مکمل عورت ہو۔ مجھے بھی اگر خدا ایسی صلاحیتیں دیتا تو آج میری زندگی کچھ اور ہوتی۔ میں نے خانساماں سے بچوں کی پسند کی چیزیں پکوائیں۔ خود ساتھ لگی۔ سب کچھ تیار ہو گیا۔

جب بچے کالج سے آئے تو جیسے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان کی تکان دور ہو گئی۔ انہوں نے پہلی دفعہ مجھے نرمی سے دیکھا۔ ظفر نے شرماتے ہوئے کہا "آنٹی تم تو ہیرا ہو ایک"

میں نے ظفر کا ہاتھ محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا "مجھے خالہ کہو بیٹے۔ خالہ میں جو اپنائیت ہے وہ آنٹی میں کہاں؟"

"خالہ بھی" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

بچوں نے خوب نیت بھر کر کھانا کھایا۔ میز پر کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوئیں۔ صبح والی کوئی بدمزگی نہیں دہرائی گئی۔ ہر شخص اپنی جگہ مطمئن تھا۔ صرف ایک دن میں ان معصوم بچوں کا دل میں نے بدل دیا تھا۔ یہ محبت کے پیاسے بچے جو بظاہر کتنے بدتہذیب معلوم ہوتے تھے دل کے کتنے سیدھے اور نیک تھے۔

شام کو انہوں نے مجھے محظوظ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے رقص کے ریکارڈ لگائے اور میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر انگریزی ناچ کی مشق کرتے رہے۔

میں نے جہاں آرا سے کہا "تمہیں انہیں منع کرنا چاہیے"

جہاں آرا نے جواب دیا "یہ میرا کہا کب مانتے ہیں"

میں بھی خاموش رہی۔ وہ مجھے خوش کر رہے تھے۔ میں نے نیا نیا ان کا اعتماد جیتا تھا۔ میں انہیں ناخوش اور مشکوک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ رقص کے بعد نازلی نے پیانو پر ایک دو بڑی پیاری دھنیں بجائیں۔ اس رقص و موسیقی کی محفل کے بعد دونوں بچے میرے اردگرد آ کر بیٹھ گئے۔ دونوں شرما شرما کر مجھے دیکھتے رہے۔ دونوں اپنی کارستانیوں کی داد چاہ رہے تھے۔ میں نے دونوں کے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر کہا "تم دونوں کا تو کوئی جواب نہیں۔ تمہارا رقص مجھے بے حد پسند آیا لیکن مجھے اس وقت زیادہ خوشی ہوگی جب ظفر میں تمہیں اپنی دلہن کے ساتھ اور نازلی تمہیں اپنے دولہا کے ساتھ رقص کرتا دیکھوں۔ بہن بھائیوں کا رقص ہماری تہذیب میں پسند نہیں کیا جاتا"

دونوں بچے ایک دم بجھ سے گئے مجھے بھی ان کے حساس دل کو دکھانے سے صدمہ ہوا۔ لیکن بہرحال میں ایک غلط بات پر ان کی تعریف نہیں کر سکتی تھی۔

دوسرے دن شام کو دونوں بہن بھائی بن سنور کر نکلے۔ نازلی نے خاصہ عریاں لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے بازو کھلے ہوئے تھے۔ گلا ضرورت سے زیادہ نیچا تھا۔ دوپٹے کی پٹی بے نیازی سے گلے میں پڑی تھی۔ سنہری بالوں کو خوبصورتی سے سنوارا ہوا تھا۔ ظفر کا لباس بھی نہایت چست تھا۔ دونوں بہن بھائی موٹر میں گھومنے جا رہے تھے۔ ظفر جب سیٹی میں ایک انگریزی دھن بجاتا میرے پاس سے گزرا تو میں نے روک کر پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

"ایسے ہی ذرا ایک دو دوستوں سے ملنے ملانے"

"لیکن کیا تم نے ممی سے اجازت لے لی ہے؟"

دونوں بہن بھائی چونک کر مجھے دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی ایسی زبان بولی ہو جسے وہ سمجھتے نہ ہوں "اوہ خالہ" نازلی نے ناز سے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب پرانے فیشن کی باتیں ہیں۔ ہم ان باتوں پر یقین نہیں کرتے"

میں خاموش ہو گئی۔ ان کی بے راہ روی کی جڑیں بڑی گہری تھیں۔ ایک طویل ریاض کی ضرورت تھی۔ ایک دن کے کہنے سننے سے یہ لوگ قابو میں آنے والے نہیں تھے۔ وہ دونوں مجھے "ہائے بلے" کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

اگلے روز میں نے باغ کی دیکھ بھال اپنے ذمے لی۔ وہ مالی جو ایک گھنٹہ کے لئے برائے نام تشریف لاتا تھا اس کی خبر لی۔ جلے ہوئے پودے از سر نو چھٹوا کر ٹھیک کروائے۔ گملوں کی صفائی اور رنگائی کروائی۔ ضرورت سے زیادہ لمبی گھاس پر مشین چلوائی۔ لان کو اچھی طرح پانی دلوایا۔ خود

ساتھ لگی۔ چند گھنٹوں کی مشقت کے بعد باغ میں تازگی سی آ گئی۔ پھول زندگی کے نشے سے جھومنے لگے اور پودوں میں محبت و شفقت کے لمس نے جیسے نئی جان ڈال دی۔

جب ظفر اور نازلی گھر آ گئے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ دونوں نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرے گال چومے اور شام کو دونوں میرے دائیں بائیں گھس کر بیٹھ گئے۔ جہاں آرا کسی ضروری میٹنگ کے سلسلے میں باہر گئی ہوئی تھی۔ ظفر بڑے لاڈ سے بولا۔ "کاش خالہ تم میری اماں ہوتیں۔"

نازلی نے نخرے سے کہا "نہیں کاش میری اماں ہوتیں۔"

اس وقت میرا دل دکھ کے احساس سے بھاری ہو گیا۔ آنسوؤں کا بوجھ آنکھوں پر نہیں بلکہ دل پر محسوس ہوا۔ ان بچوں کے لئے جو نہ میرے تھے نہ میرا ان سے کوئی خونی رشتہ تھا۔ ایک عجیب مامتا کا جذبہ پیدا ہوا۔ عورت اور مامتا کا ازلی رشتہ ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو قدرت نے ازل سے ابد تک کے لئے عورت کے سینے میں محفوظ کر دی ہے۔ یہ دولت بغیر ختم ہوئے ہر جگہ اور ہر موقع پر خرچ ہوتی ہے۔ ایک ننھا سا زخمی پرندہ، ایک مرجھائی ہوئی کلی، ایک سوکھا ہوا پھول، ایک بیمار بچے کا کرب، ایک یتیم بچے کی بے کسی سے لے کر دنیا کے بڑے بڑے حادثے آئے دن کی جنگیں، خون اور آگ کے کھیل، جوان اور حسین سہاگنوں کی بیوگی، معصوم بچوں کی فریادیں، کڑیل جوانوں کی موت اور دوسرے ناگہانی حادثات ——— یہ سب وہ داغ ہیں جو عورت کے سینے میں محفوظ ہیں۔ یہ داغ احساس و شفقت کے سرچشمے ہیں۔ یہ غم واندوہ کے منبع ہیں۔ جن کے سہارے وہ جیتی ہے، جن سے وہ توانائی حاصل کرتی ہے۔ یہی اس کی طاقت ہے۔ اسی طاقت کے سہارے وہ دوسروں کو جینا سکھاتی ہے۔ میں نے محبت سے بچوں سے کہا "خالہ بھی ماں کے برابر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری ممی دنیا کی بہترین عورت ہے۔"

وہ دونوں خاموش سے ہو گئے۔ جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہوں لیکن مناسب جملوں کی تلاش میں ہوں۔ میرے دل میں ایک کسک تھی۔ وہ جہاں آرا جس کا مجھ سے کسی میدان میں مقابلہ نہ تھا آج اس کے اپنے بچے مجھے اپنی ماں پر ترجیح دے رہے تھے۔ کیا انسان کی دماغی عظمت کا انجام اتنا دردناک ہے؟ کیا یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں ہے؟ آخر ظفر بولا "خالہ" ممی نے ہمارے لئے کبھی کچھ نہیں سوچا۔ انہوں نے صرف اپنی ذات سے محبت کی۔ انہوں نے اپنی دلچسپیوں کی خاطر ہمیں ڈیڈی سے دور کر دیا۔ ڈیڈی کی اس قربانی کے باوجود وہ ہمیں خوش نہ رکھ سکیں۔"

"نہیں نہیں ایسا مت کہو ظفر پیارے۔" میں نے پیار سے کہا۔ "تم لوگ انہیں غلط مت سمجھو۔"

اس کے بعد میں نے مختصر لیکن موثر انداز میں جہاں آرا کے کالج کے قصے سنائے۔ اس کی پرکشش شخصیت کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ دونوں بچے دم بخود بیٹھے سنتے رہے۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ نازلی نے نیچے قالین پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا تھا اور ظفر میرے قریب بیٹھا کبھی میرے بازوؤں کو چھوتا کبھی میرے ہاتھوں کو تھپ تھپاتا۔ میں کہہ رہی تھی۔ "اب تم ہی بتاؤ کہ ایک ایسی ہستی جو ہر ایک کی غمگسار ہو۔ ہر ایک کی مددگار ہو۔ ہر لمحہ اور ہر گھڑی دوسروں کی خدمت کے لئے تیار ہو، کیا اپنے بچوں کے حق میں خود غرض ہو سکتی ہے؟ ایسا نہیں ہے پیارے بچو بلکہ ان کی فطرت کچھ ایسی ہے کہ لوگ انہیں غلط سمجھتے ہیں۔ وہ محبت کا اظہار کر نہیں پاتی ہیں۔ دیکھو تم لوگوں کی خاطر صبح سے شام تک دفتر کی خاک چھانتی ہیں۔ جو کچھ کماتی ہیں تم پر خرچ کرتی ہیں۔ وہ تھک جاتی ہیں۔ انہیں بھی سکون کی ضرورت ہے۔ کیا کبھی تم نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی؟ کیا نازلی کبھی تم نے گھر کے کاموں کو سنبھالا؟ کیا کبھی تم لوگوں نے انہیں کوئی تحفہ دیا؟ اور پھر کیا انہوں نے کبھی تم لوگوں سے تمہاری لاپرواہی کی

شکایت کی؟"

"اوہ ممی، پوئر ممی" نازلی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "واقعی ہم لوگ بڑے سنگدل ہیں۔ ہم نے ممی کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اوہ خدا مجھے معاف کر دینا" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنے کے بل بیٹھ کر عیسائیوں کے انداز میں دعا مانگنے لگی۔

ظفر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا کہ ایک دم پردہ ہلا اور جہاں آرا اندر آ گئی۔ دونوں بچے سٹ پٹا گئے۔ ظفر جھینپ گیا اور نازلی اٹھ کھڑی ہوئی پھر دونوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ جہاں آرا نے تعجب سے کہا "تم نے تو بھی کمال کر دیا۔ یہ بچے چند روز میں تم سے اتنے بے تکلف ہو گئے کہ مجھ سے آج تک نہیں ہوئے۔"

"اس کی وجہ یہ ہے جہاں آرا کہ تم نے کبھی ان سے کھل کر بے تکلف ہونے کی کوشش ہی نہیں کی۔ تم نے ان کے دل میں نہیں جھانکا۔"

جہاں آرا نے خاموشی سے جواب دیا "میں سب کچھ جانتی ہوں لیکن کر نہیں پاتی ہوں۔"

میں نے اپنی دوست کے ایماندار چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پاکیزگی تھی، روشنی تھی، چہرے پر سنجیدگی اور علم کی گھمبیرتا تھی۔ اس کے لباس میں ستھرا پن اور سلجھاؤ تھا۔ میرا دل دکھ گیا۔ کیا جہاں آرا کی تمام عمر کی نیکی، سچائی اور صداقت کا یہی انعام ہے؟ میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ میں دو ہفتے کے مختصر قیام کی حالات کو نہیں بدل سکتی۔ مجھے انسانی فطرت کا اندازہ ہے۔ میں ان بچوں کے جذباتی غم کو بھی جانتی ہوں مجھے معلوم ہے کہ ان بچوں کے دل میں اپنی کوتاہیوں کے احساس سے ایک خلش ضرور پیدا ہوئی ہے لیکن پھر زندگی ان کو اپنے رنگ میں رنگ دے گی۔ یہ ایسے ہی رہیں گے جیسا قدرت انہیں بنا رہی ہے۔ میرے کچھ میری پرخلوص نصیحتیں ایک وقتی تاثر چھوڑ کر پھر گمنامی کے پردوں میں گم ہو جائیں گی۔ ان کی صدائے بازگشت بھی یہ نہ سن سکیں گے۔ یہ انہیں راہوں پر چلیں گے جو ان کا مقدر بن چکی ہیں پھر بھی میں نے عزم کیا کہ میں ان مختصر دنوں کو کار آمد سے کار آمد بنا کر رہوں گی۔ میں ان پیاسی روحوں کو کچھ تو سکون دینے کی کوشش کروں گی۔

ظفر ایک نہایت ذہین لڑکا تھا۔ وہ انگریزی زبان کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ وہ چلتے پھرتے فی البدیہہ ایسے انگریزی اشعار کہہ جاتا کہ میں حیران رہ جاتی۔ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد لندن جانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ وہ وہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ وہیں بسنا چاہتا تھا۔ وہ اب باپ سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا تھا اور اسی قسم کا فیصلہ نازلی کا تھا۔ دونوں اس لمحے کے بے تابی سے منتظر تھے۔ جب وہ اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ان بچوں کا کوئی ملک نہ تھا۔ ماں باپ کی جدائی نے انہیں کسی واضح قومیت کا احساس ہی پیدا نہیں ہونے دیا۔ ان کی جڑیں نہ یہاں تھیں نہ وہاں۔ کوئی مضبوط بنیاد نہیں تھی جس کے سہارے وہ اپنے کردار کی تشکیل کر سکتے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت پیارے بچے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے میرے بچوں کے بارے میں سوال کرتے اور پھر کچھ ایسے سہم جاتے جیسے میرے بچے ان سے اعلیٰ ہیں مجھے ان کے اس احساس کمتری سے بڑا رنج ہوا۔ میں نے کہا "تم میں اپنی خصوصیات ہیں، ان میں اپنی۔ ظفر کا تو میرے بچے مقابلہ ہی نہیں کر سکتے۔ وہ تو بہترین شاعر ہے اور نازلی نہایت خوبصورت لڑکی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے ماتھے کی شکنیں تھوڑی کم کر دے۔"

تب ظفر میرے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر غنگین انداز میں انگریزی اشعار گنگنانا "جب میں خوشی کے تلاش میں نکلا۔ مجھے چاروں سو ویرانہ ہی ویرانہ نظر آیا۔ مدت بعد ویرانے میں میں نے ایک پھول دیکھا۔ اس نے مجھے خوش کر دیا۔ میری روح مسرت سے جھوم اٹھی۔ وہی پھول خوشی تھا۔ وہی پھول محبت تھی۔ وہی پھول زندگی تھا اور معلوم ہے وہ پھول اصل میں کیا تھا۔ میری خالہ کا دل!"

اوہ میرے خدا! میں کس طرح اپنے آنسو روکوں۔ کیا اتنا بڑا ہدیہ آج تک کسی نے مجھے پیش کیا ہے؟ کاش میرے بچے! میں تیرے لئے کچھ کر سکتی۔ کاش تیری زندگی کے ان خلاؤں میں روشنی کی کوئی کرن پیدا کر سکتی جہاں تقدیر نے تاریکی اور ویرانی پھیلا دی ہے۔ میں نے بمشکل تمام اپنے آنسو روکے۔ میں نے ظفر سے کہا "بیٹے زندگی ایک مسلسل امتحان ہے۔ ہر ایک کی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے مسائل حل کرنے پڑتے ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہے جو ہنسی خوشی اور ضبط و استقلال سے زندگی کی ہر گتھی کو کچھ ایسے سلجھائے کہ نتیجہ نکلے ـــ پاس! فرسٹ کلاس! دونوں بچے قہقہے لگانے لگے۔ نازلی نے ریکارڈ لگا کر ایک حسین سا رقص شروع کر دیا اور ظفر زندہ دلی سے بیٹھے بیٹھے پاؤں چلاتا رہا اور سیٹیاں بجاتا رہا۔

گھر کا ماحول کچھ خوشگوار، کچھ گوارہ ہو گیا تھا۔ لیکن آخر میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکوں گی۔ مجھے جانا ہی ہو گا اور پھر یہ گھر اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑے گا۔ پھر یہی حساس اور چڑچڑے بچے ہوں گے۔ یہی جہاں آرا کی بے نیازی ہو گی۔ یہی پھیکا پھیکا بدمزہ ماحول ہو گا۔ بجھے بجھے دل ہوں گے اور زندگی کا اکتا دینے والا تسلسل۔ کیا کروں؟ کیا اس حساس دل کو نوچ کے پھینک دوں جو ہر غم کو کلیجے سے چپٹا لیتا ہے؟ جو ہر دکھ کو اپنا سمجھ کر کڑھتا ہے! کیا میں اس گھر کو کبھی بھول سکوں گی؟ کیا میں جہاں آرا کو کبھی فراموش کر سکوں گی جس کی زندگی کی میں نے صبح دیکھی تھی اور جس کی زندگی کی شام بھی میں دیکھ رہی ہوں؟ وہ صبح جس میں امید، کامیابی اور خوشی کے کتنے اشارے تھے۔ آج ایسی شام ہے جس میں شکست کی آواز ہے۔ میرا دل جہاں آرا کی تنہا زندگی کا اندازہ کر کے ابھی سے کڑھ رہا ہے۔ جب یہ بچے لندن چلے جائیں گے تو اس کے صبح و شام کیسے گزریں گے۔ ایک تنہا ہاری ہوئی زندگی گھر کے سوکھے اجاڑ باغیچے میں ایک بوسیدہ آرام کرسی پر دراز کسی موٹی دقیق کتاب کے مطالعے میں غرق ہے۔ بالوں میں برف ہے۔ چہرے پر سلوٹیں ہیں۔ جسم کی طاقت، صرف ہو چکی ہے اور یہ زندگی وقت کے تیز دھارے میں بہتی ہوئی اپنے آخری موڑ کی منتظر ہے۔

اور آج میں لاہور سے کراچی واپس آ گئی ہوں۔ ایئرپورٹ پر میرے شوہر اور بچے کھڑے ہیں۔ ان کے چہرے خوشی اور مسرت کے احساس سے دمک رہے ہیں۔ میں اپنے دل کے غم کو چھپائے ہنسنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میرے شوہر پوچھتے ہیں۔ "کہو بھئی تمہاری سیر کیسی رہی؟" میرا دل بوجھل ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتی مجھے معلوم ہے کہ میرے سیدھے سادے شوہر انسان کی فطرت کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ انہوں نے اچھائی اور برائی کے چند بڑے بڑے اور موٹے موٹے اصول وضع کر لئے ہیں۔ وہ یہ باریکیاں کیا جانیں کہ جو اچھا ہے وہ برا بھی ہے اور جو بظاہر بہت برا ہے اس میں بھی کبھی کبھی ایسی کرنیں پھوٹتی ہیں کہ اس پہ ساری اچھائیاں قربان۔

بچے پوچھتے ہیں "امی جہاں آرا خالہ کے بچے کیسے ہیں؟" انہیں کیسے بتاؤں کہ وہ بچے کیا ہیں۔ وہ ننھے ننھے فرشتے ہیں۔ وہ بھٹک کر شیطان کے کہنے میں آ جاتے ہیں۔ وہ ایسی پیاسی روحیں ہیں جنہیں سکون کی تلاش ہے۔ میرے بچے جنہیں میں نے زندگی کے سیدھے سادے خطوط پر تربیت دی ہے، اگر جہاں آرا کے بچوں کو دیکھیں تو ششدر رہ جائیں اور میری عقل پر فاتحہ پڑھ لیں کہ میں ایسے مغرب زدہ، خود سر، ضدی، نافرمان بچوں کو فرشتہ کہتی ہوں۔ میرے شوہر کو جو عورت مجھ سے مختلف نظر آتی ہے، وہ انہیں عورت ہی نہیں لگتی۔ وہ کہتے ہیں "بھئی تمہاری دوست ہماری سمجھ میں نہیں آئیں" یہ میں خوب جانتی ہوں۔ جہاں آرا جس کے متعلق میں نے انہیں کیا کچھ نہیں بتا رکھا ہے، میرے شوہر کو بے حد مایوس کرے گی۔ اسی لئے میں چاہ رہی ہوں کہ خدا کرے کہ یہ لوگ کبھی ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ وہ صنم جو میں نے ان کے دماغوں میں تراشے ہیں وہ ویسی دیوتا ہی شکل میں موجود رہیں۔ میرے بچے میری واپسی پر خوشی سے کھلے جا رہے ہیں۔ میرے شوہر کہتے ہیں "شکر ہے آپ تشریف لائیں۔ بڑا سناٹا تھا گھر میں۔" میں چپ چاپ کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہوں اپنا اور انکے سفید

باروں کو دیکھتی ہوں۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر بڑے گہرے انداز میں کہتے ہیں "جسم فانی ہے، جذبہ لافانی ہے۔ جب تک جذبہ جوان ہو انسان بوڑھا نہیں ہوتا۔" وہ اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی گہری باتیں کر جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ میری بڑی لڑکی بائیس سال کی ہے وہ ایم ایس سی کرکے کالج میں لیکچرار ہے۔ اس کی شادی کی بات چیت تقریباً طے ہے۔ اس سے چھوٹا لڑکا بیس سال کا ہے، وہ انجنیئرنگ کالج میں ہے ــــ چھوٹا چودہ سال کا ہے، وہ میٹرک میں ہے۔ تینوں ہمارے تابعدار اور نہایت ہونہار ہیں۔ گھر میں ہر وقت خوشی اور اطمینان کے فوارے پھوٹتے رہتے ہیں۔ میں گھر میں داخل ہوتی ہوں۔ ہرا بھرا سبزہ، مہکتے ہوئے پھول، صاف ستھرا گھر میرا استقبال کرتا ہے۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دل غم اور خوشی کے احساس سے اتنا بوجھل ہے کہ میں ایک جملہ نہیں بول پاتی۔ یہ کیا غم ہے جو خوشی کے ساتھ چلتا ہے۔ یہ کیسی خوشی ہے جو بغیر غم کے نامکمل معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک خالص گھریلو ماحول ہے۔ یہ میری جنت ہے جسے میں نے یونہی حاصل نہیں کیا ہے۔ اس کی قیمت میں نے ادا کر دی ہے۔ اس راہ پر نظر ڈالتی ہوں جو میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں تو مجھے بہت سے صدمے نظر آتے ہیں جو بذات خود ایک داستان ہے۔ بے وفائیوں کے داغ، غربت کے اندھیرے، ضبط و برداشت کے صبر آزما امتحان اور بے شمار آزمائشیں۔ ان سب ادوار سے گزر کر میں اس موڑ پر آخر پہنچ ہی گئی۔ جب دل تو چھلنی ہو جاتا ہے لیکن منزل ضرور مل جاتی ہے اور یہی منزل ایک عورت کی معراج ہے۔ ایک عورت کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ان ننھی ننھی گھریلو خوشیوں اور غموں کا دامن اتنا وسیع ہے کہ ازلی اور ابدی خوشی اور غم سے جا ملتا ہے۔ یہ معصوم سچائی آخری سچائی تک پہنچاتی ہے جس کی تلاش میں درویش، فقیر اور سادھو بن بن، پربت پربت اور صحرا صحرا گھومتے ہیں۔ وہ ایک عورت کو گھر میں ملتی ہے۔ بشرطیکہ اس غم اور خوشی کا تعلق روح سے ہو۔

اس روح میں جہاں اتنے چہرے محفوظ ہیں۔ وہاں اپنی دوست کا غم اور رچ بس گیا ہے۔ مجھے یہ جنوں اور بے بسی ہمیشہ تڑپاتی رہے گی۔ میں قدرت سے یہ سوال کرنا چاہتی ہوں۔ "آخر جہاں آرا کی کیا خطا تھی؟"

قیوم راہی

آخری راستہ

روز کی طرح آتے ہی اس نے ٹیبل لیمپ کا بٹن دبا کر خود کو پلنگ پر گرا دیا۔ یوں جیسے طویل مسافت طے کر کے آیا ہو۔ تھکن سے چور چور۔ اس کی ٹانگوں میں ایک قدم چلنے کی بھی سکت نہ رہی ہو ـــــ زندگی کا سفر کتنا کٹھن، کتنا ہمت شکن، کس قدر اذیت ناک بن گیا تھا اس کے لئے۔ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور وہ تھا کہ لہو لہان ہوئے جا رہا تھا۔

کمرے میں گہرا سکوت تھا۔ دیواروں پر ٹیبل لیمپ کے شیڈ سے چھنتی ہوئی روشنی کے سایوں میں سارا ماحول پُر اسرار لگ رہا تھا۔ نیچے گلی میں بھی مکمل خاموشی تھی۔ دور سڑک پر کبھی کوئی کتا بھونکنے لگتا یا کبھی کسی تیز رفتار رکشا کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دے جاتی۔ کھلی کھڑکی کے باہر اندھیرے کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے ایک آہ سی بھری۔ ایک دو بار کھانسی کا بھی سلسلہ چلا۔ مگر خاموشی اور سکوت کا حصار پھر بھی نہ ٹوٹ سکا۔ کمرے کی ایک ایک شے اس سے خفا معلوم ہو رہی تھی، روٹھی ہوئی، بیزار بیزار ـــــ بیگانہ بیگانہ ـــــ اب تو تنہا یوں کے اس گھنے جنگل میں ہی کہیں کھو جانا ہوگا۔

اس نے کمرے کا یوں تفصیلی جائزہ لیا گویا وہ یہاں اجنبی ہو ـــــ اس کی نگاہیں میز پر پڑے ہوئے لفافے پر جم گئیں۔ یہ لفافہ کتنے ہی دنوں سے اس کو اپنی طرف بلا رہا تھا، مگر ہر بار وہ اس سے کترا کر نکل جاتا تھا ـــــ اب میں تمہیں کیا جواب دوں ماں ـــــ یہ ضرور ہے کہ میں اپنی ذات کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی دلاسے دیتا رہا ہوں، مگر میں کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ اور اب تم نے یہاں تک لکھ دیا ہے "شاید مجبور ہو کر کہیں تم وہیں ملازمت کرتے رہو، تمہیں ہرگز کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ تم ایسی حالت میں بھی عابدہ کو اپنے گھر دلہن بنا کر لانا چاہتی ہو ـــــ تم اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو اور میں اپنی انا کے محل میں بے بس ہوں ـــــ اور اب تو میں تاریکیوں میں اس قدر دور نکل آیا ہوں کہ پیچھے کی روشنیوں کا خیال ہی نہیں آتا۔ اب مجھے کسی معاملے میں دلچسپی نہیں رہی۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے مجھے ـــــ تم نے کبھی کوئی شکستہ سا خالی مکان دیکھا ہے، جو مدتوں سے غیر آباد ہو؟ اس کی بھائیں بھائیں کرتی فضاؤں میں کتنی پُر اسراری ویرانی ہوتی ہے۔ بس یہی حال کچھ میرا ہے، میں بھی خالی ہو چکا ہوں ـــــ کھوکھلا ـــــ مگر شاید تم نہیں جانتیں کہ مجھے سمجھ نہیں آتا

وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے جوتے اتارے۔ پھر کوٹ کو میز پر یوں پھینک دیا جیسے کوئی بیکار شے ہو۔ لفافہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس پر کوٹ بڑی بے ڈھنگی شکل میں پڑا تھا۔ پھر اس نے پتلون بھی اتار دی اور اسے بھی کوٹ پر دے مارا، پھر ٹائی کی باری آئی ـــــ پاجامہ پہن کر چپل گھسیٹتا وہ الماری تک گیا۔ کونے میں پڑا ہوا سگریٹ اٹھا کر منہ میں دبایا اور پلنگ پر دراز ہو کر آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔

چار سال قبل جب اس نے ایف۔ اے۔ پاس کیا تھا، اس کی ماں اور بڑا بھائی کتنے خوش ہوئے تھے۔ ماں نے ایک دن دعائیں دے کر بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ وہ اب اپنے بھائی کی دکان پر بیٹھ کر کاروبار سیکھے۔ یہ ضروری نہیں کہ پڑھ لکھ کر انسان نوکری ہی کرتا پھرے۔ تعلیم یافتہ آدمی اگر تجارت کی طرف مائل ہو جائے تو اس میں بھی بڑی ترقی کر سکتا ہے۔ پھر انھوں نے رازدارانہ انداز میں کہا تھا "تمہیں معلوم ہے بیٹے، میں تمہارے ماموں کو زبان دے چکی ہوں

"کیسی زبان؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنا ہوا تھا۔
"عابدہ بڑی اچھی لڑکی ہے، پڑھی لکھی، خوبصورت ــــــ"
وہ نیچی نگاہیں کئے خاموش بیٹھا تھا۔ ماں اس کی سعادتمندی سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔
"چاہتی ہوں تم ذرا کاروبار سنبھال لو تو یہ خوشی بھی دیکھ لوں، زندگی کا کیا بھروسہ ــــــ تم بولتے نہیں، چپ کیوں ہو ــــــ کیا تمہیں یہ رشتہ پسند نہیں؟"
"یہ بات تو نہیں ہے۔"
"تو پھر ــــــ؟"
"میں دوکان پر نہیں بیٹھوں گا۔"
"کیوں؟"
"بس ــــــ دل نہیں چاہتا ــــــ اور میں وہ کام ہرگز نہیں کروں گا جو میری مرضی کے خلاف ہو۔"
"تو پھر چاہتا کیا ہے تمہارا دل؟"
وہ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔
"بتاؤ نا ــــــ بولتے کیوں نہیں؟"
"میں،" اس نے نظریں اوپر اٹھائیں "چند دنوں تک لاہور چلا جاؤں گا ــــــ وہاں ......"
"وہاں لاٹ صاحب بن جاؤ گے جا کر ہے نا یہی بات؟" ماں نے پہلی بار غصے کا اظہار کیا، ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
"خیال تو کچھ ایسا ہی ہے۔" اس نے بھی جل کر جواب دیا تھا۔
پھر جیسے ماں بیٹے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گئے ہوں اور وہ سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔
کئی دنوں تک ماں نے اس سے بات نہیں کی، لیکن اس کا دل ذرا بھی نہ پسیجا، مضبوط چٹان کی طرح سینہ تانے وہ اپنی جگہ جما رہا ــــــ آخر ماں کو ہی سمجھوتہ کرنا پڑا۔ بیٹے کے تیوروں کا انھوں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا، وہ جان چکی تھیں کہ یہ طوفان اب ٹلنے والا نہیں ــــــ جب اس نے باہر جانے کے لئے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا، ماں کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور آواز رندھ گئی "اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹے، جاؤ ــــــ خدا کرے تم بڑے آدمی بن جاؤ، مگر میرا اپنے ماموں کے ساتھ کیا ہوا وعدہ ضرور یاد رکھنا ورنہ میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔" ــــــ ڈیوڑھی میں پہنچا تو بھائی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بھائی جو اپنی خفگی کا اظہار خاموشی سے کرتا آیا تھا اس وقت زبان بھی استعمال کر بیٹھا "جاؤ لاٹ صاحب، کون روک سکتا ہے تمہیں ــــــ کس میں اتنی ہمت ہے اور کسی کی حیثیت ہی کیا ہے تمہاری نظروں میں ــــــ جاؤ ــــــ بڑے آدمی جو بننے جا رہے ہو ــــــ، کتنی تیکھی تھیں وہ نظریں، کتنا تلخ تھا وہ لہجہ۔ کتنا تمسخر، کتنا طنز تھا ان الفاظ میں ــــــ ایک پل کے لئے اس کا سارا جسم کپکپا اٹھا۔
شہر میں وہ تھوڑا عرصہ ہی بیکار رہا۔ ملازمت مل گئی تو اس نے سکھ کا سانس لیا، فی الحال یہ چھوٹی ملازمت ہی غنیمت ہے۔ بعد میں کوششیں جاری رکھی جا سکتی ہیں۔ ساتھ ہی اس نے مزید تعلیم کا آغاز کر دیا۔ اب وہ کچھ کر کے ہی دم لے گا۔ وہ ان تیز نظروں، زہر بھرے لہجے اور طنز کے نشتروں کا مکمل جواب دینا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں تو کانٹے چبھے ہوئے تھے، جب تک وہ ایک ایک کانٹا نکال نہیں دیتا اسے چین نہیں مل سکتا۔

اس عزم کا دامن اس نے اُس وقت بھی نہ چھوڑا جب اس کی صحت تک اس کا ساتھ چھوڑنے لگی۔ صبح سے شام تک فائلوں پر جھکا رہنا رات گئے تک کتابوں کا مطالعہ، اور گھر کے سارے کام وہ شروع سے ہی خود کرنے کا عادی تھا ——— صرف چند گھنٹے اسے آرام کے لئے میسر آتے تھے اتنی کڑی اور مسلسل محنت کر آخر کچھ نہ کچھ رنگ تو لانا ہی تھا ——— اور یہ زرد زرد رنگ تھا جو دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر پھیلتا جا رہا تھا

پھر یہ پہلا امتحان ہی اس کی راہ کا وہ پہلا پتھر بنا جسے ایک ذرا سی بھی جنبش نہ ہو سکی۔ اس کے بازو شل ہو گئے ——— وہ ہانپ ہانپ گیا ——— پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا ——— اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ "تلخی کا ذائقہ اس نے کبھی چکھا ہی نہ تھا۔ یہ پہلا کڑوا کسیلا گھونٹ حلق سے اترا تو وہ بدحواس سا ہو گیا ——— وہ رو دیا، تعلیم سے دل اس قدر اچاٹ ہو گیا کہ یہ ارادہ ہی ترک کر دیا اور ایک دن وہ ساری کتابیں فروخت کر دیں جن سے اس نے زندگی کی کتنی ہی خوشیاں وابستہ کر رکھی تھیں۔

کچھ عرصے تک اس پہلی چوٹ کا اثر ہی اس پر غالب رہا۔ مگر جلد ہی اس نے ایک نئی اور آخری مہم کا آغاز کر دیا، اس مہم کا انجام بھی بڑا مایوس کن ثابت ہوا ——— جب بھی کسی اچھی اسامی کا اشتہار دیکھتا، اس کے لئے درخواست دے دیتا اور دوڑ دھوپ میں لگ جاتا۔ مگر ہر بار یہی ہوتا کہ وہ بھاگ کر دریا کے قریب پہنچتا تو پانی نام کی ایک بوند بھی وہاں موجود نہ ہوتی۔

کبھی کبھی آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی۔ دبیز تاریکیوں اور گہرے سناٹوں میں انجانے سے خوف اور اندیشوں کا دھواں اس کے سینے میں پھیل جاتا، اس کا دل ڈوبنے لگتا، اور وہ زیادہ ہراساں ہو جاتا ——— دفعتاً بھائی کا چہرہ اس کے سامنے آ جاتا ——— پیشانی پر شکنیں ہوتیں، اور آنکھوں میں طنز کے شعلے، پھر یہ چہرہ فاتحانہ انداز میں ہنسنے لگتا، اور اُسے یوں لگتا جیسے وہ زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔

صبح ہوتی، وہ پھر زندگی کے ہنگاموں میں کھو جانے کی کوشش کرتا۔ سڑک کے نل سے پانی بھرنا، چائے بنانا، روٹی پکانا، دفتر جانے سے قبل وہ یہ سارے کام خود ہی انجام دیتا تھا۔ شام کو کبھی کوئی دوست آ جاتا، کبھی وہ کسی کے گھر چلا جاتا، یا یوں سڑکوں پر اور بازاروں میں گھومتا رہتا ——— وہ خود کو بے حد مصروف رکھنے لگا تھا لیکن احساسِ شکست نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

اس شام وہ بے حد غمگین اور دل گرفتہ تھا۔ اس کا دوست آگے آگے تھا اور وہ پیچھے پیچھے۔ جب وہ واپڈا کی نئی بلڈنگ کی آخری منزل پر پہنچا تو ایک بار نیچے جھانک کر یوں چپ چاپ اور الگ تھلگ کھڑا ہو گیا جیسے یہاں بالکل اکیلا ہو۔

"آج تو ایسا معلوم ہو رہا ہے یار جیسے تم نے پی رکھی ہو ——— کہاں ڈوبے ہوئے ہو ——— کیا سوچ رہے ہو؟" اس کے دوست نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"میں؟"

"نہیں تو حضور ——— میں"

"سوچ رہا ہوں" اس نے مسکرانے کی کوشش کی "سوچ رہا ہوں یہاں سے گر کر خودکشی کرنا کتنا آسان کام ہے، اور شہرت بھی خوب ہو گی۔"

"بہت خوب ——— جواب نہیں ہے تمہارا" اس کے دوست نے ایک قہقہہ بلند کیا "تو گویا حضور آج کل خودکشی کے طریقوں پر ریسرچ کرتے پھر رہے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ——— کچھ دیر اس کا دوست بھی نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

"چلو بھائی، فوراً نیچے چلو ——— تمہارے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے" اس کا دوست مسکرایا، پھر اس کا بازو پکڑ کے نیچے اترنے لگا۔

اس رات جب وہ بستر پر لیٹا تو اسے مدتوں کے بعد بڑا اطمینان محسوس ہوا۔ اس کے پریشان خیالات کو ایک مرکز مل گیا تھا۔ اس نے اپنی ساری الجھنوں کا حل تلاش کر لیا تھا ——— پھر اس طرح وہ اپنی انا، اپنی انفرادیت کا تحفظ بھی کر سکتا ہے اور گھر والوں کی نظروں میں سرخرو بھی ہو سکتا ہے ———

ڈرائنگ میں اس نے دیکھا، اونچی عمارت کے نیچے اس کی لاش پڑی ہے اور گرد لوگوں کا زبردست جمگھٹا ہے۔ پھر اخبار وں میں خبر آتی ہے۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ بھائی کا ہنستا ہوا چہرہ ایک دم سپاٹ ہو جاتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں غم اور ندامت کے سایے لہرا جاتے ہیں۔ وہ کسی سے کہتے ہیں: "وہ اپنی بات کا دھنی نکلا، اس نے جان گنوا دی مگر سمجھوتہ نہیں کیا۔"

کتنے ہی دن اس نے یونہی بیکار، بے مقصد گذار دیئے۔ جب انسان زندگی ہی سے دامن چھڑانے لگے تو پھر مقصد، بھی کیا جاتا ہے ——— البتہ اسے تسکین ضرور تھی کہ مکمل سکون کا راستہ نزدیک ہی ہے، صرف قدم بڑھانے کی دیر ہے۔

سگریٹ پیتے پیتے ایک دم اسے چکر آ گیا، حلق خشک ہو گیا، دل تڑپ سا اٹھا۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا یا اس کا دم نکل جائے گا کئی منٹ یونہی گذر گئے نہ وہ بیہوش ہوا اور نہ ہی اس کا دم نکلا۔ پہلے بھی کئی بار وہ اس تکلیف دہ کیفیت سے دوچار ہو چکا تھا ——— تھوڑی دیر تک اس نے لیٹے لیٹے ہی قابو پالنے کی کوشش کی۔ طبیعت پھر بھی نہ سنبھلی تو اٹھ کر پانی کے کئی لمبے لمبے گھونٹ حلق سے اتارے اور دوبارہ اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ پھر دونوں کلائیوں سے پیشانی کو دبا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

دھیرے دھیرے ہیجانی کیفیت کا زور کم ہوتا چلا گیا۔ آرام ملتے ہی اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کی رُوح کا سارا کرب اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا ——— کوئی بھی تو اپنا نہیں ——— روشنی اور سائے حتیٰ کہ در و دیوار تک سازش میں لگے ہوئے ہیں، ہر شے اسی کی گھات میں ہے۔ ——— بھونڈی شکل میں میز پر پڑے ہوئے کپڑے بھی اس سے احتجاج کر رہے تھے۔

کروٹ بدل کر اس نے چادر اوڑھ لی اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا، مگر نیند کا بھی تو وقت ہوتا ہے، یوں بلانے سے تو نہیں آ جاتی ——— کتنی ہی دیر وہ بے حس و حرکت نڈھال سا پڑا رہا اور سوچوں کے پتھر اس کے ذہن پر گرتے رہے۔

یکایک دوسری گلی میں ایک شور بلند ہوا ——— وہ اُچھل پڑا، ہڑبڑا کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر تیزی سے کھڑکی تک چلا گیا ——— قریب ہی عورتوں، مردوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازیں آپس میں یوں گڈمڈ تھیں کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا رونے والے کسے پکار پکار کر فریاد کر رہے تھے۔

اس نے دھڑاک سے کھڑکی بند کر دی گویا ایسا نہ کرتا تو ابھی اس راستے سے کوئی بلا اندر گھس آتی ——— باہر کا شور خاصا دھیما ہو گیا تھا لیکن اس کے اپنے اندر کی کشمکش کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی ——— چند ثانیوں تک وہ سراسیمہ سا بیٹھا رہا۔ دل کی ضربوں کی تیزی میں کمی آئی تو باہر نکل گیا ——— سڑک پر کافی لوگ جمع تھے ——— وہ پہنچا تو ایمبولنس ایک جھٹکے کے ساتھ ہجوم میں سے نکلی اور پھر بھاگتی ہی چلی گئی۔

جب اسے معلوم ہوا کہ یہی ایمبولنس ابھی ابھی دلشاد کی لاش لے کر آئی تھی تو اس کے سامنے دلشاد کا بھاری بھرکم سراپا اُبھر آیا۔ کتنا کڑیل جوان تھا، کیسی قابلِ رشک صحت تھی اس کی۔ چھ ماہ قبل ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔ ابھی چار یا پانچ دن کی بات تھی جب دلشاد نے رکشا روک کر اس سے کہا تھا "آؤ بابو جی ——— بیٹھ جاؤ نا، میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔" وہ بغیر کسی تکلف کے رکشا میں بیٹھ گیا تھا ——— دلشاد نے رکشا کو اسی سڑک پر ایک طرف روک دیا تھا اور وہ دلشاد کا شکریہ ادا کرتا ہوا اپنی گلی میں مڑ گیا تھا۔ اس وقت اسی جگہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے اور دلشاد کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ کس طرح ہو گیا ——— ایک صاحب کسی کو بتا رہے تھے: "یہ کوئی تین چار دن کی بات ہے، بس پیٹ میں درد اٹھا تھا۔ جب تکلیف زیادہ ہوئی تو ہسپتال میں داخل کرا دیا ——— کئی گھنٹوں تک وہ مارے درد کے تڑپتا رہا۔ کل رات آخر اس کا آپریشن کیا گیا تو پتہ چلا کہ زہر سارے پیٹ میں پھیل چکا ہے ——— اس وقت سے اس کی حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔"

رونے اور ماتم کرنے کی آوازیں فضا میں موت کی ویرانیاں بکھیر رہی تھیں۔ زمین سے آسمان تک موت ہی موت کا تسلط تھا ـــــ اس کی نظروں کے سامنے دنیا کی بے ثباتی کی گہری دھند چھا گئی ـــــ "زندگی کس قدر ناپائدار ہے، کس قدر بے معنیٰ ہے ـــــ کتنی حقیر ہے۔ دکھوں کی بھاری گٹھڑی جس کے بوجھ تلے وہ کتنے ہی دنوں سے پڑا سسک رہا ہے، اتر ہی جائے تو بھی سکون مل سکتا ہے کتنے نادان ہیں یہ لوگ جو اس بُری طرح چیخ چیخ کر سوگ منا رہے ہیں۔

سامنے ہی گلی ہیں جہاں دلشاد اکثر گرمیوں کے موسم میں سویا کرتا تھا، اس وقت اسی جگہ دائمی نیند کی آغوش میں مدہوش پڑا تھا۔ ارد گرد کھڑے تھے احباب بیحد مغموم تھے اور رو رہے تھے محلے والے بھی اس کا آخری دیدار بڑی حسرت سے کر رہے تھے ـــــ اندر کمرے میں عورتیں بدستور چیخ چیخ کر خود کو ہلکان کئے دے رہی تھیں۔

کسی انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر وہ بھی دھیرے دھیرے چلتا نزدیک پہنچ گیا۔ اوپر بجلی کا بلب روشن تھا، نیچے چارپائی پر دلشاد کی لاش پڑی تھی۔ صرف چہرہ کھلا تھا باقی تمام حصہ سفید چادر سے ڈھانپا ہوا تھا ـــــ کس قدر بھیانک تھا وہ چہرہ ـــــ ارے کیا یہی ہے وہ خون سے دمکتا ہوا شاداب چہرہ ـــــ؟ اس چہرے میں تو اُس چہرے کی ایک جھلک بھی باقی نہیں ـــــ خوف کے سخت ہاتھ نے اس کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا ـــــ کتنی مکروہ ہے یہ شکل ـــــ خدا کی پناہ ـــــ چند لمحے وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ـــــ ایک دم اس کے سارے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی ـــــ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ یوں گویا اگر اس نے ذرا سا بھی توقف کیا یا پیچھے مڑ کر دیکھا تو موت اسے بھی دبوچ لے گی ـــــ گلی کے موڑ پر اسے یاد آیا سگریٹ ختم ہو چکے ہیں۔ اس نے فوراً اپنا رُخ مین بازار کی طرف پھیر لیا۔ سگریٹ کا پیکٹ خرید کر اس نے ایک سگریٹ جلایا اور وہیں کھڑا رہا۔ اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً ہی اُدھر چلا جائے ـــــ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ سامنے والی چائے کی دکان میں چلا گیا ـــــ کشادہ دوکان کے ایک گوشے میں صرف تین آدمی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ ان میں سے کسی نے بھی ایک نظر اُٹھا کر اسے نہ دیکھا ـــــ وہ ان سے جتنی دور بیٹھ سکتا تھا، بیٹھ گیا۔

چائے پی کر وہ کافی دیر تک سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا ـــــ اخبار پڑھتا رہا ـــــ بظاہر وہ اخبار پڑھ رہا تھا، مگر اس کے دل و دماغ کسی اور ہی کام میں مصروف تھے ـــــ آپ ہی آپ ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا تھا ـــــ پھر کسی نے اس کے کاندھے کو آہستہ سے تھپتھپا کر سرگوشی سی کی "اپنے دشمن خود تم ہی تو تھے میرے بھائی"ـــــ وہ اُٹھا، باہر آیا۔ یونہی اوپر دیکھا ـــــ سیاہ آسمان پر جگمگ کرتے ہوئے کئی ستارے ٹوٹ کر اس کے دل میں آن گرے۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ٹیبل لیمپ کی روشنی میں چاندنی کی سی خنکی گھلی ہوئی تھی، سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا ـــــ فضا میں ایک انجانی مہک رچی ہوئی تھی ـــــ اس کی رگ رگ میں ایک "تلاطم سا برپا تھا ـــــ کمرے کی ایک ایک شے پر اسے اتنا ٹوٹ کر پیار آیا کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سب کچھ اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔

کچھ دیر وہ پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہا ـــــ پھر وہ اُٹھا میز پر سے ٹائی اُٹھا کر کھونٹی پر لٹکائی، کوٹ اور پتلون کو بڑی احتیاط سے تہہ کر کے ہینگر میں ٹانگا اور کرسی پر بیٹھ کر میز پر پڑے ہوئے لفافے کا جواب لکھنے لگا۔

مرتب : سیّد علی عبّاس جلالپوری

آخر کیوں؟

صنوبر انیس برس کی ایک حساس اور ذہین لڑکی تھی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ اپنی پہلی گلوکوز کے الفاظ میں "اجنتا کے غاروں کی ایک مورتی" تھی۔ جب وہ ننھی سی کھلنڈری بچی تھی تو سوءِ اتفاق سے وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور اس کے چہرے کا چاند گہنا گیا۔ اس داغ نے صنوبر کی زندگی کے سرچشمے کو کیسر مکدر و مسموم کر دیا۔ جب اس نے شباب کی طوفان پرور وادی میں قدم رکھا تو ایک طرف اُسے آتش گیر رماؤں اور پرجوش تمناؤں نے گھیر لیا دوسری طرف اُس کے احساسِ کمتری میں عذاب ناک تلخی پیدا ہو گئی جس سے اُس کے ذہن و قلب ایک والعموز کشمکش کی آماجگاہ بن گئے۔ ایک مدت گذری صنوبر نے راقم حروف سے نفسیاتی مشورہ کیا تھا۔ راقم نے کہا کہ وہ ہر روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنے برجستہ خیالات و احساسات کو قلم بند کر لیا کرے۔ اسی روزنامچے کے چند اوراق کا جو بڑی شستہ و رفتہ انگریزی میں لکھے گئے تھے، اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ راقم نے پاروں کی ترتیب میں کہیں کہیں خفیف سا رد و بدل کیا ہے لیکن اصل متن کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ نام و مقام البتہ مصلحۃً بدل دیے گئے ہیں۔

صنوبر کی تحریر خلوصِ نگارش، احتسابِ نفس اور غور و فکر کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ اُس کی جراحتِ احساس، حرمان نصیبی، روح فرسا ذہنی کشمکش اور عذاب ناک جذباتی خلفشار کے بے محابا اظہار و بیان نے اس تحریر کو ایک قابلِ قدر انسانی دستاویز اور ایک بلند پایہ ادب پارہ بنا دیا ہے۔

ان اوراق کا ترجمہ کرتے وقت راقم یہ سوچتا رہا کہ وہ بھاری صلیب جو کسی بھی عظیم المیے کے ہیرو کے مضبوط کندھوں کو شکستہ کر سکتی تھی کیوں ایک نازک اندام لڑکی کے ناتواں کندھوں پر رکھ دی گئی ——— آخر کیوں؟

---

(۱)

گو آج چاہتی ہے میں تفصیل سے اس بات کا ذکر کروں کہ میری بدصورتی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اب میں کیا کہوں۔ بس ہو نی تھی ہو گئی۔ ابا جان اور امی جان ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ اپنی اپنی ضد نبھاتے تھے مجھے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ جب یہ حادثہ رونما ہوا تو ہر کوئی دوسرے کو ذمے دار گردانتا تھا۔ ابا جان نے ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح کہا "اللہ کی رضا یہی تھی"۔ پھر امّی جان آنسو بہاتی رہیں اور ابا جان دوڑے دوڑے ڈاکٹر کے پاس گئے لیکن سب کوششیں رائیگاں گئیں۔ میرے مقدر میں یہی کچھ لکھا تھا۔ میں کئی دفعہ ابا جان اور امی جان سے جھگڑ چکی ہوں کہ جب یہ حادثہ ہوا تو آپ نے میرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ سات برس کی بچی کو جان سے مارنا آسان تھا لیکن انیس سال کی لڑکی کو مارنا مشکل ہے۔ میرے والدین سچے مسلمان ہیں، وہ مجھے کیسے جان سے مارتے۔

بدنصیبی سے میں ایک ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے عام حسیات کے علاوہ اور بھی کئی حسیں مجھے قدرت نے دی ہیں۔ امی جان، ابا جان سے روٹھی رہتی تھیں لیکن مجھ سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے کیمبرج اسکول میں داخل کرا دیا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ عام مدرسے میں بچے طعن و طنز سے میری جان ضیق میں کر دیں گے، اور میں احساسِ کمتری کی شکار ہو جاؤں گی۔ سکول میں بھی مجھے چاہتے تھے۔ ایک دن ایک لڑکی اور لڑکے نے مجھ سے پوچھا "تمھیں کیا ہوا تھا؟" اُن کا ایک بڑا بھائی بھی موجود تھا، اُس نے انھیں ڈانٹ دیا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اُس کے ہونٹوں پر ندامت آمیز مسکراہٹ کا سایہ کانپ رہا تھا۔ ہمارے دوست بہت تھے اور ہم سب مل کر گیت گایا کرتے تھے۔ ایک گیت ہم نے خود گھڑ رکھا تھا جس کا ابتدائی مصرع تھا "آؤ چھولے دال پکوڑے" اب میں اُسے بھول چکی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اور میرا ایک ہم جماعت فیاض ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے بیاہے گئے۔ میں حیران ہوں کہ میں نے یہ خواب کیوں دیکھا تھا کیونکہ فیاض سے میری چنداں بے تکلفی نہیں تھی۔ ایک دن ہم سب لوگ فلم دیکھنے گئے۔ اندھیرا ہوتے ہی امی جان نے کہا تھا "تمھیں فلمیں نہیں دیکھنی چاہئیں، تمھاری بینائی کو ضرر پہنچے گا۔" ابا جان ہمیں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اُس لڑکی تہمینہ کے زیرِ اثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ بہرحال جیسے بھی تھے ہم خاصے خوش و خرم تھے۔ میں، صبیحہ اور ایک لڑکا پرویز سکول سے چھٹی ہونے پر باغ میں کھیلا کرتے تھے۔ صبیحہ ابھی بہت چھوٹی تھی لیکن میں اور پرویز ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بے تحاشا بھاگا کرتے تھے۔ میں پڑھائی لکھائی میں اچھی خاصی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ راشد ہمارے ہاں آیا تو اس نے میرا سر سہلایا اور جب وہ اپنے ایک دوست ناصر سے ملنے گیا تو مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ مجھے بائیسکل پر بٹھا کر سیر کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ میں اُس کی گود میں بیٹھ کر اُسے گانا سنایا کرتی تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی اور وہ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ وہ میری کہانیوں اور بے تکان گفتگو سے بہت محظوظ ہوا کرتا۔

میں ابھی نو برس کی تھی کہ مجھے لگا جیسے میں بڑی ہو رہی ہوں۔ ایک دفعہ ہم شادی پر گئے۔ راشد ابھی ابھی ملازم ہوا تھا۔ شادی پر ہمیں قیمتی لباس بنوا کر نہیں دیئے گئے تھے جس سے مجھے خاصی کوفت ہوئی تھی۔

جب ہمارے ابا جان نے تہمینہ سے اپنا تعلق منقطع کر دیا تو میری سوتیلی ماں کو اپنے یہاں لے آئے اور پھر دو برس کی جدائی کے بعد ہمارے ہاں پہنچے۔ وہ دسمبر کی ایک رات تھی۔ چلّے کا جاڑا تھا۔ امی جان نے انھیں کھڑے کھڑے گھر سے نکال باہر کیا۔ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ بعد میں انھوں نے بتایا تھا کہ ریل کے انتظار میں انھیں چار گھنٹے تک سٹیشن پر ٹھٹھرنا پڑا تھا۔

میں ناولوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ یہ شوق پریوں کی کہانیوں سے شروع ہوا تھا۔ امی اتنی کتابیں فراہم نہیں کر سکتی تھیں اس لئے مجھے ناولیں خریدنا پڑیں۔ امی ہمیں روپیہ پیسہ کچھ نہیں دیتی تھیں اور مجھے ناولوں کا شوق کھائے جا رہا تھا۔ مجبوراً مجھے امی جان کے پرس سے رجوع ہونا پڑا۔ اُن دنوں میں پیسے چرانے کے نئے نئے طریقے اختراع کیا کرتی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چوری کرتی اور بھاگ جاتی۔ آخر امی جان کا ماتھا ٹھنکا اور انھوں نے مجھے پکڑ کر خوب ٹھکائی کی۔ میں رسالوں اور قصّے کہانیوں کی کتابوں کے لئے اِدھر اُدھر گھوما کرتی۔ موقع ملنے پر کھیتوں کی سیر کو بھی نکل جاتی جس پر مجھے بے بھاؤ کی پڑتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے چلچلاتی دھوپ میں بیٹھنے کی سزا دی جاتی۔ جب امی جان لیٹ جاتیں اور مجھے سائے میں بلاتیں تو میں ایسی ہٹ دھرم تھی کہ اپنی جگہ سے نہ ہلتی۔ امی جان میرے ہاتھوں کو جلایا بھی کرتی تھیں تاکہ میری چوری کی عادت مٹ جائے لیکن میرا جواب یہی تھا کہ جب سیدھی طرح سے نہیں دیتیں تو میں ایسا ہی کروں گی۔ میرا ایک اور محبوب مشغلہ یہ تھا کہ میں چماریوں کی بیٹیوں سے بہناپا کر لیتی اور انھیں سہیلیاں بناتی تھی۔

مجھے اپنی گیارھویں سالگرہ یاد ہے جو بڑی دھوم سے منائی گئی تھی۔ امی جان کی سہیلیوں نے مجھے کیا اچھے اچھے تحفے دیئے تھے۔ اُن دنوں مجھے سکول جانے سے نفرت سی ہو گئی۔ میں اور صبیحہ سکول کے وقت مکان کی چھت پر جا کر چھپ جاتیں اور جب امی چلی جاتیں تو نیچے اتر کر کھیلا کرتی تھیں۔ صبیحہ بڑی بھگوڑی

تھی۔ وہ اپنی ننھی سہیلیوں کے ساتھ کھلیتوں کو نکل جاتی اور کسی نہ کسی رہٹ پر دیہاتیوں سے لسی لے کر پیتی اور روٹی کھاتی تھی۔ ان دنوں امی جان اور ابا جان میں صلح ہو گئی۔ اور وہ ہمارے یہاں آنے جانے لگے۔ آٹھویں جماعت میں تھی کہ میں سکول سے بیزار ہو گئی۔ میں لاپروا تھی اور استانی جی مجھے بہت سخت سست کہا کرتیں مجھے پکانا رندھنا اور سینا پرونا نہیں آتا تھا۔ جو لڑکیاں ان کاموں میں برق تھیں ان کے سامنے مجھے شرمندہ ہونا پڑتا تھا میں تیرہ برس کی تھی کہ اچھی خاصی جوان دکھائی دینے لگی۔ میں نے آٹھویں جماعت کے امتحان میں وظیفہ لیا تھا۔

میری ایک سہیلی تھی صفیہ نام تھا۔ اس کا بڑا بھائی جس کا سیاہ فام چہرہ چھائیوں چھپا تھا، مجھ میں دلچسپی لیتا تھا۔ صفیہ میری بڑی اچھی سہیلی تھی اور مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ میں اسے انگریزی اور ریاضی میں مدد دیا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا "صنوبر اگر تم اتنی بدصورت نہ ہوتیں تو میں تمہاری شادی بھائی جان سے کرا لیتی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ میری بدصورتی کا قصہ اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ مجھے اس سے گھن آنے لگی ہے۔ اب اس کی تکرار کو ختم ہونا چاہیے، ورنہ کسی روز چیخوں گی ــــ اس زور سے چیخوں گی کہ یا اپنا سر پھوڑ لوں گی یا دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دوں گی۔

نویں جماعت میں بہت کچھ سنبھل گئی تھی۔ اور میری قابلیت کا بھی شہرہ ہونے لگا تھا۔ تیرہ برس کی عمر سے ہی میں نے گھر والوں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا تھا۔ اب گھر پر میرا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ امی جان بھی میری قابلیت کے باعث مجھے بہت چاہنے لگی تھیں۔ باہمی محبت اور احترام کا یہ تعلق آج تک بحال ہے، اگرچہ میری فروگذاشتوں پر بعض اوقات وہ مجھے سخت سرزنش کرتی ہیں اور میں بھی خواہ مخواہ اپنے مشورے ان پر ٹھونستی رہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ تعلق اسی طرح بحال رہے گا۔

اب مجھ پر ایک نئی دھن سوار ہوئی ــــ فلمیں دیکھنا اور فلمی رسائل پڑھنا۔ میں نے بھلی بری سیکڑوں فلمیں دیکھی ہوں گی اور میری معلومات ایکٹروں، ایکٹرسوں، موسیقی کے ہدایت کاروں، فلمی شاعروں، افسانہ نویسوں کے متعلق خاصی وسیع ہو گئیں۔ اس کے ساتھ میں بڑی باقاعدگی سے ریڈیو سیلون سنتی تھی۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی عکسی تصاویر سے میں نے کئی مرقعے تیار کیے۔ امی جان کو میرا یہ مشغلہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ اس میں روپے کا بھی نقصان ہے اور اوقات کا حرج بھی ہوتا ہے۔ جب میں نے سنی ان سنی کر دی تو انھوں نے میرے مرقعے جلا دیے۔ طیش سے میرا خون کھول اٹھا اور میں نے اپنا سر برآمدے کے ستون سے دے مارا جیسا کہ پاگل سر پھوڑتے ہیں اور دو دن تک نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ابا جان نے مجھے ایک کیمرہ خرید دیا تھا۔ اب میں عکسی تصاویر کے مرقعے تیار کرنے لگی۔ امی جان اس شوق کے بھی خلاف تھیں لیکن رفتہ رفتہ پسیج گئیں۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا جنون تھا۔ میں وہ فلمیں پسند کرتی جن میں دلدوز المیہ جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس نوع کی فلمیں دیکھ کر میں رات بھر شرر بار جذبات میں بڑی جھلستی تھی۔ مجھے فلمی تکنیک کی بھی کچھ سوجھ بوجھ ہو چلی تھی۔ اور فلم سازی، موسیقی اور عکاسی میں بھی بصیرت پیدا ہو گئی۔ صوتی تاثر کیا ہوتا ہے؟ حقیقت نگاری کسے کہتے ہیں؟ کون سے مقام پر کیسے مضحک سستی جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے؟ یہ سب کچھ مجھے معلوم تھا۔ اپنے حلقۂ تعارف میں مجھے فلمی نقاد سمجھا جاتا تھا۔ میں ایک کلبی کی طرح ناک سکوڑ کر اور حلق سے غر، غر کی آواز نکال کر منہ پر ہاتھ رکھے جذباتیت سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا کرتی۔ اب میں معروضی انداز سے اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سستی جذباتیت سے متنفر ہونے کے باوجود میں خود بعض اوقات اس کی شکار ہو جاتی ہوں۔

بارہ برس کی عمر میں میں وہ جاگتے خواب دیکھنے لگی جو کسی لڑکی کو نہیں دیکھنے چاہئیں۔ مجھے حقائق کی علمی بصیرت میسر آ جاتی تو شاید میں خواب و خیال کی دنیا میں کھو کر نہ رہ جاتی۔ میں روز خوابی میں پُر مسرت حسین دنوں کے تصورات میں غرق رہتی۔ اس سے میری صحت پر ناخوشگوار اثر بھی پڑا۔ میں پہروں ایک جگہ بیٹھی جاگتے خواب دیکھا کرتی جن کا تانا بانا ناٹکوں اور ناولوں کے واقعات بہم پہنچاتے تھے۔ میں لاکھ ان خوابوں سے پیچھا چھڑانے کی

کوشش کرتی لیکن میں ابھی تک ان سے گلوخلاصی نہیں کرا سکی ہوں۔ لگتا ہے جیسے وہ میری رگ و پے میں سرایت کر چکے ہیں۔ اس طرح بیکار لیٹے رہنے سے میری صحت بگڑ گئی اور میرا جگر خراب ہو گیا۔ دسویں جماعت میں مجھ پر اس تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جیسی کہ میں اپنے آپ کو خوابوں میں دیکھا کرتی تھی فی الحقیقت ایسی نہیں تھی۔ اس حقیقت کو قبول کرنا گویا تمام خوابوں سے دست بردار ہونا تھا اور یہ بات میرے لئے ناممکن تھی کیونکہ وہ مجھ پر چھا چکے تھے۔ یہ احساس بڑا دہشت انگیز تھا۔ میرے دل کا چین ختم ہو گیا۔ سکول میں میری ایک سہیلی تھی، رشیدہ نام تھا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ نوجوان تو لڑکی کے نام پر مرتے ہیں انھیں اس بات سے چنداں غرض نہیں ہوتی کہ وہ بدصورت ہے یا خوبصورت۔ یہ تو محض ہوس کاری ہوئی! میں گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کیا میں محض ایک لڑکی تھی! ایک اور بچی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خاکہ سا ابھرا۔ میں نے سوچا میں کہاں ہوں؟ میں کیا ہوں؟ لوگ مجھے کیا خیال کرتے ہیں؟ کیا میں کسی سے محبت کر سکتی ہوں؟ کیا میرے اندر جنس قسم کی کوئی چیز ہے؟ جنس تو کیا ہے؟ اور اس سے مراد کیا ہے؟

دسویں جماعت کے امتحان کی تیاری میں میں فکر مند سی رہنے لگی اور میرے چہرے کا رنگ زردی مائل ہو گیا۔ ایک شخص ہمیں دودھ دیا کرتا تھا۔ اس کی لڑکی کا نام سکینہ تھا اور وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ وہ میرے پاس انگریزی پڑھنے آیا کرتی تھی۔ ایک دن میں روزے سے تھی اور بستر پر لیٹی تھی کہ وہ آئی اور پھر فوراً واپس چلی گئی۔ شام کے وقت وہ پھر آئی اور کہا "میں تو آپ سے ملنے آئی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ سوتے میں آپ کا منہ چوم لوں۔" وہ یہ بات بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ میں بھونچکا سی رہ گئی۔ کیا میرے اندر مردانگی پائی جاتی ہے؟ یہ خیال میرے لئے حیرت اور مسرت دونوں کا باعث ثابت ہوا اور میں اپنی گفتگو اور طور طریقوں سے اپنے آپ کو ایک نوجوان ظاہر کرنے لگی۔

سکول سے فارغ ہونے پر مجھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ میں اپنی سوتیلی ماں کے سامنے شرم و حجاب کے مارے بول نہ سکتی لیکن اباجان سے خوب جھگڑا کرتی تھی۔ میری اور اباجان کی حالت ایسے رقیبوں جیسی تھی جو ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں۔ سوال وہی فرسودہ تھا۔ مجھے محبت اور رہنمائی کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ میں اپنی ذات کے لئے کامل آزادی کی خواہاں بھی تھی۔ اباجان پابندیاں عاید کرنے کے حق میں تھے اور مجھ سے قطعی لاپروا تھے۔ اباجان کی عدم موجودگی میں میں ان سے محبت کیا کرتی تھی لیکن ان کے قریب آ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ لاابالی، ضدی اور بے رحم ہیں۔ سارا طلسم شکست ہو گیا۔ میں اپنی امی جان کا سہارا لینا بھی ناپسند کرتی تھی۔ وہ بھی آخر میری طرح عورت ہی ہیں اور اباجان میری پروا نہیں کرتے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے دنیا فریب نگاہ ہے، غیر حقیقی ہے۔ قدرتاً استدلال کی صورت کچھ یوں بن گئی کہ اگر وہ چیز جس کی میں طالب ہوں اور جس سے میں محبت کرتی ہوں غیر حقیقی ہے تو وہ چیزیں جن سے مجھے نفرت ہے اور جن سے میں صرفِ نظر کرنا چاہتی ہوں کیوں حقیقی ہیں؟ مؤخر الذکر کیوں ٹھوس مستقل اور مضبوط ہیں؟ مصیبت یہ ہے کہ میرے ذہن میں بیسیوں طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل جمع ہو گئے ہیں جن کا حل مجھے نہیں سوجھتا۔ کالج میں جا کر میں خاصی قابل ثابت ہوئی لیکن حسین و جمیل اور شوخ و شنگ لڑکیوں کے جھرمٹ میں مجھے اپنا آپ بڑا حقیر و صغیر دکھائی دیا۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ انھیں قریب سے دیکھنے پر ان کی اصلیت بخوبی آشکار ہو جاتی ہے۔

میں حیران ہوں کہ ذہنی انقلابات کے باوجود مجھ میں احمقانہ بچپن کے آثار کیوں باقی رہ گئے ہیں۔ اردو اور تاریخ کی لیکچرار میں مجھے پسند کرتی تھیں مجھے فلسفے کی تحصیل کا بے حد شوق تھا لیکن فلسفے کی لیکچرر عام قسم کی بے رنگ خاتون تھیں۔ میں جوں توں فلسفے سے نبھائے گئی۔ جدید مغربی تاریخ کے سیاسی انقلابات میں مجھے خاصی دلچسپی تھی۔

اباجان کی لاپروائی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں راشد کو اپنا مربی سمجھنا شروع کر دوں۔ ہم زندگی کے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے جس میں زیادہ باتیں میں ہی کرتی تھی۔ میرے خیال میں مجھے ہر وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہوں۔ اس کے

بغیر میں شاید اپنے حواس بھی کھو بیٹھوں گی۔ نعیمہ نے سچ کہا تھا تم اپنے پیٹ میں کوئی راز نہیں رکھ سکتیں۔ جس نے تمہیں اپنا ہمراز بنایا اس نے اپنی موت کا پروانہ کھا لیا تو اس طرح میں ہر وقت اپنی موت کا پروانہ آپ ہی لکھتی رہتی ہوں۔ لیکن راشد نے اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا مجھے شروع سے جبلّی طور پر اپچ اور غیر معمولی بات سے دلچسپی رہی ہے۔ راشد نے میری باتوں کو حقیقی معنی پہنانے شروع کر دیئے، جب کہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ جو معنی وہ لیتا ہے وہ میرا مقصود نہیں ہوتے۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ مجھے ہمیشہ غلط سمجھا کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اظہار و بیان میں میرے اصل خیالات مسخ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے خیالات کے اظہار سے قاصر رہتی ہوں اور جو الفاظ نوکِ زبان پر آتے ہیں اُن سے سخت چڑتی جاتی ہوں اور حیران ہوتی کہ کیا کہوں۔

ایک دن ایک صاحبہ ہمارے یہاں آئیں اور مجھ سے پوچھا "آخر تمہیں ہوا کیا تھا؟" میں کچھ جواب نہ دے سکی اور حیران تھی کہ کیا کروں اُنھوں نے ترس کھاتے ہوئے کہا "الٰہی توبہ! آنکھوں کی وضع کیسی عمدہ تھی!"

(۲)

اس جذباتی فشار کو دور کرنے کے لئے شاید کسی نہ کسی قسم کا اظہار ضروری ہو گیا ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اگر میں نے اس بوجھ کو جس کے نیچے میرا ذہن و قلب دب کر رہ گیا ہے، نہ ہٹایا تو میں کسی کام کی بھی نہیں رہوں گی۔

آج کئی واقعات پیش آئے۔ صبح سویرے اچھی بھلی تھی۔ دوپہر کے قریب مجھ پر افسردگی سی چھا گئی۔ میری کلائی کی گھڑی کھو گئی ہے۔ اچھی خاصی قیمتی تھی۔ ہر شخص اسے پسند کرتا تھا۔ وہ میری رفیقہ بن گئی تھی۔ میں نے اُسے کھو دیا ہے۔ اس ہفتے مجھے کئی نقصانات اُٹھانے پڑے۔ خدا معلوم ابھی کیا کچھ دیکھنا ہے۔ فلسفے کی گھنٹی میں میری طبیعت ناساز ہو گئی۔ تھکن اور حرارت محسوس ہونے لگی۔ گلرخ کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنی تنہائی اور کس مپرسی کا ایسا اذیت ناک احساس ہوا کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے دل میں گوشت اور لہو کی بجائے خلا سا رہ گیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میرے وقار و تمکنت کے احساس نے میری آنکھوں سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہتی تھی لیکن میرے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اُٹھی۔ مگر لوٹ جانے کی سکت کہاں تھی۔ جماعت کے کمرے میں گئی اور کرسیوں پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اپنے منہ کو ہاتھوں سے مضبوطی سے تھاما لیکن تلخ آنسو بے اختیار میرے گالوں پر ڈھلک پڑے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا "میری طبیعت بڑی ناساز ہے" پھر شال اور کتابیں اُٹھا آہستہ آہستہ بوجھل قدم اُٹھاتی گھر کی طرف چلی۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ میں دیر سے آئی ہوں۔ آخر کتنی دیر ہوئی؟ کلائی کی طرف دیکھتی ہوں تو گھڑی غائب۔ واپس جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بہر صورت ملازم کو ساتھ لے کر کالج گئی لیکن گھڑی کا سراغ نہ ملا۔ شوروتی کو اطلاع دے کر گھر لوٹ آئی۔ مجھے اس بات کا بڑا رنج تھا کہ امی جان یہ سُن کر ملول ہوں گی لیکن امی جان نے بڑی نرمی اور ملاطفت سے میری دلدہی کی جس سے میرے سینے پر سے ایک بوجھ اُتر گیا۔ کئی دنوں سے میں بہت کم کھانا کھا رہی ہوں۔ باورچی خانے میں جا کر ایک آدھ چپاتی اور ایک اُبلا ہوا انڈا کھایا۔ چائے پی اور قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کیا۔ مجھے ایک تقریر بھی تیار کرنی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ دو ہفتوں کے وقفے کے بعد مطالعہ بھی شروع کروں لیکن میرا جی ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔

(۳)

اس وقت پونے تین بجے ہیں۔ صبح دس بجے سے میں کرب ناک درد محسوس کر رہی ہوں۔ اب قدرے افاقہ ہے۔ مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ علالت کے دوران میرا دماغ زیادہ روشن ہو جاتا ہے اور شعور زیادہ بیدار رہتا ہے۔ مجھے ابھی ابھی یاد آ رہا ہے کہ سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے میرا گلرخ کے ساتھ مناظرہ ہو گیا۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ وہ شخص جو محض کلبیت کا سہارا لیتا ہے، اپنے موقف کو کمزور کر لیتا ہے۔ میں کشمیر کے مسئلے کی اہمیت

سے بخوبی واقف ہوں اور گذشتہ چھ ماہ سے اخبارات کا بھی باقاعدگی سے مطالعہ کر رہی ہوں لیکن بدقسمتی سے میری دلچسپی اس شخص کی سی ہے جو شطرنج کی بازی دیکھ رہا ہو۔ میں دنیا کے احوال کو ذاتی مسئلہ بنا کر نہیں دیکھ سکتی ہیں اپنی فطرت سے مجبور ہوں اور محض مباحثے کی خاطر گلرخ سے اختلافِ رائے کرتی ہوں تاکہ مجھے اُس کے خیالات کا علم ہو جائے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے مجھے اُس پر کامل اعتقاد ہے لیکن میرے لاشعور میں شکوک و شبہات کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ آخر خدا نے مجھے عضویاتی پہلو سے کیوں ایک مکمل انسان نہیں بنایا؟ میرے اندر ہر چیز کے متعلق ہزاروں پہلو پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ مجھے خلق کرتے وقت خدا سنجیدہ بھی تھا کہ نہیں۔ نہیں پیئے ہوئے تھا۔ یہ میں نہیں کہہ رہی۔ میرے لاشعور کی گہرائیوں سے ایک شریر بھتنے نے سر اُٹھایا اور یہ بات کہہ دی۔

فضا میں بہار کی خوشبو پھیل رہی ہے۔ بہار کی آمد آمد ہے۔

پھر آج کس قدر خود نما اور شیخی خوری ہے۔ وہ میرے قریب کھڑی کہہ رہی تھی" اخاہ! مجھ سے بھی کیا حماقت ہوئی آج تو میری صرف ایک ہی گھنٹی لگے گی۔ باقی سارا وقت کالج میں بیکار گذر رے گا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ مصوری کا سامان اُٹھا لاتی" مجھے جتنی نفرت بناوٹ سے ہے اور کسی چیز سے نہیں ہے۔

(۴)

مجھے ابھی ابھی یاد آ رہا ہے کہ ابا جان نے ایک دن مجھ سے کہا تھا "تم ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے ؎

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

آج گلرخ نے تقسیمِ ملک کے خوفناک اور رلا دینے والے واقعات سُنائے۔ وہ نہیں جانتی کہ اُس کی باتیں سُن سُن کر میرا جگر کیسا چاک ہو گیا تھا۔

گلرخ کہتی ہے کہ مجھے رآنند کی بات مان لینی چاہیئے تھی لیکن میں ایک شرمیلی لڑکی تھی اور مجھے اُس کی بہت سی باتیں پسند بھی نہیں تھیں۔ وہ متکبر، جوشیلا، ہوس کار اور اخلاق سے قطعی بے بہرہ تھا۔ میں ہر چیز کو برداشت کر سکتی ہوں لیکن بداخلاقی سے سمجھوتا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے ایک مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس لئے کسی ایسی بات کو گوارا کرنا جس میں بداخلاقی کا شائبہ تک بھی ہو میرے لئے امرِ محال ہے۔ ایسے شخص سے اظہارِ محبت کرنا جو میرا شوہر نہیں بن سکتا گویا اُس شخص سے بددیانتی کرنا ہے جس سے میری شادی ہو گی۔ میں کسی کو دغا نہیں دے سکتی اور مجھے ظاہر داری سے نفرت ہے لیکن میری بات کون مانے گا۔ اُس کے سامنے مجھے شرم محسوس ہوتی تھی۔ دوسروں کے نزدیک میری شرم و حیا بے معنی ہے۔ مجھ سے کون ہمدردی کرے گا۔ آخر میں اتنی گھبرا کیوں جاتی ہوں؟ جب کبھی کوئی شخص میری جانب دیکھتا ہے تو مجھے دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔ کیا میں اس گھبراہٹ پر قابو پا سکتی ہوں؟ اس حالت میں عموماً ہکلانے لگتی ہوں۔ شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں میں کسی مرد کی گھورتی ہوئی نگاہ کی تاب نہیں لا سکتی۔ اس سے مجھے تکلیف اور بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے۔

مجھے ایک کتاب شروع کئے دو ہفتے گذر چکے ہیں۔ کاش کہ میں مطالعہ میں غرق ہو سکتی۔

آج کالج سے لوٹی تو امی جان نے سخت سرزنش کی کہ میں کیوں کالج کی تقریبات میں حصہ نہیں لیتی۔ مجھے ہر وقت گپیں نہیں ہانکنی چاہئیں، نہ اپنا وقت ضائع کرنا چاہیئے۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ مجھے وقت کے گذرنے کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ اب جبکہ میری گھڑی کھو گئی ہے۔ یہ بات اور بھی مشکل ہو گئی ہے۔ میں بستر میں لیٹ گئی۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ میں اپنے آپ کا سہارا نہیں لے سکتی۔ لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ میری سہیلیاں میرا مذاق اُڑاتی ہیں۔ کیا حقیقتاً میں کسی قابل نہیں ہوں؟ مجھے ہر کہیں نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ لوگ مجھ پر رحم کر سکتے ہیں لیکن مجھ سے محبت نہیں کر سکتے۔ میں نے کتنی اچھی گھڑی کھو دی ہے۔ میں کس قدر لاپرواہ ہوں!

میرے دل میں عجیب و غریب، تند و تیز جذبات مچلتے ہیں اور کئی سوال ابھرتے رہتے ہیں۔ کیا میں کسی قابل ہوں؟ کیا میں کوئی کام انجام دے سکتی ہوں؟ کیا میرا کوئی مقام ہے؟ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں چاروں طرف سے نفرت و حقارت میں گھر گئی ہوں۔ شاید زمین بھی میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہے۔ مجھے ہر کہیں اور ہر چیز میں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

(۵)

امی جان مجھ پر اور صبیحہ پر چار بجے سہ پہر سے لے کر آٹھ بجے شب تک لعن طعن کرتی رہیں۔ صبیحہ پر خفگی کا سبب یہ تھا کہ وہ مطالعے میں غفلت برت رہی ہے اور مجھ پر اس لئے ناراض تھیں کہ میں کئی دنوں سے بے قاعدگیاں کر رہی ہوں۔ امی جان کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ وہ دنوں غیظ و غضب میں چپ چاپ کھولتی رہتی ہیں۔ جب یہ طوفان ٹوٹ پڑتا ہے تو شعلہ گیر لاوے کی طرح ہر چیز کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ خدا جانے میرے اندر کون سی بات ہے جو مجھے گستاخی پر اکساتی ہے۔ امی جان نے مجھے نوکر اور لڑکیوں کے سامنے ڈانٹ بتائی۔ اگر وہ ضبط اور شفقت سے کام لیتیں تو میں اُن کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی۔ اگر وہ کہہ دیتیں "صنو، سر پیاری، پھر کبھی کالج سے آنے میں دیر نہ کرنا" یا "کالج کی تقریبات میں شرکت کرنے سے احتراز کرنا" یا کوئی غیر معمولی اقدام کرنے سے پہلے مجھے باخبر کر دینا" تو میں اپنا سر جھکا دیتی لیکن جب وہ کہتی ہیں "تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم لاعلاج ہو" تو قدرتاً میرے لبوں پر یہی جواب آتا ہے "کسی کو مجھ سے باز پرس کا حق نہیں پہنچتا۔ میں جو چاہوں گی کروں گی۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی"۔ میں نہیں جانتی کہ ایسے وقتوں میں کیا چیز میرے حلق کو جلاتی ہوئی اُبھر آتی ہے۔ یہ میرے اندر انقلاب کی آواز ہے۔ اپنے ابا جان کی غضبناک روح ہے جو ہمیشہ من مانی کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے پیار سے رام کیا جا سکتا ہے۔ صبیحہ ابھی تک روٹھی بیٹھی ہے۔ اُس نے کوئی چیز نہیں کھائی۔ کل رات سے امی جان اُسے منا رہی ہیں۔

کل رات میں نے لسی منگوا کر پی جس سے میں تر و تازہ ہو گئی اور میرے دل میں جو سوزش ہو رہی تھی وہ بھی رفع ہو گئی۔ البتہ پشت میں ہلکا سا درد باقی ہے۔ دریچے سے مسلسل باہر دیکھتے رہنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں پہروں اُس کے سامنے بیٹھی باہر دیکھا کرتی ہوں۔

(۶)

پونے چھ بجے ہیں۔ میں اڑھائی بجے سے بستر میں لیٹی پڑی ہوں۔ میں شاید قلم ہاتھ میں نہ لیتی لیکن عابدہ نے مجھے ایک بات اس انداز سے کہی کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اُس نے کہا "تمہاری بہن کہاں داخلہ لے رہی ہے؟ یہاں تو صرف عام قسم کی لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں۔ تمہاری بہن تو بے حد حسین ہے۔ میں جانتی ہوں وہ ایسے کالج میں داخلہ لے گی جو اُس کی شان کے شایاں ہو گا" یہ سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ آخر یہ لوگ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ میں بدصورت ہونے کی وجہ سے اس کالج میں پڑھ رہی ہوں۔ ممکن ہے یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہو۔ مجھے ایسے ماحول سے نفرت ہو گئی ہے جہاں لوگ اس قدر ظاہر داری اور تصنع سے کام لیتے ہیں۔

میں شروع سے ہی اپنے بزرگوں کے لئے ایک عقدہ بنی رہی ہوں۔ مجھے لوگوں سے ملنے ملانے سے سخت نفرت ہے اور میں اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ دوسرے لوگوں کی صحبت میں بدمزہ ہو جاتی ہوں۔ چونکہ سکول میں رہ کر میں بہت کچھ رو بہ اصلاح ہو گئی تھی لیکن وہاں کی فضا سے بھی مجھے نفرت تھی۔ تمام طلبہ اُن کا اندازِ گفتگو، اُن کا لباس اور اُستاد تک امریکیت کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں۔ معاشرتی علائق میں ان کا رویہ اس قدر کاروباری تھا کہ مجھے کہیں بھی کوئی صادق اور مخلص دل نہ مل سکا اور میں مایوس ہو گئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ میں اپنے گھر میں دلچسپی لینے لگی اور مہمانوں سے گھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ شروع شروع میں کام چل گیا لیکن مجھے اس بات کا سان گمان نہیں تھا کہ مجھے اپنے خلوص کی اتنی گراں قیمت

ادا کرنا پڑے گی اور جن سے اخلاص رکھوں گی وہ اُلٹا مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔

(۷)

اس وقت تین بجے ہیں۔ میں اپنے بستر میں آرام سے بیٹھی ہوں اور اس سوچ میں ہوں کہ میں کچھ عجیب سی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، سب مجھے قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ میں فلرٹ نہیں ہوں مجھے یاد ہے کہ ایک دن راشد نے کہا تھا "صنوبر! آج کے بعد تم ایک منجھی ہوئی فلرٹ ثابت ہوگی۔" میرے اللہ! کیوں بھلا؟ جب میں نے کبھی فلرٹ بننے کی کوشش ہی نہیں کی تو لوگ مجھے فلرٹ کیوں سمجھنے لگیں گے۔ وہ شیطان خود بھوت بن کر میرے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا۔ اس کی سب سے بڑی خباثت یہ تھی کہ وہ دوسروں کے سامنے ایسا کرتا تھا۔ وہ جتاتا تھا کہ جو لوگ میرے ہم رتبہ نہیں ہیں، میں اُن پر حکم جتاتی ہوں۔ لیکن مجھے یہ احساس ستانے لگا کہ میں محض ایک لڑکی ہوں ایک بدصورت لڑکی، جو ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو انتہائی قدامت پسندی کے ساتھ آزادروی کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میں دلیر اور ذہین ہونے کے باوجود انتہائی شرمیلی بھی ہوں۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا "میں عورتوں کو پسند نہیں کرتی، وہ بڑی باتونی ہوتی ہیں۔" اور اس نے میری تائید کی تھی۔ میں جب سوچتی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کہا تھا تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سبب وہ بناوٹ، تنگ نظری اور کمینگی ہے جو عام طور سے عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ایسی معمولی باتوں کے مطالبے کرتی رہتی ہیں کہ جن کا پورا کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مزید براں وہ احمق اور بے رحم ہوتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ اُس نفرت کا اظہار کیسے کروں جو مجھے عورتوں سے ہے۔ عورتوں کی جن عادات سے مجھے نفرت ہے۔ وہ صابرہ عالیہ اور کچھ آج میں پائی جاتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ بعض مردوں میں بھی یہ عادات پائی جاتی ہیں لیکن اس قسم کے مرد دراصل زنخے ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک علوِ نظر، سنجیدگی، محبت اور ہمدردیٔ انسانی مثالی خوبیاں ہیں۔

مجھے وہ رات یاد ہے جب میری ماموں زاد ساجدہ آئی اور کہا "صنوبر! اٹھو" میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور صحن میں لے آئی اس وقت غالباً رات کے ایک بجے کا عمل ہوگا۔ صحن میں جا کر مجھے محسوس ہوا جیسے ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر کو سہلا رہا ہے۔ کیا دیکھتی ہوں کہ راشد پاس کھڑا ہے۔ وہ کہنے لگا "مجھے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو۔ تم سے ملنے کے لئے اتنی دور سے آیا ہوں۔" اس لمحے جب اُس نے یہ بات کہی، چاروں طرف سے ہجوم کرکے آتی ہوئی تند و تیز ہواؤں کا ایک طوفان تھا جو میرے سراپا پر چھا گیا۔ میں غریب گھبرا گئی۔ میری دوسری ماموں زاد بہنیں مجھ سے نفرت کرنے لگیں اور طرح طرح سے جتانے لگیں کہ دیکھنا اپنی حدود میں رہنا۔ انھوں نے بڑی سنگدلی سے میرے بدنی نقائص کا ذکر کیا اور کہنے لگیں "راشد تو شروع سے ہی ہر ایک کی ہاں میں ملانے کے عادی ہیں۔" اس سے میری پریشانی میں اور اضافہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ اگر راشد کو مجھ سے محبت تھی جیسا کہ وہ دعویٰ کرتا پھرتا تھا تو اس نے اس کا واشگاف اظہار کیوں نہ کیا اور تردد و تذبذب میں کیوں پڑ گیا۔ اُس نے حوصلہ مندی سے یہ کیوں نہ کہا "میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم لوگ اُسے ناپسند کرتے ہو۔ اُسے کوئی بھی پسند نہ کرے۔ اُس سے شادی کرنے میں مجھے نقصان بھی ہوگا۔ جب تم کہو گی میں اُس سے شادی کروں گا لیکن میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ میں ساری عمر تمہارے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ تمہیں خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں اپنے آپ کو خوش کروں گا۔" سب کہنے لگیں "صنوبر بڑی بدصورت اور پھوہڑ ہے" اُن کا یہ خیال صحیح تھا۔ امی جان نے مجھے لاڈ سے پالا تھا مجھے گھر کے کام کاج کا سلیقہ نہ آ سکا۔

اس معاملے کا بدترین پہلو یہ تھا کہ ہر کوئی کہنے لگی، صنوبر خود راشد سے شادی کرنے کی خواہشمند ہے۔ یہ غلط تھا۔ میں نے انھیں کہا بھی کہ یہ بات نہیں ہے لیکن میری سنتا کون تھا۔ میرے منہ سے نکلے ہوئے ادھورے فقروں اور بے تکے الفاظ کو انھوں نے دوسرے ہی معنی پہنائے

اور راشد سے کہا "دیکھو یہ کیسی عصبی المزاج ہے"۔ میں شرم کے مارے جھینپ گئی تھی۔ اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں اس قسم کے حالات کو ہمیشہ ناپسند کرتی رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ مدافعت نہیں کر سکوں گی۔ مجھے ایک محافظ کی ضرورت تھی لیکن مجھے گومگو کے عالم میں چھوڑ دیا گیا۔ میں اُس سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ وہ اس قدر بزدل ثابت ہوگا۔ اس کے عشق و محبت کا سارا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ یہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ایسے شخص سے نفرت کئے بغیر نہ رہ سکی۔ جو اعلانیہ مجھ سے اظہارِ محبت کرتا رہا اور چند عشقیہ خطوط لکھنے کے بعد دُم دبا کر بھاگ گیا۔ اُس وقت مجھے یوں لگا کہ کچھ بھی ہو میری شادی اُس سے ضرور ہونی چاہیئے ورنہ مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ وہ میری مشکلات سے واقف تھا وہ سب کچھ جانتا تھا اور تحمندی کے انداز سے مسکرایا کرتا۔ دن رات وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا جب وہ با آواز بلند یا سرگوشیوں میں مجھے کہا کرتا "صنوبر! خدا کے لئے ایک بار یہ کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میرا دل دھڑکتے دھڑکتے رک جائے گا اور میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ میں جانتا ہوں میری شہرت اچھی نہیں ہے۔ آؤ میں اور تم جنوبی امریکہ بھاگ جائیں۔ میں تمہارے لئے شکار کروں گا۔ تمہارے لئے کھانا پکاؤں گا۔ جب میں مر جاؤں گا تو مجھے دفن کر کے گھر چلی آنا۔ تم کہتی ہو کہ وائلڈ اخلاق باختہ تھا۔ آخر اخلاق ہے کیا چیز؟ اچھا میں اُس لڑکی سے شادی کروں گا جس کا انتخاب میرے گھر والے کریں گے لیکن تم سے بھی بالضرور شادی کروں گا۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔

میں حواس باختہ تھی اور میرے منہ سے بات تک نہ نکل سکی۔ میں اپنی ماموں زاد بہنوں کی قہرآلود نگاہوں کو دیکھ دیکھ کر سوچا کرتی اور ورد سے پھٹتے ہوئے سر کے ساتھ سوچا کرتی کہ اس تمام ہرزہ سرائی کے بعد بھی راشد نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں مغرور تھی اور کسی شخص کا ممنونِ احسان ہونا ناپسند کرتی تھی۔

راشد ہوس پرست جذباتی اور جوشیلا تھا وہ غنڈوں کے لہجے میں ایسی سرگوشیاں کرتا رہتا جن کو دوسرے بھی سن سکیں۔ کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھ کر وہ کہہ دیتا "کمر تو بہت باریک ہے۔ اس نے تمہارے اندر بلا کی کشش پیدا کر دی ہے۔ پوری جوان ہو جاؤ گی تو چاہنے والوں کے جمگھٹ میں گھر جاؤ گی"۔ میں ان باتوں سے پناہ لینے کے لئے امی کے پاس چلی جاتی لیکن وہ کاغذ کے پُرزوں پر یہ اس لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا کرتا۔ وہ جانتا تھا کہ میں انہیں پھینک نہیں سکتی۔ میں اپنی امی اور ماموں سے ڈرتی تھی۔ وہ کہتا "صنوبر! تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں؟ تم تو مجھے اپنا ہاتھ بھی چھونے نہیں دیتیں۔ تم تو بالکل فاختہ جیسی نازک ہے کس سی لڑکی ہو۔ تم کبوتری ہو لیکن بلی کے پنجے بھی رکھتی ہو"۔ پھر چلانے لگتا "میں سماج کا سر پھوڑ دوں گا۔ یہ سماج ہے سماج"۔

میں کہتی "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم جانتے ہو میری تمہاری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں خود بھی تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ براہ کرم اپنے رشتہ داروں کے دلوں سے یہ شبہات دور کر دو"۔

وہ کہتا "تم چپ رہو۔ ان معاملات میں لڑکیاں دخل نہیں دے سکتیں۔ تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

اور میرا دل جو حقیقتاً حساس اور ڈرپوک تھا ڈوب کر رہ جاتا۔

وہ چند دن میرے لئے درد و الم کی صدیاں بن گئے۔ اس نے ایک دن امی جان سے بڑی مستعدی سے کہا "میں سفر میں آپ کی رفاقت کروں گا۔ وہ خوش تھیں کہ مرد کا ساتھ ہو گیا ہے۔ وہ چند دن ہمارے ہی پاس رہا اور میرے عزیزوں سے کہتا پھرا "میں تو صنوبر سے شادی کر رہا ہوں۔ لیکن یہ بات صیغہ راز میں رہے۔ میرے عزیز اس رشتے کے مخالف ہیں"۔ ایک دن اس نے مجھے سول میرج کے لئے بھی کہا۔ میں نے جواب دیا۔ ایسا ہرگز نہیں ہونے کا۔ میرے ماں باپ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں جب کبھی میں کالج سے دیر سے آتی ہوں اور امی جان مجھے سخت سست کہتی ہیں تو ابا جان کہتے ہیں

اُسے مت کچھ کہنا۔ اس کی رگوں میں میرا خون ہے۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جس سے اس کے خاندان کی رسوائی ہو۔" میں نے دانستہ کہا "میں جذباتی نہیں ہوں۔ میں ایک فلم ایکٹرس کی طرح کبھی بھی تم سے محبت نہیں کروں گی۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو متعلقہ لوگوں کو رضامند کرو۔ ایسا نہیں کر سکتے تو باغیانہ و انشگاف طریقے سے تمام دنیا کے سامنے اعلان کر دو۔" لیکن اس میں جرأت کہاں تھی۔ وہ مایوس ہو کر بھاگ کر چلا گیا۔ اب اس نے مجھے ستانے کا نیا طریقہ اختراع کیا۔ وہ اپنی تجاریز کا ذکر خطوط میں کرنے لگا۔ وہ مجھے لکھتا "تم بدصورت ہو، میں حسین ہوں۔ تم بے مایہ ہو، میں متمول ہوں۔ تم ایک معمولی سی لڑکی ہو، میں ایک افسر ہوں۔ تم نے میری بات نہ مانی تو میں تمہارا ناطقہ بند کر دوں گا۔ میں نے ہمیشہ تمہارے رشتوں میں رخنہ اندازی کی ہے۔ اور میں دیکھوں گا کہ کون تم سے شادی کر سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو تم میری ہو کر رہو گی۔

اُس کی آواز سریلی تھی اور وہ عامیانہ پنجابی گیت گایا کرتا اور کہتا یہ تمہارے لئے ہیں۔ بعد میں یہ گانے لگا ع

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے

مجھے یاد ہے کہ کبھی کبھی یہ گایا کرتا تھا ؎

شامِ غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم   آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم

اور کبھی ع

ڈھونڈ لایا ہوں گیت میں تیرے لئے

کبھی کہتا "کیا تم نے کبھی گھوڑے کی سواری بھی کی ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تم سواری کرو" اور پھر "وہ کونسا دن تھا جب میں تجھ پر عاشق ہوا تھا۔ پتہ نہیں اتنی پیاری کیوں لگتی ہو۔ میں ہر رات تمہیں یاد کرتا ہوں۔ جب تک تمہیں یاد نہ کروں مجھے نیند نہیں آتی۔ میں جانتا ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا لیکن تم ایسی پیاری ہو کہ میں تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے پاس نہ آؤں لیکن تم نے مجھے بے اختیار کر دیا ہے ..... جہنم میں جائے تمہاری نیک نامی۔ میں اپنے آپ کو خوش کروں گا۔ تمہیں میری خواہش کا کوئی احترام نہیں ہے۔ مجھے تمہاری نیک نامی کی کیا پرواہ ہے میں ساری دنیا کے سامنے تمہیں غلط ثابت کر کے دم لوں گا۔ تم سے کوئی بھی شادی نہیں کرے گا۔ تم پہلے ہی بدصورت ہو۔ میرا نام تمہارے چہرے کا ایک اور بدنما داغ بن جائے گا۔ تمہیں کوئی بھی سہارا نہیں دے گا۔ میں تمہیں عبرتناک سزا دوں گا۔ کیوں؟ تم مجھے اچھی جو لگتی ہو۔ اتنی پیاری جو لگتی ہو۔"

میں سوچا کرتی کہ کہیں ڈوب مروں۔ اُس نے اتی جان سے کہا کہ مجھے ہوسٹل میں داخل کرا دیا جائے۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں ڈرتی تھی کہ وہ شہر بھر میں میرا پیچھا کرتا پھرے گا۔ کالج ہمارے گھر سے خاصا دور تھا۔ وہ مجھے ڈرایا کرتا "تو مجھ سے ڈرا کر، کسی دن تجھے اٹھائے جاؤں گا۔"

میں کہتی "شرم کرو"

وہ جواب دیتا "ما قرتی پنجے دکھاتی ہے۔"

میں نے پیچ و تاب کھا کر کہا "جہنم میں جاؤ۔ زبان بند کرو۔ اب کبھی میرے سامنے مت آنا۔"

لیکن وہ جانتا تھا کہ میرے غصے کے پیچھے آنسو چھلکنے لگتے ہیں۔ وہ مسکرا کر زیرِ لب کہنے لگا "صنوبر! صنوبر! صنوبر!"

مجھے یاد ہے کہ وہ بلند آواز میں میرا نام پکارا کرتا اور عام طور سے مجھے "بھئی صنوبر" کہہ کر مخاطب کیا کرتا۔ ہم کبھی کبھار شام کو سیر کے لئے جایا کرتے تھے۔ میری ماموں زاد بہنیں بھی ساتھ ہوتیں۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلتا اور بے تکلفی سے پورے زور سے چلا کر میرا نام پکارتا۔ ساجدہ نے اُسے خاموش رہنے کی تاکید کی لیکن وہ باز نہ آیا۔ میں بوکھلا جاتی۔ میرا جی چاہتا کہ یہاں سے بھاگ نکلوں۔ مجھے ان باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔

دو دن گذرے مجھے احساس ہوا تھا کہ بہار آ رہی ہے۔ اس وقت مجھے ایک عجیب و غریب سا خیال آ رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اسے تخیل کا

کرشمہ سمجھوں یا زاہمہ قرار دوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں ایک سیاہ دوپٹہ جس پر ستارے ٹکے ہوں، اوڑھ کر باہر صحن میں چارپائی پر جا لیٹوں۔ آنکھیں بند کر لوں اور شیریں نیند میں اپنے تمام دکھ درد غرق کر دوں اور ایک بار پھر ننھی منی بچی بن جاؤں۔

بعض باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں میں قلمبند کرنا چاہتی ہوں، لیکن اپنے میں ہمت نہیں پاتی۔

گلرخ آج بڑی بے مروتی اور سرد مہری سے پیش آئی۔ وہ کیوں مجھ سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟ میں اٹھارہ برس کی تھی جب ان الجھنوں میں پھنس گئی۔ بالکل ناکردہ کار۔ مکھن کی گولی کی طرح جسے کسی بات کا علم نہ ہو اور جو معمولی سی بات پر پگھل جائے۔ مکھن سے مجھے راشد کی ایک بات یاد آ گئی۔ وہ کہتا تھا "میرا جی چاہتا ہے کہ بس تجھے کھا جاؤں۔ وہ اپنا منہ کھولتا اور مجھے کہتا "آؤ میرے جبڑوں میں آ جاؤ۔ میری زبان پر بیٹھ جاؤ میں تم پر دانت نہیں چلاؤں گا۔"

(۸)

کل میں تمثیل دیکھنے گئی تھی۔ صبیحہ اور گلرخ کے تبصرے میرے لئے خیال انگیز تھے۔ ایک فقرہ اب تک میرے ذہن میں مچل رہا ہے" وہ اُسے تباہ کر گیا ہے۔" یہ درست ہے لیکن ایسا نہیں جیسا کہ وہ سمجھتی ہیں۔ جب کبھی اُسے موقع ملتا راشد مجھ سے باتیں کیا کرتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب سے گذرتا اور سرگوشی میں ایسی بات کہتا جس سے مارے شرم کے میرا چہرہ تمتمانے لگتا۔ وہ کہتا "تو ایسے ہی منہ بگاڑتی ہے۔ یہ کوئی بُری بات تو ہے نہیں۔" میں اکثر اوقات اپنے آپ کو عجیب سا پاتی ہوں۔ میرا شرمیلا پن لا علاج ہے۔ یہ بات میرے بس کی نہیں ہے۔ میں مردوں اور عورتوں سے دوسرے معاملات پر آزادانہ گفتگو کر سکتی ہوں لیکن عشق و محبت کی بات نہیں کر سکتی۔ یہ عشق وشق پتہ نہیں مجھے کیوں گھٹیا سا لگتا ہے اور اس قسم کی باتیں ردی تھرڈ کلاس لوگوں والی لگتی ہیں۔ جب کبھی وہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتا تو میں کلبیت آمیز تمسخر کی کیفیت محسوس کرتی۔ شاید میں اُس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں سنتی تھی۔ وہ میرے تمسخرانہ رویے سے گھبرا جاتا اور کہتا "تم میری بات نہیں مانتیں۔ میں تمہارے دل میں سوراخ کر دوں گا اور تم پچھتاؤ گی۔"

وہ اکثر اوقات مجھ سے پوچھتا "تمہارا رویہ نابالغوں جیسا کیوں ہے؟" اُسے معلوم تھا میں جانتی تھی کہ میں اُس پر بھروسا نہیں کرتی۔ وہ کاغذ پر بیسیوں منصوبے بنا کر میرے پاس بھیجا کرتا تھا لیکن میں جانتی تھی یہ سب بیہودہ باتیں ہیں مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ سخت مادہ پسند اور عملی قسم کا عقل پرست تھا۔ اُس کے کنبے کے سب افراد ایسے ہی تھے۔ میرا خاندان مختلف ہے۔ فرق صرف قدروں کا ہے، جنھیں ہم لوگ عزیز رکھتے ہیں۔ میرے خانوادے کے افراد زیادہ انسانیت پسند، زیادہ محبت کرنے والے، بامروت اور مذہبی قسم کے لوگ ہیں۔ میں بچپن سے ہی اپنے گھر کے لئے ایک عقدہ بن گئی تھی۔ میں شروع سے بڑی نازک اور خواب پرست تھی۔ میری بہن صبیحہ کی خواب پرستی کو ہمارے ابا جان کے قوی و عملی ذہن نے متوازن بنا دیا ہے۔ میری امی کے خاندان کے لوگ شاعر طبع، تخیل پرست اور فلسفہ دوست ہیں۔ ادبیت اور مذہبیت مجھے باپ دادا سے ورثے میں ملی ہے۔ میں خواب پرست تھی لیکن تلخ حقایق نے مجھے ایسا جھٹکا دیا کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میرے ماں باپ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ ان میں طبائع کے اختلاف کے باعث کبھی بھی موافقت نہیں ہو سکی۔ دونوں سخت ضدی ہیں اور اپنی اپنی بات منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس چیز نے میرے اندر کلبیت پیدا کی ہے۔

میں اڑھائی برس کی تھی کہ امی بیمار پڑ گئیں اور نانی جان نے ہم دونوں کو ابا جان کے پاس بھیج دیا۔ جانبین میں ڈیڑھ برس تک ناراضگی رہی اور امی جان نے ہماری خبر تک نہ لی۔ وہ تو آنا چاہتی تھیں لیکن نانی جان مانع ہوئیں۔ ہمیں ہماری سوتیلی امی نے پالا۔ وہ ہم سے بہت پیار کرتی تھیں اور ہم بھی مامتا سے محروم ہونے کے باعث اُن سے مانوس ہو گئیں۔ آخر امی جان گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہمارے پاس آ گئیں۔ انھیں یہ خیال

سنایا کرتا تھا کہ میری بچیاں گلیوں میں آوارہ گھومتی پھریں گی۔ وہ ہمارے لئے اداس بہت تھیں لیکن ہمارے اور اُن کے درمیان ماں بیٹی کا دلی رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ ہم اُن سے جدا نہ کی جاتیں تو شاید یہ رابطہ قائم ہو جاتا۔ میں نے انھیں پہچان لیا لیکن سیمہ نہ پہچان سکی۔ امی جان نے نوکری کر لی اور ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن ہماری سوتیلی ماں اس پر رضامند نہ ہوئیں۔ آخر ابا جان نے اُنھیں مجبور کیا اور انھوں نے بادلِ ناخواستہ ہمیں رخصت کیا۔ عجیب بات ہے کہ ہماری سوتیلی امی ہماری امی جان سے سخت نفرت کرتی تھیں لیکن ہم سے پیار کرتیں۔ اب میں محسوس کرتی ہوں کہ یہ محبت روز بروز کم ہو رہی ہے۔ ہمارے ابا جان سیمابی طبیعت کے طاقتور آدمی ہیں۔ وہ ہمیشہ گوناگوں مشاغل میں مصروف رہتے ہیں اور کوئی کام نہ ہو تو بیمار پڑ جاتے ہیں۔ آدمی باذوق ہیں، کسی نہ کسی لڑکی سے فلرٹ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ماموں ایک عالیشان بنگلے میں رہتے تھے لیکن ہماری امی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔ میرے بڑے ماموں شروع سے متکبر اور خود غرض ہیں۔ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں لیکن بیوی کے دست بستہ غلام ہیں۔ یہ خصوصیات ایک حد تک راشد میں بھی موجود ہیں۔ میں محسوس کرتی تھی کہ میں کبھی ایسے مغرور اور سنگ دل شخص سے ربط و تعلق نہیں رکھ سکوں گی جس کی اپنی کوئی رائے ہی نہیں تھی۔ میرے خیال میں وہ میری طرف اس لئے مائل تھا کہ نئی نسل کے افراد میں مجھے سب سے زیادہ عقیدت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے ادبیات اور فلسفے میں دلچسپی تھی اور سیاسیاتِ عالم میں درک رکھتی تھی۔ میں خوابوں کی دنیا میں بستی تھی اور صبح سویرے جاگنے پر گنگنایا کرتی تھی ؎

اُٹھیئے کہ اب تو لذتِ خوابِ سحر گئی

میری گفتگو طنزیہ نہیں تھی اس لئے لوگ میری باتیں سننا پسند کرتے تھے۔ میں اپنے آپ میں اس قدر مگن رہتی اور میرے بشرے پر ایسی افسردگی چھائی رہتی کہ خاندان کا ہر فرد مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ راشد شروع سے میرے طور طریقوں اور میری پسند و ناپسند کی نقالی کرنے لگا تھا۔ وہ میرے سامنے شعر پڑھتا اور ایسی کتابوں سے کہانیاں سناتا جو میں نے نہیں پڑھی تھیں۔ وہ میری قدر بھی کرتا تھا اور میرے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا لیکن اس میں ناکام ہو کر وہ مجھ سے نفرت کا اظہار بھی کرتا تھا اور میری دل شکنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا۔ جب وہ ہارڈی اور جین آسٹن کے مرحلے پر تھا، میں پاسترناک کا "ڈاکٹر ژواگو" پڑھ رہی تھی۔

میرے ہم عمر مجھ سے سخت مرعوب تھے اور مجھے اپنی پروفیسر سمجھ کر محبت کرتے تھے۔ راشد کا رویہ ابتدا میں میرے ساتھ مربیانہ تھا لیکن میری جرح و تنقید نے اس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا۔ اس سے وہ میری قدر بھی کرنے لگا اور مسابقت پر بھی کمربستہ ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اس قدر دانی نے بعد میں محبت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اُس کے دوست میری ذہانت کی مبالغہ آمیز تعریفیں کیا کرتے تھے مجھے اس کے ادعائے محبت پر بھروسا نہیں تھا۔ میں نے اُس سے کہا: "تم میری ذات سے۔ ایک بے چاری بدصورت لڑکی سے محبت نہیں کرتے بلکہ میری ذہانت اور شہرت پر فریفتہ ہو۔"

جب میں بچی تھی تو میرے ماموں اور ممانی مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔ راشد کی امی جو ایک اوباش، بدقوارہ عورت تھی، کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس سے سارے خاندان کی ناک کٹ گئی۔ راشد اور اُس کا باپ کسی رشتے دار کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

راشد دیوانوں کی طرح مجھ سے باتیں کرتا تھا اور کہا کرتا تھا بس تم کو اپنی بنا کر چھوڑوں گا۔ میں ایک سرکش لڑکی تھی اور یہ بات سب کو معلوم تھی۔ میری نقالی میں راشد نے بھی گھر والوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا لیکن اُس میں اپنی بہنوں کے مقابلے کی سکت نہیں تھی۔ یہ بات میں نے اُس سے کی تو کہنے لگا "صنوبر، تم سچ کہتی ہو۔" ابتدائی خطوں میں وہ مجھے "مہارانی" کہتا رہا اور اس بُری طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑا کہ میں حیران تھی کہ کس طرح اُس سے جان بچاؤں۔ اب مجھے سکون میسر آ گیا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اُس زمانے میں اُس نے باتیں کر کر کے مجھے اپنے پاؤں سے

دکھا دیا تھا۔ یہ احساس ابھی تک میرے ذہن و قلب پر حاوی ہے۔ میں نے کبھی بھی اس سے محبت نہیں کی لیکن میرے دل میں ایسی تلخی پیدا ہو گئی ہے کہ ہر کہیں اور ہر وقت مجھے تکلیف دیتی رہتی ہے۔ گلرخ نے مجھے ہندی کا ایک دوہا سنایا تھا جو مجھے کبھی نہیں بھولتا اور میرے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ میں گلرخ کو چاہتی ہوں اس لئے نہیں کہ اس میں بھی راشد کی خوبیاں ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کی اپنی ذات میں بھی خوبیاں ہیں۔ وہ ذہین ہے اور راشد کی طرح دوسرے لوگوں سے آزادانہ مل جل سکتی ہے۔ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے اگرچہ بعض اوقات اُس کی طنز مجھے چڑا دیتی ہے۔ وہ ذہن رسا کی مالک ہے۔ بعض اوقات میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ سب سے زیادہ مجھ سے قریب ہے اور اب میں دنیا میں تنہا نہیں ہوں لیکن مجھے اُس کے تحائف قبول نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ سراسر حماقت ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتی۔

میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ مجھے گنہگار ہونے کا احساس کیوں ہے۔ ایک دفعہ ضمیر کے متعلق سوچتے ہوئے میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب ہم کوئی فعلِ شنیع کرتے ہیں تو قدرتاً ہمیں پشیمانی کا احساس ہوتا ہے لیکن جب کوئی دوسرا ہمارے ساتھ ناحق زیادتی کرتا ہے تو ہم کیوں پشیمان ہوتے ہیں۔ مجھے اس کا کوئی جواب نہیں سوجھا۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ بظاہر اس کی وجہ یہی ہے کہ مجھ سے ایک شخص نے کہا تھا میں تم سے دیوانہ وار محبت کرتا ہوں، اُس کے رشتہ داروں نے اُسے منع کیا تو وہ اُن کے سامنے جھک گیا اور کہیں اور شادی رچا لی۔ میں نے اُس کے دعووں سے کبھی دلچسپی نہیں لی تھی بلکہ اُس سے دور بھاگتی رہی لیکن اُس کے باوجود اُس کی رشتہ داروں نے ایسے توہین آمیز کلمے کہے کہ میں قیامت تک اُن کی شکل دیکھنا گوارا نہیں کروں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں بے قصور تھی لیکن راشد اُن کا اَن داتا تھا اور میں ایک بے مایہ حقیر سی لڑکی تھی۔ اس قدر ناچیز کہ وہ مجھے اپنی انگلیوں میں کچل سکتی تھیں۔ راشد نے اس کا مطلب یہ لیا کہ میں اُسے ناپسند کرتی ہوں اور کسی اور سے شادی کی متمنی ہوں۔ میرے ذہن میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ میرا کیا قصور تھا اور مجھے کیوں اس قدر کڑی سزا دی گئی۔

(۹)

میں مطالعہ کی کوشش میں تھی کہ یکلخت مجھے خیال آیا کہ وہ دیوانگی، وہ وحشت جو راشد کے خیال سے وابستہ تھی اب بہت کچھ کم ہو گئی ہے۔ اس کے لئے میں اپنی سہیلی کی ممنون ہوں۔ میں اُسے سہیلی نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں نے بہنا پا اُس پر ٹھونس رکھا ہے۔ حقیقی دوستی تو دو طرفہ ہوتی ہے۔ میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ احساس کہ دنیا میں صرف میں ہی جانتی ہوں جو کچھ مجھے پیش آیا تھا ایک بھولے بسرے خواب کی دھندلی یاد میں بدل گیا ہے۔ یہ الفاظ میں اُسی قلم سے لکھ رہی ہوں جو راشد ہمارے ہاں بھول گیا تھا مجھے اس سے قبل کبھی اس قلم کو چھونے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ میں صمیم قلب سے دست بدعا ہوں کہ خدا میری سہیلی کو تمام عمر دلشاد اور بامراد رکھے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں انسانوں کو تولنے اور ناپنے کے حق میں نہیں ہوں۔ انسان شروع سے آخر تک انسان ہی رہتا ہے۔ مختلف انسانوں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے یا ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کا سبب ہو سکتی ہے، وہ حُسنِ اخلاق و کردار ہے۔ صداقت و دیانت ہے، ہمدردیٔ انسانی ہے، دل سوزی ہے جس کے بغیر آدمی انسان نہیں بن سکتا۔ ممکن ہے کہ تعلیم و تدریس سے انسان کی اصلاح ہو جائے لیکن اس بات کا امکان بھی ہے کہ تعلیم و تدریس اُلٹا اُس کو بگاڑ بھی دے۔ اگر تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کی چھوٹی موٹی فروگذاشتوں پر گرفت کر کے فخر و رعونت محسوس کرے تو مجھے جاہل ہی رہنے دیجئے۔ بات یہ ہے کہ کسی شخص کی قدر محض اس لئے کرنی ضروری نہیں ہے کہ کوئی مرد یا عورت خوبصورت حسین ہے یا کوئی ایم۔ اے ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ انسان ہے۔ کوئی شخص جتنا اپنی فطری نیکی کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوگا، اُسی نسبت سے اُس کا احترام بھی واجب ہونا چاہئے۔

ایک دن جب راشد گھنٹہ بھر میرے سامنے بار بار اظہارِ مدعا کرتا رہا اور میں غصے سے لال بھبھوکا ہو گئی اور چیخ کر کہا "کیوں؟" تو اُس نے کہا تھا "اس لئے کہ میں خوبصورت ہوں، ایک خوبصورت نوجوان جو چاہے کر سکتا ہے۔" میں نے اُس سے اتفاق نہیں کیا لیکن میں جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ دنیا میں بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے۔ گلرخ کہتی ہے کہ عقل و خرد کی جلا اور علم و فضل انسان کی خوبی کے لازمی اجزا ہیں اور دوسروں کی نگاہوں میں اُس کا مقام بلند کر دیتے ہیں میں اس بات کے جیسیوں جواب دے سکتی تھی لیکن ایک تو یہ کہ میرے جواب ٹھوس نہ تھے اور دوسرے میں اپنی گھبراہٹ کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ میں حیران ہوا کرتی ہوں کہ کون سی چیز میرے لئے فریبِ نفس کا باعث ہوتی ہے، میری گھبراہٹ یا میری جرأت؟ ان میں ایک کا فریبِ نفس ہونا یقینی ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مجھ میں دونوں موجود ہیں۔ یا تو میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی اور یا میرا ذہن اضداد کا مجموعہ ہے۔

(۱۰)

گلرخ دیر تک رد و قدح کرتی رہی لیکن میں اُس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ البتہ وہ سچ کہتی ہے کہ میرے لئے زندگی کے تلخ حقایق کا سامنا کرنا بہت ضروری ہے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں، اور ایسا کرنے کے لئے میرے اندر جرأت بھی ہے۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ایسا کرنے سے جو تھوڑی بہت خوشی مجھے میسر ہے وہ بھی فنا ہو جائے گی۔ میں صرف اپنے آپ کو بھلا کر ہی خوش رہ سکتی ہوں۔ میری ناخوشی کا اولین سبب اپنی بدصورتی کا احساس ہے۔ اس حقیقت کا سامنا کرنا میرے لئے اور بھی عذاب بن جائے گا۔ وہ کہتی ہے کہ میں فراڈ ہوں لیکن یہ صحیح نہیں۔ میں اپنے آپ کو مخلص اور راستباز پاتی ہوں۔ میری ماموں زاد بہنیں سب خوبصورت، تندرست، توانا اور معتدل مزاج ہیں۔ جب کبھی میرے والدین میری شادی کا ذکر چھیڑتے ہیں تو میرا خون کھول اُٹھتا ہے اور جب وہ ایم۔ اے اور ڈبل ایم اے کا قصہ لے بیٹھتے ہیں تو میں آپے سے باہر ہو جاتی ہوں۔ بعض لوگ مجھے نوکری کا مشورہ دیتے ہیں۔ مجھے لیکچرار بننے سے نفرت ہے۔ میری ایک عزیزہ کہنے لگی "کسی نہ کسی دن تم پرنسپل بن جاؤ گی"۔ میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ میں نوکری کو پسند نہیں کرتی۔ یہی بات میں نے نصرت سے کہی تو اُس نے ایسی قہرناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا گویا میں نے اُس سے کوئی چیز چھین لی ہے۔ آخر مجھ سے نوکری کرنے کی توقع کیوں کی جاتی ہے۔ میں کیوں شادی نہ کروں، اور بچے پیدا کر کے کیوں موٹی نہ ہو جاؤں؟ میں نے یہ دلیل محض چوڑ کر دی تھی۔ میرے ذہن کا ایک حصہ دوسرے حصے کے خلاف کشمکش کرتا رہتا ہے اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی۔ میں جانتی ہوں کہ زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے کسی مقصد کا تعین ضروری ہے اور اس کے حصول کے لئے عزم صمیم لازم ہے۔ میری مشکل یہ نہیں ہے کہ میری زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ میرے نصب العین دو ہیں اور دونوں خاصے قوی اور پرکشش ہیں، اور میرے راستے میں مزاحم ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل میں ذہنی بے حسی کی شکار ہو گئی ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کی رَو کے سپرد کر دیا ہے لیکن جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے اپنی بہتری کے لئے کرتی ہی رہتی ہوں۔ کل سے میرے سر میں یہ سودا سما رہا ہے کہ میں اپنی صحت کو درست کروں اس لئے خوب کھانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن زیادہ نہیں کھا پاتی۔ آج کے دن کے لئے میرے ارادے بڑے اچھے تھے لیکن مجھے حرارت محسوس ہو رہی ہے۔ گلرخ کہتی ہے میں تمہاری بہتری کے لئے تم سے اس قسم کی باتیں کیا کرتی ہوں لیکن میرے سر میں تپش سی ہے۔ میری بدقسمتی کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی میں دلی محبت، التفات، اور رہنمائی کے لئے خواہش کا اظہار کرتی ہوں تو لوگ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ میں اُن سے رحم طلب کر رہی ہوں۔ میں بار بار کہہ چکی ہوں کہ میں کسی کی ممنونِ احسان نہیں ہونے کی مجھے کسی کے رحم کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر گلرخ کیوں میری بات نہیں سمجھتی۔

(۱۱)

میرا خیال ہے یہ حادثہ میری ساری زندگی کو تاریک کر دے گا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک طوفان تھا، جہنم تھا۔ راشد نے اپنی شادی پر

مجھے ایک نہایت خوبصورت دعوت نامہ بھیجا۔ سب لوگ مجھے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب میں نے چیخ کر کہا کہ "اس خاندان سے ہم کوئی راہ و رسم نہیں رکھیں گے۔" تو امی جان حیران تھیں کہ میرا مطلب کیا تھا۔ وہ اصل بات نہیں جانتیں، صبیحہ جانتی ہے لیکن اُسے میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ کہتی ہے سارا قصور آپ کا اپنا ہے۔ آپ نے کیوں معاملے کو جاری رہنے دیا، کیوں نہ شروع میں ہی اس کا خاتمہ کر دیا۔ مجھ پر گنہگار ہونے کا احساس حاوی ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہی احساسِ معصیت میرے لئے بلائے بے درماں بن گیا ہے۔ پھر میں سوچتی ہوں اُس وقت میں بالکل نوخیز تھی، میری عمر صرف سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ میرے ماں باپ ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں فیصلہ نہ کر پائی کہ ان میں کون حق بجانب ہے۔ مجھے اپنی بدصورتی کا عذاب ناک احساس تھا۔ میں بے حد شرمیلی اور عصبی المزاج تھی۔ مزید براں اپنی کس مپرسی اور تنہائی کے احساس نے میری قوت سلب کر لی تھی۔ اس لئے میں نامساعد حالات کا سامنا کرنے سے قاصر تھی۔ اپنی طرف سے میں نے بچاؤ کی پوری کوشش کی۔ اُسے بارہا سرزنش کی۔ اُسے صاف صاف بتا دیا میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ اُس سے دور بھاگتی رہی۔ وہ بڑی چالاکی سے ایسے مواقع کی ٹوہ میں رہتا تھا جب وہ مجھ سے مخاطب ہو سکے لیکن اکثر اوقات میں اُسے بات کا جواب تک نہیں دیتی تھی۔ میں نے اُس سے پیچھا چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ برابر میرا پیچھا کرتا رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی قندیل کو اپنے دوپٹے سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ سب بے سود۔ اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔

میرے سامنے یہ سوال اُبھر رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے ذہن سے یہ تاثرات زائل کرنے کے لئے مجھے شادی کر لینی چاہئے۔ ہمارے عزیزوں میں ایک آدمی تھا جو خاصا آسودہ حال تھا لیکن وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اور چالیس کے پیٹے میں تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کا خواہاں ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات بھی نہیں کی لیکن اُس کی ذات سے مجھے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ابا جان نے اُسے بُری طرح لعنت ملامت کی۔ اتنی بدسلوکی تو شاید وہ اپنے کتے سے بھی نہ کر سکتے۔ یہ لوگ مجھ پر فخر کرتے ہیں اور میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ دل ڈوب ڈوب جاتا ہے اور میرے سراپا پر نقاہت طاری ہو جاتی ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں کرتی ہوں۔ مطالعے، کھانا پکانے، ہنسنے کھیلنے، خوش باش رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن میرے دل کو کچھ ہو گیا ہے۔ میں کیا کروں؟ صنوبر کیا کرے؟

ایک دفعہ میں نے ایک فلم دیکھی تھی جس کی ہیروئن نے کہا تھا "میں نے باپ کا کہا نہ مانا اس لئے میرا یہ حشر ہوا" لیکن میں تو بڑی عاقبت اندیش تھی۔ میں واہی تباہی بکتی رہتی لیکن میرا ارادہ براہ راست اقدام کا نہیں تھا۔ گلرخ کہتی ہے کہ میں سب کچھ بلا کم و کاست قلمبند کروں۔ شاید اس سے مجھے کچھ فائدہ ہو۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں، جو میری زبان پر آ سکتی ہیں نوکِ قلم پر نہیں آ سکتیں۔

مجھے خیال ہے کہ راشد اپنی جیب سے میری عکسی تصویر نکال کر کہتا "میں تمہاری نسبت اسے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ میں اسے اپنی جیب میں رکھ سکتا ہوں لیکن تم مجھ سے دور بھاگتی ہو، میرے قریب بھی نہیں پھٹکتیں۔ صنوبر! تم جانتی ہو مغرب میں رواج ہے کہ شرفاء خواتین سے ملتے ہیں تو اُن کے ہاتھ کا بوسہ لیتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اخلاقی پہلو سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ صنوبر! آؤ مجھے اپنا ہاتھ چومنے دو۔ اخاہ! تم تو ہمیشہ بھاگ جاتی ہو۔" یہ کہہ کر وہ میری عکسی تصویر کو چومنے لگتا اور میری موجودگی میں اُس سے خود کلامی کرتا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی۔ اور جی چاہتا کہ بھاگ جاؤں۔ مجھے علم تھا کہ وہ محض ایکٹنگ کر رہا تھا، عامیانہ قسم کی ایکٹنگ۔ میں کہنے لگی "یہ کیا مذاق ہے؟" اس نے جواب دیا "صنوبر یہ مذاق نہیں ہے۔ میں حقیقتاً یہ محسوس کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ اس کا سبب محض میری غیر معمولی قابلیت ہے۔" وہ بڑا دورخا تھا، اور یہ اس کے کردار کا نمایاں وصف تھا۔ اُس نے کہا صنوبر! جب میں نے تمہاری علالت کا سُنا تو مجھے اس قدر رنج ہوا کہ میں حواس

کھو بیٹھا تھا۔ میرے اندر باغیانہ خیالات سر اُٹھانے لگے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کسی انسان کو علمی قابلیت سے جانچنا کیا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ تو میرے اندر کوئی بھی خوبی نہیں ہے۔

اُس نے کہا "صنوبر! تم گالیاں دینا سیکھو۔ میں گالیاں پسند کرتا ہوں۔ میں تم کو جاپانی کشتی 'جوجٹسو' سکھاؤں گا۔ اور تم مجھے ایک لمحے میں چاروں شانے چت گرا دو گی۔ تم پہلے ہی مجھ پر چھا چکی ہو۔ نخی کمزور لڑکی! میں تجھ سے ڈرتا ہوں۔ ہاں میں! جو اپنی جنگلی سے تجھے جان سے مار سکتا ہوں۔ صنوبر! خدا کے لئے مجھے گالی دو مجھے اُلّو کا پٹھا کہو۔" میں نے کہا "خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اُسے معلوم ہو گیا کہ اُن دنوں میں عمر خیام کی شیدائی تھی۔ وہ کہتا: "صنوبر! مجھے بھی کچھ سناؤ۔ مجھے بھی خردمندی سے فیض یاب کرو۔" میں رباعیات پڑھنے لگتی اور وہ پرجوش جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشیاں کرنے لگتا "صنوبر! تمہاری آواز میں کیسے بھول سکوں گا۔ یہ شیریں رسیلی آواز۔ صنوبر! صنوبر!!" اُسے ایک رباعی پسند آئی: "شراب کا پیالہ ہو، شعروں کی بیاض ہو۔ تم میرے سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہو تو ویرانہ جنت بن جائے گا۔" میں گھبرا سی گئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں پہروں ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ یہاں سے اُٹھ کھڑی ہوں یا کسی سے بات کروں۔ میں نے اپنے آپ کو اپنی کیفیات کے سپرد کر دیا تھا۔

ایک دفعہ وہ ہمارے یہاں آیا۔ میں ہاتھ میں تولیہ لئے غسل خانے کی طرف جا رہی تھی۔ اچانک اُس نے دروازہ کھولا اور اس کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ اس قدر باتونی تھا کہ ہر وقت میرا اور امی جان کا مغز چاٹا کرتا۔ وہ امی جان کو خواہ مخواہ مشورے دیا کرتا۔ "صنوبر کو ہوسٹل میں داخل کرا دیجئے۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔ دونوں بہنوں کے رشتے کی بات مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں سب کچھ ٹھیک کروں گا۔ میں کسی فوجی افسر سے کیوں نہ سلسلہ جنبانی کروں؟"

"نہیں راشد!" میری امی کہتیں "میں آدمی کی ذہنی خوبیوں کو پسند کرتی ہوں اُس کی دولت سے غرض نہیں رکھتی۔ تم جانتے ہو میری بیٹیاں دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف ہیں۔ خاص طور پر صنوبر تو اچھی خاصی عقدہ بن گئی ہے۔"

"فکر مت کیجئے۔ میں اُسے ہموار کر دوں گا۔ یہ اتنی خاموش کیوں رہتی ہے آخر؟ اسے ایسا جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے کہ بس بالکل درست ہو جائے۔"

پھر سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہنے لگا "صنوبر! میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں پکڑ لوں اور خوب جھنجھوڑ دوں۔ میرے بازو دیکھو۔ ان کے پٹھے دیکھو۔ مجھ سے ڈرا کرو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے تن من کا ہوش نہیں رہتا۔ میں ڈرتا ہوں کسی دن تمہاری جان نہ لے بیٹھوں۔"

جب کبھی میں قریب ہوتی، وہ چائے گرا دیتا اور میری طرف گھور گھور کر دیکھتا رہتا۔ وہ کہتا "جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو مجھے چین آسٹن کے بعض کردار یاد آ جاتے ہیں۔ صنوبر! تم کسی ناول کی زندہ کردار ہو۔ ایڈوانچرس! میری ننھی فینی! میں تمہارے دل میں سوراخ کر دوں گا۔ کاش کہ تم ایک بھنگن ہوتیں اور میں بھنگی ہوتا۔ میری جان! ہم سڑک کے بیچ اپنی اپنی ٹوکریاں سر پر اُٹھائے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ناچنے لگتے۔" پھر کہا "میں تمہارے عزیزوں کو پسند نہیں کرتا۔"

"میرے عزیزوں کا ذکر مت چھیڑنا۔ میں کب تمہارے لوگوں کو پسند کرتی ہوں۔ میں اپنے رشتے داروں کو چاہتی ہوں۔ تمہیں مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آخر تم سمجھتے کیا ہو۔ آخر میں تمہاری لگتی کیا ہوں؟"

"تم میری نہیں بننا چاہتیں تو آخر چاہتی کیا ہو۔ بس اتنا کہہ دو میں تمہاری بیوی بنوں گی۔ ایک دفعہ صنوبر! صرف ایک دفعہ۔"

"نہیں! کبھی نہیں! بس اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔" میں نے چلا کر کہا۔

پھر جب وہ آیا تو میں فرش پر چٹائی بچھائے چھت کے برقی پنکھے کے نیچے لیٹی تھی۔ اُس کے بھاری قدموں کی چاپ سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ قریب کھڑا پیچھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اُٹھ بیٹھی تو وہ کہنے لگا "بالکل دُکرائی گئی ہو۔ میں نے باورچی خانے سے چائے بھجوائی۔ وہ تولیہ اُٹھائے غسل خانے کی بجائے باورچی خانے میں آ گیا۔ "تم جانتی ہو گھر والے میرے رشتے کی فکر میں ہیں خدا کرے اُس لڑکی کا باپ مجھے رد کر دے۔ میں اُس سے بازاریوں کی طرح پیش آؤں گا۔ تم میرا رشتہ کیوں نہیں کرا دیتیں۔ صنوبر! اب سب کچھ چھوڑ دو بس کسی سے شادی کر لو۔ تمہاری عمر اٹھارہ برس کی ہونے کو آئی اور ابھی تک تم دوسروں کی دست نگر ہو یہ ناقابل برداشت ہے۔ صنوبر! بعض اوقات میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں تمہاری اس حالت کو نہیں دیکھ سکتا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں تمہیں مار ہی ڈالوں۔ تم کیوں خواب آور گولیاں نہیں کھا لیتیں۔ کیوں پھانسی نہیں لے لیتیں۔ جیسا کہ تم خود کہا کرتی ہو میری جان! میں جانتا ہوں میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی ہے۔ میں تمہیں کسی دن جان سے مار دوں گا۔ اگلی دفعہ ضرور تمہارے لئے زہر لیتا آؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں کبھی بھی نہ بھول سکوں گا۔"

اُس دن صبیحہ نے اُسے بہت کچھ کہا۔ وہ کہنے لگی "آپ کیسے بے حیا ہیں۔ تعلق کے پردے میں آپ میری آپا کی زندگی برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتی کیونکہ آنسوؤں نے اُس کے گلے میں پھندا ڈال دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بدصورت ہے اور اگر آپ کے خلاف کچھ کہے گی تو کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ بس چلے جائیے اور کبھی بھی ادھر کا رُخ نہ کیجئے گا۔ آپ اُس سے شادی کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تو اس بے حیائی سے اُس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں نے آپ کو دوبارہ یہاں دیکھا تو میں اپنی امی جان کو سب کچھ بتا دوں گی اور نتائج کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔"

اُس نے ڈھٹائی سے جواب دیا "تم جو چاہے کہو۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں جب چاہوں گا اُس سے ملوں گا۔ میں اُسے یہاں سے لے جاؤں گا اور جہاں چاہوں گا رکھوں گا۔ اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا اور صنوبر! اب تم کو خط بھی نہیں لکھوں گا۔ لیکن میں جنت یا جہنم کے دروازے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ میں اُس وقت تک تمہارا تعاقب کرتا رہوں گا جب تک ہم دونوں میں سے ایک مر نہ جائے۔ میں تم سے دور ہوں گا، میرا دل تمہارے پاس رہے گا۔ میں خواہ شادی کروں، تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا۔ تم ہمیشہ میری ہی رہو گی۔" پھر صبیحہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "صبیحہ! براہِ کرم اس کا خیال رکھنا۔"

اُس نے جو تین خط اس کے بعد مجھے لکھے وہ میں گل رُخ کو دکھا چکی ہوں۔ وہ پھر نہ آیا۔ میں حیران ہوں کہ کیا کہوں۔ میرے ذہن میں عجیب و غریب خیالات ہجوم کر آتے ہیں۔ صبیحہ کہتی ہے کہ اُس نے مجھے فلرٹنگ کے لئے اس لئے منتخب کیا تھا کہ میں بدصورت ہوں اور وہ مجھ سے شادی نہ کرنے کے بارے میں حق بجانب ہے۔ یہ خیال اُس نے میرے ذہن میں ڈال دیا ہے۔ میں دن رات لرزاں رہتی ہوں، بھیانک خواب دیکھتی ہوں۔ میں نے اُسے کئی بار اپنے خوابوں میں دیکھا ہے۔ جب میری آنکھ کھلتی ہے تو اُس کے قرب کی آرزو مجھے ستانے لگتی ہے۔ میں خدا کا شکر کروں گی جب اس واقعہ کو بھلا سکوں گی۔ لیکن میری زندگی کا یہ نہایت اہم واقعہ ہے۔

(۱۲)

میرا خیال تھا اب قلم نہیں اُٹھاؤں گی لیکن کسی فوری جذبے نے مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا۔

آج نفیسہ ہمارے یہاں آئی۔ وہ کچھ لئے دیئے رہی اور میری تقریر کی تعریف اُس نے ایسے پھُس انداز سے کی کہ میں شرمسار ہو گئی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ میری تقریر میں جابجا اصلاح کی گئی تھی۔ مباحثے کے نقطۂ نظر سے البتہ خاصی تھی۔

میں کئی دنوں سے یہ محسوس کر رہی ہوں کہ نفیسہ، مسرت اور صالحہ مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھتی ہیں۔ خاص طور پر مسرت بڑے تکلف سے پیش آتی ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ میں ایسی لڑکی ہوں جسے بڑی آسانی سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ ملاطفت کا ایک لفظ مجھے خوش کرنے کے لئے کافی ہے لیکن گلرخ کو ایسے مذاق تو نہیں کرنے چاہئیں جو ترش و تلخ اور طعن آمیز ہوں۔ اس سے مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں بدصورت ہوں لیکن کسی کو میرا تمسخر تو نہیں کرنا چاہیئے۔

(۱۳)

میں کل سے بڑی افسردہ ہوں۔ میں نے گلرخ کو اس کا سبب بتایا لیکن اس نے ایسی بے رُخی برتی کہ میری اذیت میں اضافہ ہو گیا۔ گھر پہنچی تو امی جان نے میرے لتے لئے اور مجھ پر کئی الزامات لگائے (۱) میں اُن کی اجازت کے بغیر ایک سہیلی کے یہاں چلی گئی تھی اور ابا جان میرے انتظار میں بیٹھے رہے۔ (۲) میں نے اپنی گھڑی کھو دی تھی۔ (۳) میں دوبارہ دیر سے پہنچی (۴) میں نے امی جان سے پوچھے بغیر قیمتی شال خرید لیا۔ (۵) میں نے اپنا آویزہ اور کتابیں کھو دیں۔ (۶) میں اپنی صحت کی پروا نہیں کرتی۔ مختصراً یہ کہ میں لاپروا ہوں۔ جمیجہ بھی امی جان کی ہمزبان تھی اور کہتی تھی کہ میں لوگوں پر حد سے زیادہ اعتماد کرتی ہوں۔ ہر کوئی کہتا ہے بہت سیدھی ہے۔ اس کے باوجود میں ضد کرتی ہوں۔ امی جان نے کہا تم غائب دماغ ہو اس لئے تمہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو سزا دینی چاہیئے۔ شاید میری آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ جمیجہ نے امی جان سے کہا "اب بس کیجئے" میں باورچی خانے میں چلی گئی اور اُن کے ساتھ چائے پی۔ واپس آ کر لکھنا شروع کیا۔

میں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ میں جان بوجھ کر بے وقوف بنتی ہوں۔ اس پر میں گلرخ کا یہ قول اضافہ کرنا چاہتی ہوں کہ میں مثالیت پسند ہوں۔ میں مثالیت پسند سے بھی کچھ زیادہ ہوں۔ میں خواب پرست ہوں معمولی حقائق کی بنا پر ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتی ہوں جو حالات کے معمولی سے تغیر سے دھڑام سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہر ایک سے خلوص اور نیکی کی اور اکثر سے ہمدردی اور دلی محبت کی اور چند ایک سے خصوصی محبت کی توقع رکھتی ہوں میں اُن خوبیوں پر اعتماد کرنے لگتی ہوں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ چند دن ہوئے امی جان مجھے سرزنش کر رہی تھیں اور میری آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں جب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ یا تو مجھے زندہ نہیں رہنا چاہیئے اور یا زندگی سے کوئی خاص توقع وابستہ نہیں کرنی چاہیئے۔ میں زندگی سے نباہ نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے کسی سے رحم اور ہمدردی کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے لیکن اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ لوگ میری طرف ملتفت ہوں اور میری رہنمائی کریں مجھے کسی نہ کسی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

امی جان اس وقت جمیجہ سے کہہ رہی ہیں "منیر بیگم سی رہتی ہے" میری بے چاری پنجابی امی یہ نہیں جانتیں کہ اُن کی بیٹی دیوانگی کے کس قدر قریب ہے۔ اگر میں کسی نہ کسی طرح مر نہ سکی تو پاگل ضرور ہو جاؤں گی۔

اس گلرخ نے آج میرا مزاج برہم کر دیا۔ میں اُسے پسند کرتی ہوں میں اس سے محبت کرتی ہوں شاید اس لئے کہ اُس میں وہ خوبیاں ہیں جو مجھ میں نہیں ہیں۔ اگر راشدہ میں گلرخ کا دل، اس کی قوتِ کردار اور استقلالِ رائے ہوتا تو میں اُس کی کنیز بن کر رہتی۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ اس پر میرا اعتماد بیجا نہیں ہے۔ راشدہ قابلِ اعتماد نہیں تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ میں دوسری لڑکیوں کو کیوں اتنا پسند نہیں کرتی۔ اس کا سبب جو میرے تحت الشعور میں اُبھرتا ہے یہی ہے کہ وہ میری دسترسی سے باہر ہیں۔ میں نہیں جانتی مجھے یہ احساس کیوں ہوتا ہے کہ گلرخ تک میری رسائی ہے۔ آج وہ مجھے اپنے سے بہت دور اجنبی سی دکھائی دی۔ اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ کیا وہ اتنی ہی احمق ہے کہ یہ نہیں جان سکتی کہ میں اپنے دل کی گہرائیوں میں کیسی بے کراں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔ اگر مجھے زندہ ہی رہنا ہے تو میری مثال اُس شکستہ کشتی کی ہو گی جو طوفانی سمندر میں ہچکولے کھاتی رہتی ہے۔ ایک افسردہ روح۔

یکہ و تنہا، کلبیت کی شکار۔

آج کل میں غیر معمولی نقاہت محسوس کرتی ہوں۔ گرما کا آفتاب مجھے ناگوار گذرتا ہے۔ مجھے دورانِ سر ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی صحرائے لق و دق میں کھو گئی ہوں، تپتی ہوئی ریت پر تنہا کھڑی ہوں جب کہ چندھیا دینے والی روشنیاں میری بصارت کو مجروح کر رہی ہیں۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔ میرا سر تھک گیا ہے۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے لیٹ جانا چاہئے۔

امی جان کہہ رہی ہیں۔ سونا گم ہونا بدشگونی ہے۔ کون بتائے کون سمجھائے کہ میں خود سب سے بڑا شگون ہوں، سب سے بڑی نحوست ہوں۔ اپنے لئے بھی، اوروں کے لئے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا ایک وادیٔ خار زار ہے اور میں کس قدر ناتواں ہوں۔ "دنیا میں رہنا کوئلوں کی دلالی کرنا ہے یدِ بیضا بھی ہو تو سیاہ ہو جائے۔" امی جان کہتی ہیں کہ میں نے روپیہ کمانے سے پہلے اُسے اُڑانا سیکھا ہے۔ یہ بات خاصی پریشان کرنے والی ہے۔ میں نوکری کرنا پسند نہیں کرتی۔ میرا رنگِ طبع ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میں بہت کم زور واقع ہوئی ہوں مگر خود دار ہونے کے علاوہ کسی کا حکم برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ہر وقت پیار کی پیاسی رہتی ہوں کہ کوئی مجھ سے پیار کرے جیسے بلی کو سہلایا جاتا ہے۔ جناب ماہرِ نفسیات! آپ جو بھی خیال کریں۔ میرے احساسات اس قدر گمبھیر ہیں کہ ان کا تجزیہ ممکن نہیں ہے اور میں اس قدر سیدھی سادی ہوں کہ میرا تجزیۂ نفس کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو میں کب کی اپنا تجزیۂ نفس کر چکی ہوتی۔ مگر رخ کہتی ہے میں ایماندار ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نیکی کرنے پر مجبور ہوں۔

جب کبھی میں فلسفے کا مطالعہ کرتی ہوں یہ خیال میرے لئے انقباض کا باعث ہوتا ہے کہ کوئی نظریہ بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ مجھے ان نظریات کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا ہی ہوگا۔ کیونکہ اکثر سے مجھے اختلاف ہے۔

(۱۴)

میں نے ابھی ابھی ایک خوبرو امریکن کی عکسی تصویر دیکھی ہے جو پاکستان کے غریب لوگوں کو ٹیکے لگا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میں متاثر ہو گئی ہوں۔ میں بھی کیوں نہ اپنی زندگی خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دوں۔

جب میری گھڑی کھو گئی اور آویزہ گم ہوا تو جو توہین آمیز باتیں مجھ سے کہی گئی تھیں وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ آخر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ انھیں چرانے والوں کو کوئی بُرا بھلا نہیں کہتا۔ مجھ پر سب لعن طعن کرتے ہیں۔ لاپروائی بے شک کوتاہی ہے لیکن اتنا سنگین جرم تو نہیں ہے۔

میں سونے کی کوشش میں تھی کہ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے کہیں لکھا تھا کہ راشد نے میرے ساتھ جو بدسلوکی کی تھی اُس نے میرے اندر احساسِ معصیت پیدا کر دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری بدصورتی نے میرے اندر یہ احساس پیدا کیا ہے۔ میرا کیا قصور تھا سوائے اس کے کہ میں ایسے حالات کی شکار ہو گئی جو میرے لئے نامساعد ثابت ہوتے۔ اس بارے میں وہ لوگ کیا کہیں گے جو ذمے داری کے مسئلے پر بحثیں کرتے ہیں اور جو بُرا کام کرنے والے کی پشیمانی کا ذکر کرتے بیٹھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ میاں اپنے شاندار عرش پر خوش بیٹھے ہوں گے اور راشد اپنی حسین بیوی کی صحبت میں شاداں و فرحاں ہوگا، اور ہر شخص کے لئے کوئی نہ کوئی چیز مسرت بخش ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ لوگوں نے جو ظلم و ستم مجھ پر روا رکھا ہے کیا اس کا خیال ان خوش و خرم لوگوں میں کسی کو آتا ہوگا۔ لیکن میں کیوں غمزدہ ہوں۔ میں کیوں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرتی ہوں اور اس بات پر کیوں خجلت اور پشیمانی محسوس کرتی ہوں جو میں نے کبھی کی ہی نہیں۔

جو قصور مجھ سے سرزد ہوتا ہے میں اس پر افسوس کا اظہار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ امی جان کے سب الزامات صحیح ہیں۔ میں پشیمان ہوں اور آئندہ محتاط رہوں گی۔ میں کسی نہ کسی دن بالضرور اپنی جان لے کر رہوں گی۔ مجھے ہمیشہ سے یہ تلخ احساس ستاتا رہا ہے کہ لوگ مجھ سے کما حقہٗ محبت نہیں

کرتے۔ میرا احترام نہیں کرتے۔ پھر میں سوچتی ہوں کہ اپنی صحت کو بحال کرنے کی کوشش کروں۔ یہ سب کچھ مجھی پر منحصر ہے۔ دونوں خیالات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ میں کوشش کروں تو صحت مند ہو سکتی ہوں۔ اس دوران میں خودکشی کا منصوبہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔ اور اس کا کوئی نہ کوئی وسیلہ تلاش کرنا ہی پڑے گا۔

گلرخ اور دوسری لڑکیاں نسیمہ کے بازو کا ذکر لے بیٹھتی ہیں کہ وہ کیسا خواب ہے۔ وہ نہیں جانتیں کہ جب وہ اس کا ذکر کرتی ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ بھاگ کر کہیں چھپ جاؤں۔ میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ میں واہموں کی شکار ہو گئی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہمہ وقت مجھے اپنی بدصورتی کا احساس رہتا ہے۔ میری سانس رک رک کر چلنے لگتی ہے۔ اگر کوئی بھانپ لے تو؟ میں کسی کو اپنی اس کمزوری کا دکھ نا پسند نہیں کرتی۔ بعض کہتی ہیں "جسٹنا کس قدر حسین ہے"! اور میں اپنی بدصورتی کے احساس سے جو اس قدر نمایاں ہے۔ مر مر جاتی ہوں۔ اس کے باوجود میں نہیں چاہتی کہ کوئی شخص مجھ پر رحم کھانے لگے۔

مجھے نسیمہ کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ وہ بڑی قانع و صابر ہے۔ وہ پورے سکون سے اپنے نقص بازو کا ذکر کرنے لگتی ہے۔ یہ بات قابل تعریف ہے۔ میں اپنے نقص کے متعلق بات کرنا چاہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک صحرائے شر بار میں سے گذر کر جہنم کے دروازے میں گھسنے والی ہوں۔ اور شعلوں کی دیواروں سے اپنا سر ٹپک رہی ہوں۔ گلرخ کہا کرتی ہے تم خاصی مطمئن دکھائی دیتی ہو۔ لیکن میں اپنی ہی آگ میں جل رہی ہوتی ہوں مجھے ہر وقت یہی اندیشہ کھائے جاتا ہے کہ نسیمہ کے بعد وہ لازماً میرا ذکر لے بیٹھیں گی۔ گلرخ بڑی سرد مہر اور بیگانہ وش ہو گئی ہے جس سے مجھے اور زیادہ کوفت ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ گلرخ اور صبیحہ میں وہ کشش باہمی کیوں نہیں ہے جو میرے اور گلرخ کے مابین ہے۔ میں تو دونوں سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن وہ دونوں مجھ سے سنگدلی اور بے مہری کا برتاؤ کرتی ہیں۔ شاید گلرخ کی یہ بات ناگوار گذرتی ہے کہ وہ اپنی دولت کا سکہ مجھ پر جمانا چاہتی ہے۔ میں صبیحہ کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں اور صبیحہ خود بھی جان لے گی کہ وہ ذرا سی تباہی بک رہی ہے۔

(۱۵)

میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ میں تہی مایہ کیوں ہوں؟ لیکن دنیا میں مجھ سے بھی غریب لوگ بستے ہیں۔ میں چاہوں تو روپیہ کما سکتی ہوں لیکن مجھے اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں زر و مال کی پروا نہیں کرتی اور ان معاملات کو کچھ اہمیت نہیں دیتی۔ اس کے باوجود جب کبھی ایسے مواقع رونما ہوں جب مجھے تنگدستی کی وجہ سے خفیف ہونا پڑے تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ امی جان کہتی ہیں تم بڑی غیر ذمے دار ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ بعض اوقات میں اپنے آپ کو اس غیر ذمے داری کی ذمے دار سمجھنے لگتی ہوں۔ میرے مزاج کا رنگ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میرا جی نہ چاہے تو میں کوئی کام نہیں کر سکتی۔ میرا دل افسردہ رہتا ہے۔

ہوا کے جھونکے کیسے لطیف ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھ سے پیار کر رہے ہیں۔ مجھ پر ایک عجیب مدہوشی کی کیفیت چھا گئی ہے۔ میرا دل بظاہر پر سکون ہے لیکن میری سانس گرانبار ہے۔ لگتا ہے جیسے میرے دل میں عمیق خلا ہے۔ اُف میں کس قدر تنہا ہوں۔

پکھراج کیسی حسین لڑکی ہے۔ یہ بھی کیا گھناؤنی زندگی ہے کہ انسان چوروں کی طرح چھپ چھپ کر اسے گذارے اور اپنے آپ سے شرمسار رہے۔ اس بات کا ذکر کروں تو گلرخ صاحبہ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر دیکھیں گی اور فتویٰ صادر کریں گی "اپنے آپ کو بدصورت نہ سمجھو اگرچہ تم ہو بدصورت ہی" مجھ میں برائی یہ ہے کہ میں ڈھیٹ نہیں ہوں۔ میں ڈھیٹ بن کر زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ رہوں گی۔ میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لوگ ہنستے ہیں۔ زور زور سے کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔ میں کیسے ہنسوں۔ مجھے ہنسنا تو آتا ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس بات پر ہنسوں۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟

---

(۱۶)

جب راشد نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی ماں کی بدعنوانی اور بے راہ روی سے کس قدر مغموم تھا تو مجھے اُس سے اُنس سا ہو گیا۔ زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں سے مجھے بڑی ہمدردی محسوس ہوتی ہے اور میرے دل میں اُن کے لئے کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید یہی میری غلطی تھی۔ مجھے انسان کی فطری نیکی پر اعتماد ہے لیکن ہمدردی کا مطلب کسی پر عاشق ہو جانا تو نہیں ہوتا۔ مجھے تو کسی سے عشق ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ خیال مجھے اس قدر مضحکہ خیز سا لگتا ہے کہ بے اختیار ہنسنے لگتی ہوں۔ روایاتی قسم کے عشق و عاشقی سے مجھے نفرت ہے ورنہ خلوص و محبت سے کس کا دل متاثر نہیں ہوا کرتا۔

راشد نے کہا "تم تو عشاق کی تلاش میں ہو" میرا غصہ بھڑکا اور میں صرف یہی کہہ سکی "نہیں تو" اور پھر اُس نے میری اور میرے خاندان کی اہانت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہمارا خاندان بالعموم اور میرے ابا جان اُس کی ماں کی بدکاری کے باعث اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شاید وہ مجھے بھی اپنی ماں کی پست سطح تک لانے کا متمنی تھا۔

یہ صرف راشد کا واقعہ ہی نہیں ہے جس نے مجھے احتساب نفس پر مائل کیا۔ میں شروع سے ہی گونا گوں افکار میں مبتلا تھی اور اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا کرتی تھی۔ اسی احساس کی تلخی سے بچنے کے لئے میں راشد سے باتیں بھی کیا کرتی تھی۔ ورنہ میں میل ملاپ کو پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر میں یقیناً شادی کروں گی۔ عاقبت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ اُس شخص سے شادی کی جائے جو اپنا نصب العین مجھ میں تلاش کرتا ہو۔ بہ نسبت اُس کے جس میں میں اپنا نصب العین تلاش کروں۔ لیکن مجھے اپنی عاقبت اندیشی پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اکثر احمقانہ غلطیاں بھی کر جاتی ہوں۔

بہت سی باتوں میں میں اپنا مقام الگ بنانا چاہتی ہوں خواہ اُس کے لئے مجھے مروجہ قواعد کو توڑنا بھی پڑے۔ یا ایسے خیال کی حمایت کرنا پڑے جسے عوام ناپسند کرتے ہیں۔ گذشتہ رات میں نے خواب میں وردی پوش جوان دیکھے۔ شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ .....

(۱۷)

میں ابھی ابھی مغربی موسیقی کے ریکارڈ سن رہی تھی۔ میں ان سے بھاگ کر باہر چلی گئی۔ مجھے شروع سے ہی جذباتی جوش و خروش سے نفرت تھی اور کوشش کرتی تھی کہ اپنے چہرے پر جذبات کا اظہار نہ ہونے دوں اور طمانیت کا مظاہرہ کروں لیکن میرے اندر کمزوری سی پیدا ہونے لگی ہے۔ میرے دل پر شاعری، موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ کا گہرا اثر ہوتا ہے اور اپنے آپ پر قابو پانے کی خواہش میری فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے اور تصاویر کے دیکھنے یا موسیقی سے جو کیفیات میرے دل میں اُمڈ آتی ہیں اُن کا اظہار کرنے سے قاصر رہتی ہوں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں جب کبھی میں کسی فلم کا جذباتی منظر دیکھتی تھی تو رات بھر سو نہ سکتی تھی۔ میری سانس شرربار ہو جاتی۔ شاید اسی بات نے مجھے شرمیلا بنا دیا تھا۔

بھیجو سے گپیں ہانک کر میں بڑی خوش ہوا کرتی۔ ہم مل کر ایکٹرسوں کی نقلیں اتارتیں۔ ریڈیو آرٹسٹوں کی طرح مکالمے بولتیں اور بعض اوقات گانے بھی لگتیں۔ ہماری آوازیں سریلی نہیں۔ ہم شور مچاتیں اور کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔ امی جان آکر ہمیں سخت سست کہتیں اور ہم چپ چاپ سو جایا کرتیں۔

امی جان بچپن میں ہم پر بہت سختی کرتی تھیں۔ اس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ہم سے کس قدر محبت کرتی ہیں۔ اب وہ بہت کچھ پسیج گئی ہیں۔ شاید اُن کی سختی میں ہماری بھلائی تھی لیکن جب ہم دیکھتیں کہ ہماری سہیلیاں عید وغیرہ پر کس قدر قیمتی کپڑے پہنتی ہیں جب کہ ہمارا لباس ہمیشہ سادہ ہوتا ہے تو ہمیں سخت رنج پہنچتا۔ وہ اب بھی ہمیں سادہ لباس پہننے کو دیتی ہیں اور سادگی پر اصرار کرتی ہیں۔ اس پر میری شرارت کی رگ پھڑک اُٹھتی ہے اور میں سوچنے لگتی ہوں ــــ کاش کہ میں ایسا قیمتی لباس پہن سکتی جو امی جان کو ناپسند ہے۔

اس زمانے میں ابا جان ہم سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ ہمیں سینما لے جاتے۔ کھلونے، جوتے اور نئے نئے کپڑے خرید کر دیتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی

بے اعتنائی برتنے لگے ہیں اور محض فرض کی ادائیگی کر رہے ہیں لیکن کیا مجھے اس سے زیادہ کی اُن سے خواہش کرنی چاہیئے۔ مصیبت یہ ہے میں چاہتی ہوں کہ مجھ سے بہت زیادہ پیار کیا جائے۔ میں لوگوں سے بڑی توقعات رکھتی ہوں۔ شاید اب مجھ پر جذبات غلبہ پا رہے ہیں۔ میرے دل پر بوجھ سا محسوس ہونے لگا ہے۔ میں چاروں طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوں کہ مفر کی کوئی صورت پیدا ہو جائے مگر کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تو ملول ہو جاتی ہوں۔ جذبات کی شدت تکلیف دہ ہو جاتی ہے اور چہرے پر اُن کے اظہار کو روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(۱۸)

میں تھک گئی ہوں۔ کسی بات میں جوش و خروش سے دلچسپی لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ میرے اندر ہیجان پرور جذبات ہیں لیکن میں نے ظاہری سکون پیدا کرنے کی ایسی کوشش کی ہے کہ میرے لئے اپنے احساسات کا اظہار مشکل ہو گیا ہے۔ ان دنوں میں بہت اداس ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میری تقریر اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن اس چہرے کا کیا کروں؟ مجھے اپنے چہرے اور جسم سے نفرت ہے۔ میرا ظاہر مکروہ اور گھناؤنا ہے اور میرے باطن میں شرافت ہے۔ ان کا تضاد میرے لئے سوہانِ روح ہو گیا ہے۔ یہ قدرت کی ناانصافی ہے۔ میں اپنے آپ سے نفور ہوں اور نہیں جانتی کہ کیوں؟ میں اپنے آپ سے محبت کرتی ہوں نہ معلوم کیوں؟ میری شخصیت پہلو دار ہے۔ میں اپنے آپ کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ جب میں کسی ایک پہلو کی بجوئی پر غور کرتی ہوں تو اس سے ایسی گوناگوں صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ میں خیال کرتی ہوں کہ ان سے الگ میری کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ میں کئی شخصیتوں پر مشتمل ہوں جو سب ایک دوسری کی ضد ہیں۔ یہ جان کر میں بوکھلا جاتی ہوں۔ بہر حال میں ایک اچھی لڑکی ہوں مجھے لوگوں سے ہمدردی ہے، لگاؤ ہے۔ دوپہر کے بعد میں بے چینی سی محسوس کرنے لگتی ہوں اور مجھے اس بات کا شعور ہونے لگتا ہے کہ میرا سراپا آلودہ ہو گیا ہے، جیسے میلے جسم پر میرے چہرے پر کہیں گرد پڑ گئی ہے۔ اس احساس سے گھبرا کر میں گھر سے باہر نکل جاتی ہوں۔ دھوپ میں جا کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کائنات بڑی وسیع ہے اور میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو تنہا پاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابھی زمین پر گر پڑوں گی۔ میری تنہائی اور غم کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے۔ میں لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی۔ میں آئینہ تک نہیں دیکھ سکتی۔ میرا چہرہ عجیب بے ڈھب مضحکہ خیز ہے۔ بڑا سا سر، بڑا سا چہرہ، دُبلا ڈیل۔ میں تمسخر کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اپنے آپ کا احترام کرتی ہوں، اپنے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میری صحت بہتر ہوتی تو میں ہر قسم کے مذاق کا، تمسخر کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتی تھی لیکن مجھے اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے مجھے اپنا بچاؤ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ لوگوں کا تمسخر بے جا نہیں ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے مجھے اپنے آپ میں مقید کر دیا گیا ہے۔ میں اپنے آپ سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ کاش کہ مجھے کوئی جائے پناہ مل سکتی۔

مجھے ابھی ابھی خیال آیا تھا کہ کس طرح گلرخ مجھے کالج کی تقاریب میں حصہ لینے کی ترغیب دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھے امتحان کی بھی خوب تیاری کرنی چاہیے لیکن میں ایسی خوش بخت کہاں! ایک نہ ایک دن وہ جان جائے گی کہ ننھی صنوبر اپنے آپ کو ننھی سی ہیروئن منوانے سے قاصر ہے۔ اس سے میرے رنج میں اور اضافہ ہو گا۔ خدا نے ایسے لوگ کیوں بنا دیے ہیں جو نصب العینوں اور بڑے لوگوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اُن کو پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ میرے بھی نصب العین ہیں۔ لیکن جب لوگ مثالی شخصیتوں کی پرستش بتوں کی طرح کرنے لگیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ ان بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ خوبیاں اور صلاحیتیں عطا کرنے میں خدا بھی خویش پروری سے کام لیتا ہے۔ انسانی کوشش بھی بکار آمد ہوتی ہے لیکن بعض ظالمانہ حقائق ان کوششوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہیرو ہے تو کیوں ہے؟ میں ہیرو کیوں نہیں ہوں۔ کئی انسان ان لوگوں سے زیادہ محنتی ہوں گے لیکن قدرت نے انھیں ذہانت، دانش اور حسن سے محروم کر دیا ہے اس لئے وہ زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ غالباً اس پر گلرخ کہے گی کہ پس منظر میں رہنا ہی بہتر ہے اور لوگوں سے نیکی کرنا اور انھیں فیض پہنچانا ہی کافی ہے لیکن اگر میرے متعلق کوئی شخص کہے "بیچاری

کس قدر ایثار پیشہ ہے"۔ تو میں رحم طلبی سے بیزار ہوں۔ میری حالت دراصل بڑی عجیب ہے۔ نہ تو میں خود غرض ہوں اور نہ ایثار پیشہ ہوں کیونکہ میں دونوں کو اپنے مقام سے فروتر خیال کرتی ہوں۔ میں عوام کی طرح اعتدال کی راہ پر چلنا پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ خدا نے مجھے بے حد بدصورت، بے حد ضدی اور بے حد حساس بنایا ہے۔ مجھے انتہا پسندی کے بغیر چارہ نہیں اور یہ بات بھی میرے لئے مشکل ہے کیونکہ فطرتاً میں بڑی نرم طبع ہوں۔ میرا مزاج بڑا ہموار ہے لیکن اس کے ساتھ ہی غیر محتاط اور پاگل بھی ہوں۔ پس کوئی مفر کی صورت نہیں۔ کوئی حل نہیں، کہیں سکون نہیں، آسودگی نہیں۔ میرے لئے ہر طرف انتشار ہے، غم ہے۔

آج کل میں بڑی سنجیدگی سے خودکشی پر غور کرتی رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جب اس کا وقت آئے گا تو میرے ہاتھ کو لرزش نہیں ہوگی اور میرا عزم متزلزل نہیں ہوگا۔ مجھے اپنی خوبیوں پر پورا اعتماد ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ میرا کیا بنے گا۔ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ میں ہمیشہ تاریکی سے خائف رہی ہوں کہ کہیں لڑکھڑا کر گر نہ پڑوں۔

گلرخ ایک اچھی سہیلی ہے۔ میں اُسے بہت چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ عنقریب مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ میں لوگوں پر کبھی بھی اچھے تاثرات نہیں چھوڑتی۔ اگر کوئی تاثر اچھا ہو تو بھی ہنگامی ثابت ہوتا ہے۔ گلرخ پر عنقریب میرے معائب منکشف ہو جائیں گے جن کا علم مجھے پہلے بھی تھا لیکن جن سے وہ پہلے نفرت نہیں کرتی تھی۔

میں اپنی حماقت پر شرمندہ ہوں لیکن دل کی تہہ میں ایک بچی ہی تو ہوں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ شاید قصور میرا ہی ہو۔ مصیبت یہ ہے کہ میرے اندر جو بچہ ہے اس کی مفاہمت ایک معقول دوشیزہ سے ممکن نہیں ہے جو میں بظاہر ہوں۔ میری زبان چلتی رہتی ہے اور ذہن میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے۔ ایک ناکام محبت لڑکی جو عزت نفس، وقار اور حرمت کے نصب العین رکھتی ہے۔

گلرخ مجھ پر ایسے سوال کرتی ہے جیسے میں کوئی مجرم ہوں اور کوئی منصف اس پر جرح کر رہا ہو۔ وہ بے قصور ہے۔ وہ کوئی بات چھپانا چاہے تو اُسے چپ لگ جاتی ہے جس سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ میں بھی اُسے باتوں پر مائل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرتی ہوں۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڑی آسانی سے سنجیدگی اختیار کر لیتی ہے اور مجھے اُسے خوش کرنے کے لئے اتنی محنت کرنا پڑتی ہے کہ میں شکستہ دل ہو جاتی ہوں۔ وہ پھر سنجیدہ ہو جاتی ہے اور میں پھر اُس کے خوش کرنے میں لگ جاتی ہوں، اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

(۱۹)

میں جانتی ہوں کہ جب میں سٹیج پر تقریر کرنے کھڑی ہوں گی تو گھبرا جاؤں گی اور پھر کئی دن تک مجھے یہ خیال ستاتا رہے گا کہ میرا وجود کسی کام کا نہیں ہے، اور اپنی ہی آگ میں جلتی رہوں گی، رویا کروں گی۔ سر پھوڑتی رہوں گی۔ میرے اندر مسابقت کا جذبہ موجود ہے لیکن جب پیچھے رہ جاؤں تو خفت سے بُرا حال ہوتا ہے۔

گلرخ کہتی ہے تم خاصی جاہل ہو۔ اپنے احتساب نفس سے مجھے معلوم ہوا کہ میری دلیری کی وجہ میری مایوسی ہے۔ میں نے اپنے شرم و حجاب پر غور کیا اور اپنے آپ سے کہا کہ میں کیوں کسی سے ڈروں۔ مجھے اس شرمیلے جاسے نجات پانی چاہئے لیکن میں اس پر قابو نہیں پا سکی۔ میری گفتگو بیاکانہ ہوتی ہے لیکن میرا دل پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ مجھے اس کالج میں آتے ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ پھول آج مجھے حسد کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ شاید یہ حسد بڑھ کر شدید نفرت ہو جو غالباً ہو بھی ہے۔ وہ بظاہر میرے ساتھ شائستگی سے پیش آتی ہے لیکن میں اُسے پسند نہیں کرتی۔ اور گلرخ اگرچہ کندۂ ناتراش ہے لیکن میں اُسے بہت چاہتی ہوں۔ پھول آج ہمیشہ مجھے دُکھ دینے پر تُلی رہتی ہے۔ وہ میری کمزوری جانتی ہے اور مجھے ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

میں نے منٹو کی کہانیاں تیرہ چودہ برس کی عمر میں پڑھ لی تھیں۔ انھیں پڑھ کر مجھے اس قدر گھن آتی کہ میں رات کا کھانا بھی نہیں کھا سکتی تھی اور

امتلا کی کیفیت محسوس کرتی۔ جنس ہر متنفس میں ہے۔ مجھ میں بھی ہے۔ آخر خدا نے اسے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ جنس کے خیال سے مجھے گلے سڑے گوشت کی بدبو آنے لگتی ہے۔ لوگ معاشقے کیوں کرتے ہیں۔ ابا جان، بھائی جان، میری سہیلیوں کے بھائی سب عورتوں سے معاشقے کرتے رہے ہیں۔ میں سب سے محبت کرتی ہوں لیکن میں کسی سے فلرٹ نہیں کر سکتی۔ میں حیران ہوں کہ اُن مردوں اور عورتوں کے متعلق کیا خیال کروں۔ جو ایک دوسرے سے علی الاعلان عشق لڑاتے ہیں اور جب بڑھے کھوسٹ ہو جاتے ہیں تو ابا جان کی طرح تائب ہو کر کعبے کا رستہ لیتے ہیں مردوں کے اخلاق بالخصوص بڑے پست ہوتے ہیں۔

کالج جانے پر معلوم ہوا کہ تفریحی سفر پر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ روانہ ہوئی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ راستے میں میں نے درشت لہجے میں ہاجرہ کو مخاطب کیا۔ وہ روٹھ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے منایا۔ اتنے میں گلرخ نے سوال کیا کہ تمہارے چہرے کو ہوا کیا تھا۔ میں کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ میں جانتی تھی کہ الفاظ کے ساتھ آنسو بھی پھوٹ نکلیں گے۔ بہر حال مجھے اپنے گنہگار ہونے کے احساس کا سبب معلوم ہو گیا۔ یہ احساس اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب مجھے اپنی بدصورتی کا سبب بیان کرنا پڑتا ہے۔ پوچھنے والوں کو اس بات سے کیا غرض کہ اس بدصورتی کی ذمے دار میں خود ہوں یا حادثہ تھا۔ وہ تو سبب دریافت کر کے رہیں گے۔ اس میں کسی کا تصور بھی نہیں، محض جذبۂ تجسس کی کارفرمائی ہے۔ لیکن مجھے اس سے بڑی اذیت ہوتی ہے۔ آخر میں آنسو نہ پی سکی۔ میری آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور اُدھر گلرخ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ میری خاطر رو رہی تھی۔ ایک بات کیوں میری سمجھ میں نہیں آتی کہ میں اور گلرخ دونوں عفت مآب دوشیزائیں ہیں اور اب تو پوری عورتیں بھی بن چکی ہیں لیکن ہمیں ایک دوسرے سے دلی محبت ہے۔ ہم دونوں کو ہم جنسیت سے اور اس کے متعلقات سے سخت نفرت ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میری صورت شکل میں کچھ مردانگی کے آثار ہیں۔ پھر خیال آنے لگا کہ میرے اندر مامتا ہے جو میرے دل میں رقت پیدا کر دیتی ہے اور میں اُس کی طرف مائل ہو جاتی ہوں لیکن یہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ گلرخ کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سب سے پہلے میں ایک بھرپور عورت ہوں لیکن ایسی عورت جو نہایت بدشکل ہے۔ میں اپنے آپ کو جانتی ہوں، پہچانتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرے اندر ایسی خوبیاں بھی ہیں جن پر میں فخر کر سکتی ہوں لیکن اس فخر کا اظہار اپنے لئے اور اپنے مقام کے لئے باعثِ سُبکی محسوس ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اپنے آپ کا احترام روا رکھتی ہوں جب لوگ ایسے قصور کے لئے جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا میری توہین کرتے ہیں تو میں حواس باختہ ہو جاتی ہوں۔

راشد اپنے عزیزوں سے ڈرتا تھا کہ وہ کیا کہیں گے اس نے مجھ جیسی لڑکی کو کیوں پسند کیا۔ لیکن گلرخ کیوں ایسا سوچے۔ جو کام میں نے نہیں کیا اُس کی ذمے داری مجھ پر کیسے عاید ہو سکتی ہے۔ لوگ میرے وجود سے کیوں شرمسار ہوں اور احمق لڑکیوں پر کیوں فخر کریں۔ راشد کی دولہن ایک ایسی ہی احمق لڑکی ہے۔ وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں۔ میری بہن اُس سے کہیں زیادہ حسین ہے لیکن راشد کی دولہن میں خوبی یہ ہے کہ وہ ایک عام قسم کی معتدل مزاج عورت ہے۔ سب اُس پر فخر کرتے ہیں۔ آخر لوگ مجھے کیوں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور جو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے وہ رحم کیوں کھانے لگتے ہیں۔ اس بھری دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو میرا احترام کرے یا مجھ پر فخر محسوس کرے۔ بات یہ ہے کہ میں خود مرکزیت کی شکار ہوں اور دوسروں کو اپنا محسوس کر کے اُن سے محبت کرتی ہوں۔ مجھے محبت اور احترام سے محروم رکھا جاتا ہے اس لئے میں ان پر مرتی ہوں۔ میں بڑی تخیّل پرست ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے اندر دو وجود ہیں جو ایک جیسے قوی ہیں لیکن جن میں بُعد المشرقین ہے۔ اگر کسی شخص نے مقدر کے خلاف بغاوت کی ہے تو وہ میں ہوں۔

مجھے ایسے شخص کی تلاش ہے جو میری وجہ سے شرمساری محسوس نہ کرے، جو یہ خیال نہ کرے کہ میں اس کے ساتھ شادی کرنے کے لائق نہیں ہوں۔ میں اُس سے شادی کروں گی، میں اُس کا ہاتھ پکڑوں گی اور کھلے بندوں اتراتی پھروں گی۔ میں اُس کی بڑی اچھی بیوی بنوں گی اور کئی بچے جنوں گی۔ مجھے عزت کی پروا نہ ہو گی۔ یہ سب کچھ میری روز خوابی کی کارفرمائی ہے۔ میں ہمیشہ اس خواب کی جزئیات پر غور کرتی رہتی ہوں لیکن اگر راشد کی طرح اُس شخص نے بھی کہا "تم بدصورت ہو۔" ہر کوئی کہتا ہے کہ تم بدصورت ہو۔ پھر خدا معلوم میں کیا کر بیٹھوں۔ شاید خودکشی کروں۔

میں نے گلرخ سے بڑا اچھا برتاؤ کیا۔ میں اُس کے گھر گئی کہ تفریحی سفر میں اُس کو ساتھ لوں۔ لیکن وہ بے مروتی سے کہنے لگی پھر کبھی میرے ہاں قدم نہ رکھنا۔ اگر وہ اپنے باپ سے ڈرتی ہے تو مجھے اُس کا ڈر نہیں ہے۔ میرے اپنے والدین خاصے سخت گیر ہیں لیکن اُس کا باپ تو بڑا جابر ہے۔ مجھے احساس ہے کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے جسے ایک ظالم و جابر باپ سے نجات دلانا ضروری ہے۔ آؤ ہم سب آزاد لوگ ایسے باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کریں ایسے سرمایہ پرست باپ کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوں ہمارا نقصان کیا ہوگا۔ سوائے اپنی زنجیریں کھونے کے اور ساری دنیا فتح کرنے کے لئے ہمارے سامنے ہوگی۔

(۲۰)

گلرخ مجھے ایسے پند و نصیحت کرتی ہے اور اس طرح فلسفہ بگھارتی ہے جیسے وہ میری ماں ہو۔ جو کچھ وہ کہتی ہے وہ اصولاً صحیح ہے لیکن وہ مثبتات کو کیوں بھول جاتی ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے جب وہ میرے متعلق رائے قائم کرنے بیٹھ جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ رائے سراسر متعصبانہ ہوتی ہے۔ جب ایک دفعہ اُس کے ذہن میں کوئی خیال بیٹھ جائے تو اُسے دور کرنا امر محال ہے۔ وہ میرے اور اپنے متعلق ایک خاص رائے رکھتی ہے اور ہر بات کو توڑ مروڑ کر اُس کے موافق کر لینا چاہتی ہے۔

میں پشیمان ہوں کہ میں نے اُسے راشد کا قصہ کیوں سنایا تھا۔ وہ کیوں نہیں سمجھ پاتی کہ اُس شخص نے میری توہین کرنے اور مجھے اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ میں اُسے عمر میں بڑا سمجھ کر اُس کا احترام کیا کرتی تھی، اُس کو چاہتی تھی کسی حد تک ہماری عادات بھی ملتی جلتی تھیں۔ ہم دونوں تخیل پرست تھے۔ ہم بڑے اچھے دوست بن سکتے تھے لیکن ہماری طبائع میں شدید اختلاف تھا۔ اُس کی شخصیت کے چند پہلوؤں سے مجھے نفرت تھی۔ وہ کمینہ، یا وہ گو اور احمق تھا۔ زر و مال، حسن و جمال اور عقلیت پرستی سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں عقلیت پسندی کا وہ محض اس لئے شیدائی تھا کہ پڑھے لکھے لوگ اسے سراہتے تھے۔

(۲۱)

میری سوتیلی امی بے حد خود غرض ہیں اور ہمیں ابا جان کے نظروں میں گرانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ ابا جان جیسا خود غرض شخص بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ انھیں صرف اپنی صحت، اپنے نظریات اور اپنے رسائل سے غرض ہے۔ جب میں ان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھ پر افسردگی چھا جاتی ہے اور تنہائی کا احساس ستانے لگتا ہے۔ امی جان اور بہن کی محبت میرے آڑے آتی ہے لیکن یہاں بھی زندگی کے متعلق منصوبے سوچنے پڑتے ہیں۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک اٹھانا پڑتا ہے اور ذمے داری مجھے اُلجھن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے کہ آدمی خوابوں کی دنیا سے نکل کر اچانک حقائق سے دوچار ہو۔ بہر حال میں اُسے اپنی تربیت سمجھتی ہوں اور پھر اس میں کوئی نہیں بات بھی تو نہیں۔ گذشتہ بارہ برس سے حالات اسی ڈگر پر رواں دواں ہیں۔

(۲۲)

(یہ پارہ اصل مسودے میں بھی اُردو میں لکھا گیا تھا)

میرے پروردگار! میں تیرے اُن دکھی لوگوں میں سے ہوں جو کہ انجانے میں کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں اور راتوں کو سو نہیں سکتے اور روتے ہیں۔ گلرخ کا خط آیا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے بُری طرح محسوس ہوا کہ یا تو میں نے گلرخ کو بہت بُرا خط لکھ دیا تھا اور یا یہ کہ وہ میری طبیعت سے اتنی بھی واقف نہیں کہ بُرا نہ مانے۔ دراصل میرا قصور یہ ہے کہ میں خط لکھنے سے پہلے یہ یقین کئے بیٹھی تھی کہ گلرخ مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں دل سے انتہائی مخلص انتہائی نیک لڑکی ہوں اور یہ جھوٹ نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میری ایک بہت پیاری دوست ہے اور میں بھی اُس کی بہت پیاری دوست ہوں۔ اس لئے ذرا بے تکلف قسم کی گفتگو شاید اُسے ناگوار نہ گذرے مگر آج میں نے اُس کا خط پڑھا تو مجھے شدید احساس ہوا کہ میرا انداز واقعی عامیانہ تھا۔ دنیا میں میرے ایسے انسان پر قیامت اُس وقت گذر جاتی ہے جب اُس کو قصور ثابت ہو جائے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں خود پسند نہیں ہوں۔ اپنے وجود سے مجھے جو محبت ہے

وہ عقل و دانش کے حدود میں ہی رہتی ہے۔ ان سے تجاوز نہیں کر پاتی اور اسی لئے اپنا تصور رمانا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ اور مجھے اتنی تکلیف، اتنا دکھ ہوتا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میں تڑپتی ہوں اور بُری طرح بے چین ہو جاتی ہوں۔ چاہے اس شخص سے معافی مانگ لوں اور وہ مجھے معاف بھی کر دے، پھر بھی یہ پچھتاوا، یہ درد اور تکلیف میرے دل سے نہیں جاتی۔

گلرخ کو کوئی سمجھائے کہ وہ جو کہتی ہے وہ بالکل درست کہتی ہے۔ میں اس کی بات مانتی ہوں۔ اس کی تائید کرتی ہوں لیکن فرق بھی تو ہے نا اُس میں اور مجھ میں۔ میں اس کے ساتھ یہ بات مانتی ہوں کہ خود مختار ہونا بڑی اچھی چیز ہے خصوصاً میرے لئے جسے ہر لحظہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں دوسروں کو بدصورت تو نہیں لگ رہی لیکن اُس کا استدلال یہ ہے کہ وہ چھابڑی والوں کو سب رشوت خوروں سے بلند سمجھتی ہے لیکن عورت چھابڑی نہیں لگا سکتی۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں مگر میں پھر سوچتی ہوں کہ آخر عورت چھابڑی کیوں نہیں لگا سکتی۔ اگر اس لئے کہ اُس کا دائرہ عمل زندگی میں مرد سے مختلف ہے تو دنیا میں اس کے مقام کی قدر کیوں نہیں کی جاتی۔ میں اپنے آپ کو یا اس کے متعلق نہیں کہتی، میں تو صرف یہ سوچتی ہوں کہ عورت کو صنفِ نازک سمجھنے کے باوجود اس سے دو چند چیزوں کی توقع کیوں رکھی جاتی ہے۔ مرد تو گھر کا کام کرنا ذلت سمجھتے ہیں، اور نہ بچے ہی پیدا کر سکتے ہیں تو پھر ان کو عورتوں سے افضل و برتر کیوں سمجھا جاتا ہے۔ وہ تو ایک ہی کام کے لئے بنے ہیں اور عورتیں دونوں کے لئے، آخر کیوں؟ ہم تو عورتوں مردوں کے برابر حقوق و فرائض کو پیٹتے ہیں اور دنیا میں دیکھو تو عورت کے فرائض لگاتار بڑھتے جارہے اور حقوق وہی بھائیوں اور شوہروں اور باپوں سے ہزار درجہ کم۔ بات صرف اتنی ہے کہ نہ جانے کیوں دنیا کی چیزوں پر سے میرا اعتقاد اُٹھ گیا ہے۔ خود گلرخ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ لڑکیوں کا جائزہ لینے سے پہلے لوگ اس کی دولت کو دیکھتے ہیں، پھر علم اور شکل و صورت کو پوچھتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اس ترتیب سے اتفاق نہیں پھر بھی ان تمام چیزوں کو جن کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں، میں اُن کو اچھا سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں جب تک ان کی خوبی مجھ پر واضح نہ ہو جائے۔ دراصل ہم لوگ سب کے سب انسانوں کو ناپتے اور تولتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ انسان کی سب سے بڑی صفت میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ انسان ہے اور سب چیزیں سوائے اُس نیکی کے، جو وہ اپنے اندر پیدا کرتا ہے فضول ہیں۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہنی چاہئے کہ سب انسان برابر ہیں لیکن گلرخ کہتی ہے کہ انسانوں کا بڑا اور چھوٹا ہونا تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے اور ضروری ہے۔ اب میں کیسے اس کا کہنا مان لوں جب تک مجھ پر یہ ثابت نہ ہو جائے اور میں اسے سمجھ نہ پاؤں کہ ایسا کیوں ہے۔ مگر یہ گلرخ کی عادت ہے۔ وہ اپنی رائے کو ہر معاملے میں قطعی کا درجہ دیتی ہے۔ حالانکہ بہت سے مسئلے ایسے ہوتے ہیں جن میں اختلاف رائے ہوتا ہے۔ میں فوراً اپنی رائے قائم کرنے کی قائل نہیں ہوں۔ میں جب کوئی ایسی بات کہتی رہوں جس پر کہ گلرخ کو لنترانیے کا گمان ہو تو وہ بات نظریہ نہیں ہوتی۔ وہ تو میں ایک ایک بات، ایک ایک چیز، ایک ایک خیال کو دیکھتی ہوں، سوچتی ہوں کہ یہ ایسے کیوں ہے، اور کیا اس کا ایسے ہونا درست ہے؟

گلرخ چاہے میری اس رائے کو منفی کہے یا مثبت میں بلا سوچے سمجھے کسی چیز پر ایمان نہیں لا سکتی۔ ہمارے آباؤ اجداد اگر کچھ کرتے رہے ہیں تو اس سے پوری طرح ثابت تو نہیں ہوتا کہ ہمیں بھی بعینہ، ویسے ہی کرنا چاہیئے۔ آخر کچھ تو تخلیق کی گنجائش بھی ہونا چاہیئے۔ گلرخ خود لکھتی ہے کہ چیزیں فرسودہ ہوتی ہیں صرف انداز نیا ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہی تھا۔ میں چیزوں کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ لیکن ان تمام چیزوں سے تعلق رکھنے کا انداز وہی ہوگا جو میری انفرادیت کے موافق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں دولت سے زیادہ انسان کی انفرادیت کی قدر کرتی ہوں۔ ان سے بہت پیار کرتی ہوں اور ان سے بھی ایسے ہی خلوص اور پیار کی توقع رکھتی ہوں۔ روپے پیسے کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ لاپروا ہوں اور ایسی چیزوں کو ٹھاٹ کہتی ہوں۔ دراصل جب میں یہ کہتی ہوں کہ میں اپنی زندگی کے زاویے سے بڑی آدمی ہوں تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری زندگی کا زاویہ کچھ حد تک، (بہت تھوڑی حد تک) تو خدا اور قسمت کا بنایا ہوا اور بہت زیادہ حد تک خود بنا ہوا ہے۔ جو کچھ میری زندگی کا زاویہ ہے۔ وہ میری اپنی سوچ کا نتیجہ ہے۔ میرے اپنے ذہن کی پیداوا

ہے۔ اگر آج میں چاہوں تو میں اپنی زندگی کے جانے پہچانے زاویے کو بہت پیچھے چھوڑ کر پوری قوت کے ساتھ زندگی میں آگے بڑھ سکتی ہوں اس میں کچھ میری بڑائی نہیں ہے۔ یہ تو میرے عقیدے کے مطابق ہر انسان میں ہے۔ جو کچھ وہ ہے وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔ ہاتھ کی لکیریں پتھر کی لکیریں تو نہیں ہیں۔ میں کسی مذہب کسی عقیدے سے متاثر ہو کر یہ نہیں کہتی۔ میرے سینے میں کوئی چیز پھڑکتی ہے۔ میری سانس پھول جاتی ہے اور مجھے پورے طور پر اپنے اندر زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں میں سوچتی ہوں کہ میں لوگوں کی بہ نسبت کمزور ہوں اور ان کی طرح محنت نہیں کر سکتی مگر مجھے اپنے آپ کو یہ کتنا آتا ہے کہ پیاری ع

اے اڑانا بلبل بے پر کو مذاق پرواز

سو تو بھی فکر نہ کر اور ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

لیکن گلرخ تم نے تو کبھی اس طرح نہیں سمجھایا۔ دراصل مجھ پر ما بعد الطبیعیاتی اور روحانی چیز کا اثر طبیعیاتی اور ٹھوس مادی چیز سے زیادہ ہوتا ہے۔ دولت کرنے سے شرم وغیرہ اسی کا نتیجہ ہے۔ میں لوگوں کے دیئے ہوئے ناموں کو پسند نہیں کرتی کیونکہ لوگوں نے ان ناموں کا بہت ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ محبت کے لفظ کے بدنام ہونے کی بات تو اب بہت عام ہے اور ہزاروں چیزیں ایسی ہیں کہ اس طرح بدنام ہو چکی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ گلرخ سے کہہ دوں کہ حضور یہ عزت ہے۔ ہم کسی چیز کے بارے میں یہ پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ یہ ایسی ہوگی۔ اگر میں اپنی زندگی گذارنے کے طریقے (غور تو میں ضرور کرتی ہوں) کو حل نہیں کر سکی تو اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ میں دوسروں کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتی۔ اس دنیا میں تو بڑی بڑی غیر متوقع باتیں ہوتی ہیں اور کبھی جو ایسا ہو بھی جائے میں وہ سب کچھ کر دکھاؤں جو گلرخ کے خیال میں نہیں کر سکتی۔ لیکن قبل از وقت کچھ کہنا فضول ہے۔

"نئے نئے نظریات ہمارا سماج قبول کر ہی رہا ہے"۔ بہت اچھے، بہت ہی اچھے! مگر دوست تمہارا یہ سماج تو اس انتہائی قسم کی چیز کو بھی قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ میں تو انسان ہوں جیتی جاگتی (خوبصورت نہ سہی انسان تو ہوں) کیا مجھے ایک نظریے جتنی وقعت بھی حاصل نہیں۔ اور جب یہ سماج مجھے قبول ہی نہیں کرتا تو میری ردعمل کیا برداشت کرے گا۔ اور میں وہ انسان ہوں کہ اگر مجھے کسی کام میں محرومی ہو تو مرنے مارنے پر اتر آتی ہوں۔ میں جب کسی چیز کو کرنے پر اتر آؤں تو اسے تکمیل تک پہنچا کر دم لیتی ہوں چاہے کچھ ہو جائے۔

میں جلد باز نہیں ہوں۔ اپنے خیالات کو آہستہ آہستہ آگے بڑھاتی ہوں اور ان کی تکمیل کا خواب سست روی سے آگے بڑھتا ہے اور اسی میں ہماری سب کی بہتری ہے۔ میرا دل، بے چینیوں بے قراریوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن میں نے آج تک زندگی اس کوشش میں صرف کر دی کہ یہ جذبات و خیالات ظاہر نہ ہونے پائیں اور جب ہوں تو اتنے مکمل اور سنجیدہ انداز میں کہ بعد میں ان پر نہ پچھتاؤں (پچھتاوے کا لفظ میری زندگی کا المیہ ہے۔ خدا کرے گلرخ اس کی نفسیاتی توجیہہ نہ کرنے بیٹھ جائے۔ میرا جی چاہتا ہے کہوں گلرخ! میں اپنی نفسیات سے بڑی آدمی ہوں کیونکہ ہر انسان اپنی نفسیات سے بڑا آدمی ہوتا ہے) گلرخ! ایک دوسرے پر پورا بھروسہ رکھنا، کسی کے خلوص پر شک و شبہ نہ کرنا اس کی ہر بات کی نفسیاتی توجیہہ سے بہتر ہے۔

ان تمام شکوک و شبہات کے باوجود جو کہ اس کے ذہن میں اٹھتے ہیں صنوبر ایک اچھی لڑکی ہے۔ میں اپنی تمام الجھنوں کا حل اسی وقت سوچ سکتی ہوں۔ حل تو صرف اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کرنے میں ہے جو کہ میرے اردگرد ہے، بجا ہیں ہے۔ حل تو ایک ذہنی عقیدہ ہے لیکن میں ایسی بے صبر نہیں ہوں اور میری نگاہیں خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہیں۔ جو کچھ ہے وہ ٹھیک ہے اور میں مقدور بھر کوشش کرتی ہوں کہ اپنے تمام فرائض پوری طرح سر انجام دے سکوں۔ میری والدہ اور بہن اور میری حالت یہ ہے کہ ہم پورے طور سے بود و باش اختیار نہیں کر سکے۔ دس سال سے اسی پر میرے ابا اور امی میں جھگڑا چلا آتا ہے امی بڑی امی کے ساتھ نہیں رہ سکتیں اور ابا کہتے ہیں کہ نوکری چھوڑ دو اور بڑی امی کے ساتھ رہو۔ دونوں ضدی ہیں۔ ابا ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ مجبور بھی ہیں۔ امی کو یہ وہم تھا کہ مرد کے بغیر گھر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں نے پوری کوشش کی امی کو سمجھانے کی کہ گھر بنایئے اور کوئی نہ سہی میں تو ہوں۔ مجھے

بنا سمجھ لیجیے، مجھ پر بھروسہ کیجیے۔ دنیا کی کوئی مصیبت اگر آئے گی تو میرا ناطقہ تو نہ کر پائے گی میں کمزور بھی ہوں تاہم وہ بھی مجھے زندگی بتانی آتی ہے۔ سنوارنی آتی ہے، پیار محبت سے سجانی آتی ہے اور بہتیرے عقلمند جسم اور عقلمند دماغ کے مالک لوگوں سے بہتر طور پر گذارنی آتی ہے۔ اپنے دکھوں کا پوری طرح احساس کرتے ہوئے منصوبے بنانے آتے ہیں۔

بھلا یہ خیال کیسے میرے دل سے جا سکتا ہے کہ راشد ایسے لوگ میری اتنی بدنامی بغیر کسی قصور کے کبھی نہ کر سکتے اگر ابا اور امی کا گھر بنا ہوا ہوتا یا کم سے کم میں خود لڑکا ہوتی۔ میری امی میں قوتِ ارادی ہی نہیں اور بھی بہت چیزوں کی کمی ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی کوشش یہی ہے (خود میری امی کی بھی یہی کوشش ہے) کہ میری اور میری بہن کی زندگی ان خامیوں کا شکار نہ بنے۔ وہ پوری کوشش کرتی ہیں کہ ہم لوگ ان تقریبات میں حصہ لیں جن میں حصہ لینے سے ہماری بیہودہ شرم اور گھبراہٹ دور ہو جائے۔ اس طرح وہ ہمیں لوگوں سے ملنے کے لئے کہتی ہیں۔ ان کے والدین نے ان کو کبھی لوگوں سے میل ملاپ کا موقع نہ دیا۔ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے کو کہتی ہیں۔ ہر وقت یہی سمجھاتی رہتی ہیں کہ کردار بحیثیت مجموعی اچھا ہونا چاہیئے۔ ان کی انتہائی غلط تربیت کا اثر ہے کہ وہ زندگی میں کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں اور وہ اس قسم کی تربیت ہماری نہیں کرنا چاہتیں لیکن یہ خیالات ان میں اب پیدا ہوئے ہیں جبکہ ہم خاصی بڑی ہو چکی ہیں۔ اور کہنا پڑے گا کہ یہ خیالات زیادہ تر میرے لڑنے جھگڑنے اور بحث و تمحیص کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں لیکن میں اپنی امی سے بہت محبت کرتی ہوں اور بہت عزت کرتی ہوں اور یہ میری زندگی کا مقصد ہے۔ اگر ان کی خوشی کے لئے کچھ کر سکوں تو کروں، ویسے مجھے معلوم ہے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ ان کی بیٹی صنوبر زندگی میں ہر دم ہنستی مسکراتی رہے۔

میں جنس کو برا نہیں سمجھتی۔ نیچرل ہے اور زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اس کے متعلق زیادہ نہیں جانتی اور شاید شرماتی بھی تکلفاً ہوں۔ تمہارا اس پر اظہارِ خیال کرنا میری معلومات میں اضافہ کرے گا کیونکہ جو کردار تشکیل پذیر ہو رہا ہو اس کے لئے معلومات بہت ضروری ہوتے ہیں۔

INFORMATION IS NECESSARY FOR A CHARACTER IN FORMATION

گلرخ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ میرا کیرکٹر ابھی مکمل طور پر بنا نہیں ہے۔ میں اپنا کیرکٹر بہت اچھا بنانا چاہتی ہوں۔ اپنے کچے پن پر میں شرمندہ نہیں ہوں۔ کیونکہ اگر کردار دل پسند اور اعلیٰ نہیں تو اس سے فی الحال شک کرنے والا سوچتا ہوا ذہن ہی بہتر ہے۔

محترمہ! میں یہ نہیں مانتی کہ ہر بات کی جڑ بنیں سیکس ہے۔ سیکس ایک حقیقت ہے مگر اپنی جگہ۔ اور بھی دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اول تو مجھے تم سے ہرگز جنسی محبت نہیں ہے اور اگر تمہارے خیال کے مطابق ہے بھی تو پھر چونکہ بقول تمہارے سیکس کوئی بری چیز نہیں ہے تو پھر میرے تم سے محبت کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تمہیں الجھن کیوں ہوتی ہے۔ چڑ اور ضد اور نفرت کو کیوں اس کی توجیہ ٹھہراتی ہو۔ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ میری کوئی عادت کسی سے ملتی ہے تو میں اس کو تبدیل کرنا انتہائی ضروری خیال کرتی ہوں۔

میرا خط بدتمیزوں والا ضرور تھا مگر اتنا سخت نہیں تھا جتنا سخت اس کا جواب ہے۔ خدا گواہ ہے کسی طرح بھی اس کی توہین یا اس کے خیالات و نظریات کی توہین میرا مقصد نہیں تھا۔ ہر انسان کے خیالات کی میں قدر کرتی ہوں لیکن یہ حق تو کسی کو حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کو میرے ذاتی رد و بدل کے بغیر مجھ پر ٹھونس دے۔ ہو سکتا ہے کہ میری طبیعت اور حالات کا تقاضا کچھ اور بھی ہو۔ پھر اس کو وہم ہے میں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ سروس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو بیچ دو گی میں تو یہ کہتی ہوں کہ مجھے ڈگری کرنی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اپنی عزت و وقار کو قائم رکھوں گی۔ تم چھا بڑی کہتی ہو ہم ہم جھٹ بھوننے کو تیار رہیں۔

مان لیا تم زیادہ تجربہ کار پڑھی لکھی ہو، ہر طرح کی خوبیاں ہیں مگر گلرخ! بات تو یہ ہے کہ ان خوبیوں کے بغیر بھی انسان ہو سکتے ہیں مگر چونکہ یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تم مجھے بڑا انسان، دیوی جی، بڑھیا لڑکی کہہ کہہ کر چڑاتی ہو مجھ میں خوبیاں نہیں ہیں لیکن اپنے مقدور بھر کوشش کرتی ہوں کہ کسی کے لئے فائدہ مند

ثابت ہو سکوں۔ اور نہ ہی کسی سے پیار ہی کروں۔ تمہیں اور چیزیں آتی ہیں پیار کرنا نہیں آتا اور مجھے سوائے پیار کرنے کے کچھ نہیں آتا۔

شادی کے متعلق عرض ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ ذوق کے مطابق آدمی کے خیال سے مجھے اس لئے شرم آتی ہے کیونکہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ شرائط پیش کر سکوں یا سوئمبر رچاؤں میں تو یہی بات ہے بوجھ ہوں اور اچھے لوگ بوجھ ڈھونا پسند نہیں کرتے اور جو کوئی مجھے تھوپے گا، تہمید سے کم نہیں ہوگا۔ سو اپنی اتنی بے عزتی کرانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے اور شادی ہزاروں لوگ نہیں کرتے۔ فی الحال کوئی ایسی موت تو نہیں آ رہی شادی کے بغیر۔ ایسے ہی کچھ مذاق اور تفریح کے طور پر کہہ دیتی ہوں ویسے میں شادی نہیں کراتی اور امید ہے نہیں کروں گی اور سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ کروں بھی تو موتی کب ہے۔ اس لئے صورت اسی میں ہے کہ کہہ دوں میں نہیں کروں گی۔ اب تو تمہارے نہیں واضح ہو گیا ہوگا کہ میں کیسے سوچتی ہوں۔ اس کی چاہے کوئی وجہ نکالو مگر میں نے اپنی دانست میں بالکل سچ بولا ہے۔

ٹھیک ہے تم میرے بغیر بھی خوش رہ سکتی ہو۔ لیلیٰ بھی تو مجنوں کے بغیر رہ لی تھی اور میں تو مجنوں بھی نہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ میں تمہارا بہت وقت ضائع کرتی ہوں۔ میں تو اس گھن کی طرح ہوں جو کہ اپنی ذات سے بے قصور ہے مگر دوسروں کو کھا جاتا ہے۔

شاید یہ میری زندگی کا نیا پہلو ہے۔ مگر انسان اسی چیز کا نام ہے کہ ہم اس کو اس کی لفظیات میں بھی قید نہیں کر سکتے۔ وہ ہر دم ہر منٹ بدلتا رہتا ہے بدلتا نہیں بلکہ اس کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ دل دریا سمندر سے بھی گہرا ہے۔ ہر لہر لہر ہوتی ہے اوپری اوپری سی چیز۔ اس کی گہرائی بھی بھلا اوپر آ سکتی ہے جہاں آپ اس کی گہرائیوں میں غوطہ لگا سکتے ہیں ہم اس کی گہرائی کو نفسیات کے پیمانوں سے نہیں ناپ سکتے اور پیمانے بھی وہ، جو غیر معمولی اور غیر متوقع احوال کو قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ میرے اور تمہارے سوچنے کے انداز کا فرق ہے۔ تم ایک گہری گہرائی رائے کے نقطۂ نظر اور مضبوطی سے بنی ہوئی رائے سے سوچتی ہو اور میں ہمت سے اور اس طرح بغیر کسی مخصوص نقطۂ نظر اور رائے کے سوچتی ہوں۔ تمہاری مضبوطی تمہیں اپنے آپ کو سچا سمجھنے پر مجبور کرتی ہے اور میرا متزلزل یقین مجھے اپنے آپ پر بھی شک کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ تم مجھ سے بے شک تعلق توڑ دو، پھینک دو، اپنی مرضی کے مطابق بنالو یا میری مرضی کے مطابق بن جاؤ پر خدارا میرے خلوص پر شک نہ کیا کرو۔

(۲۳)

آج کئی واقعات رونما ہوئے یا شاید یہ میرا وہم ہے۔ ہم گھر کے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ آخر وہ پہنچی تو خدا جانے میں کیوں بوکھلا سی گئی۔ اپنے اضطراب کو چھپانے کے لئے میں نے بے تکان باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں نے ایسی ڈینگیں بھی ماریں جو بالعموم میں کبھی نہیں مارتی۔ بازار جانے سے پہلے ہم انہیں اپنے گھر لے گئی کہ گھر سے روپیہ لینا تھا۔

لڑکیاں خوش قطع کپڑے پہنے چل پھر رہی ہوں تو میں اس منظر کو پسند کرتی ہوں۔ وہ کیسی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ کوئی مجھے نہ دیکھ پائے۔ میرا وجود بد ہیئت سہی بہرحال ٹھوس ہے اُسے ہوا میں کیسے تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ میں باہر لڑکیوں کی آوازیں سنتی ہوں اور ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ مجھے نہ دیکھ پائیں۔ میں کافی عرصے سے تن تنہا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ ایک نامعلوم سی دہشت مجھے دامنگیر ہو رہی ہے۔

میں اپنی سہیلی کے ساتھ ایک دکان میں چیزیں خرید رہی تھی۔ اچانک میری نگاہ آئینے پر پڑی اور مجھے اپنا عکس دکھائی دیا۔ میرے دل میں گھونسا لگا میرا دل ڈوبنے لگا۔ الٰہی میں کس قدر بدشکل ہوں! میں نے اپنے آپ سے زیادہ بدصورت چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ ایک خوفناک غیر فطری سا چہرہ۔ گھر لوٹنے تک میں نہیں جانتی تھی کہ کیا ہوا۔ میرا سر تپ رہا تھا۔ میری حسیات پر ایک عجیب جھنجھناہٹ سی طاری تھی۔ میں چپکے سے اپنے بستر میں لیٹ گئی۔ امی جان اور بہن کی پرسش کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل قدرے سنبھل گیا تھا اور میں نے سوچا کہ میرے تمام غم و الم کی تہہ میں یہی میری بدصورتی ہے۔

میری غمزدگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ میں اپنے آپ کو دوسروں پر اور خود اپنے آپ پر ایک بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ دوسروں کے احساسات لطیف پر ایک

وجود اُن کے احساسِ جمال پر بوجھ ہوں۔ مجھے اپنا آپ ایک نعش کی طرح لگتا ہے۔ بے مصرف، بے وقعت، جسے معاشرے میں زندہ بھی رہنا ہے۔ ایک گلی سڑی ہوئی متعفن نعش جس سے دوسروں کو بھی گھن آتی ہے اور جو خود مجھے بھی گھناؤنی لگتی ہے۔ میں کس قدر افسردہ ہوں۔ دنیا میں کوئی متنفس نہیں ہے جو مجھے خوشی بخش سکے۔ میرے مقدر میں یہی کچھ تھا۔ میں اپنے آپ سے خوفزدہ ہوں، اپنے آپ سے نفرت کرتی ہوں اور اپنے آپ پر رحم بھی کھاتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے مجھے کسی قسم کا حجاب محسوس نہیں ہوتا کہ میں اچھی طرح زندگی گذارنا چاہتی ہوں جو محبت اور احترام سے بھرپور ہو۔ میں نہیں جانتی کہ میں محبت کے لیے کیوں ترستی ہوں اور پھر کیوں اس تشنگی کا اظہار بھی کر دیتی ہوں۔ بگلرخ کہتی ہے کہ لڑکیاں کبھی ایسا نہیں کیا کرتیں، شرم محسوس کرتی ہیں۔ شاید ایسی لڑکیاں محبت کی محتاج ہی نہیں ہوتیں یا انھیں جی بھر کے محبت میسر آجاتی ہے۔ لیکن جب میں محسوس کرتی ہوں کہ دنیا میں مجھ سے محبت کرنے والا کوئی نہیں ہے تو مجھ پر رقابت طاری ہو جاتی ہے۔ سب لوگ خود غرض ہیں۔ اپنی تنہائی مجھ پر شاق گذرنے لگتی ہے۔ اس کے باوجود میں طویل وقفوں میں تنہا رہنا پسند کرتی ہوں۔ کل میں سوچ رہی تھی کہ ہم اپنے دوست کو خوش بختی کی دعا دیتے ہیں۔ کسی آزار پہنچانے والے کو بد دعا نہیں دیتے۔ لوگ اسے بد مذاقی پر محمول کریں گے کہ میں نے راشد سے کہا تھا "خدا کرے کوئی ایسا شخص رونما ہو جو تمہاری بہنوں سے عشق کرے، اور پھر توہین آمیز لہجے میں غیروں کے سامنے اس کی تشہیر کرے جیسا کہ تم میرے متعلق کرتے رہتے ہو۔"

آخر خدا ایسے لوگوں کو سزا کیوں نہیں دیتا جو ان بے گناہوں کے دل دکھاتے ہیں جنھوں نے خواب میں بھی کسی کو ایذا نہ پہنچائی ہو۔ میں کس قدر تنہا ہوں۔ میں کیوں کمزوری محسوس کر رہی ہوں؟ کیوں ہر ایک کے سامنے شرما جاتی ہوں؟ کیوں لوگوں سے ملنے سے مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے؟ کیوں کسی سے گھل مل کر بات نہیں کر سکتی؟ میری خود شعوری مریضانہ صورت اختیار کر گئی ہے۔ میں اپنے آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ کہیں روپوش ہو جاؤں کیونکہ لوگ مجھے پہچان لیں گے تو مجھ سے باتیں کریں گے اور میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی...... میں اپنے آپ سے جس شدت سے نفرت کرتی ہوں اسی شدت سے محبت بھی کرتی ہوں اور یہی میرے تمام رجحانات اور پسند و ناپسند کی حالت ہے۔ اس حالت نے میرے اعصاب کو سخت مجروح کر دیا ہے۔ میرا رویہ اپنے متعلق نہ منفی ہے نہ مثبت۔ دوسروں کے متعلق میرا جو رویہ ہے وہ بے شک میری ذات سے ہی صادر ہوتا ہے لیکن اس کا تعلق میری خارجی حکمت عملی سے ہے اور خارجی اور داخلی حکمت عملی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میرے سوچنے کے انداز گوناگوں ہیں۔ لوگوں کے تاثرات جو اثر مجھ پر کرتے ہیں شاید اس کا نتیجہ ہے بعض اوقات ایک لمحے کے لئے میرا ذہن ایسا تھک جاتا ہے کہ میں سوچتی ہوں یہ محض خلا ہے اور کچھ نہیں لیکن دوسرے ہی لمحے میں اتنے خیالات ہجوم کر آتے ہیں کہ میں پہروں انھیں استدلال سے دبا دینے کی حل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ لیکن ہے یہ بہت دردناک۔

راشد میرے متعلق دوسروں سے اس قدر ہتک آمیز گفتگو کیا کرتا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی اور جب مجھے اس کی حیا سوز گفتگو یاد آتی ہے تو میں پاگل ہو جاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ کسی دیوار سے اپنا سر پھوڑ لوں۔ میں اس کی ذات کو چنداں وقعت نہیں دیتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی لڑکی سے اس انداز سے گفتگو کرتا ہے تو اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے اس پر فرض عاید ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے خواہ اس کے نتائج کچھ بھی ہوں لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں بیچاری صنوبر زندگی سے بیزار ہو جاتی ہے کہ اس کی تشہیر اس کی بدصورتی بھی ہے۔ وہ بدصورت کیوں ہے؟ وہ کیوں اپنا سر نہ پھوڑ لے؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ کیا ایک کمینہ ترین شخص کو اس طریقے سے مجھے پریشان کرنے کا حق پہنچتا ہے؟ میں! جس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا تھا کیوں خوشی سے محروم کر دی گئی ہوں؟ جو کچھ میں نے کبھی نہیں کیا اس پر بھی مجھے اپنے گناہگار ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ شخص ایک بیکس اور بے ضرر لڑکی کی اور اس کے خاندان کی ہتک کرنے کے باوجود خوش و خرم ہے۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

میری طبیعت کیسی ناساز ہے۔ اعصاب شکنی کی کیفیت ہے۔ خدا معلوم میرا کیا ہو گا! میری زندگی کس ڈگر پر رواں ہو گی؟ میں محسوس کرتی ہوں جیسے کسی ریگستان میں بھولی بھٹکی ماری ماری پھر رہی ہوں۔ تنہا، اداس، اپنے سامنے پرچھائیں پر نظریں گاڑے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے بڑھتی جا رہی ہوں۔ آگے سے آگے اور آگے۔

رضیہ فصیح احمد

سفر وسیلۂ ظفر

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے پرانے مقولوں کو ٹھونک بجا کر دیکھیں کہ وہ اب بھی سکۂ رائج الوقت ہیں یا انھیں لاہور کے عجائب گھر میں سجا دینا چاہیے تاکہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ کبھی پہلے زمانے میں لوگ پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے تھے، اور یہ بھی سنو کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوا کرتا تھا۔

پرانی داستانوں میں جس کو دیکھیے، سفر میں کامرانیاں ہیں کہ قدم قدم پر ہم رکاب ہیں۔ پیر مرد اس امید میں سوکھ رہے ہیں کہ کب سب سے چھوٹا شہزادہ آئے اور وہ اسے پرستان کی پرخطر راہ سے گزرنے کا ڈھنگ بتائیں۔ قصہ شاہ یمن کا پڑھیے: "ایک روز ایک شخص آیا اور سوال کیا" اگر تو خدا پرست ہے تو للہ تین دن مجھے سلطنت کرنے دے"۔ بادشاہ نے فرمایا "بسم اللہ"۔ چوتھے روز بادشاہ آیا، کہا "کیا قصد ہے؟" سائل بولا "پہلے تو فقط امتحان تھا اب بادشاہت کا مزہ ملا۔ برائے خدا تاج و تخت مجھے بخش دے"۔ بادشاہ نے کہا "یہ حکومت آپ کو مبارک ہو"۔ بس جناب بادشاہ نے "جامۂ عریانی بدن پر چست کیا اور چل نکلا" "توکلت علی اللہ"۔ کیسی بے نیازی! اب راہ میں بیوی کھوئے گی بچے مر جائیں گے مگر یہ صاحب ذرا ہراساں نہ ہوں گے کیونکہ اس مقولے پر پکا بھروسہ ہے اور معلوم ہے کہ انجام ہر کہانی کا اچھا ہی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ آخر میں بیوی بھی ملی اور بچے بھی زندہ سلامت نکل آئے اور ایک کے بجائے دو سلطنتیں بھی قبضے میں آئیں۔ ایسے بھلے زمانے میں کیوں لوگ سفر کر کے اپنی جانوں کو خطرے میں نہ ڈالتے۔

اور سنیے "حاتم شہر سے نکلا، جنگل کی راہ لی۔ ایک مدت کے بعد ایک بستی نظر آئی۔ شہر پناہ کے باہر ایک پیر مرد نے پوچھا، اے جوان تیرا نام کیا ہے۔ اس نے کہا حاتم نام ہے اور یمن کا رہنے والا ہوں۔ حمام بادگرد کی خبر کو جاتا ہوں۔ بزرگ نے سر نیچا کر لیا اور کہا، اے عزیز وہ کون تیرا دشمن ہے جس نے تجھے بھیجا ہے۔ وہاں جو گیا، پھر نہ پھرا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ حاتم ایسی اڑن گھائیوں میں آنے والا نہ تھا۔ اس نے بھی سفر وسیلۂ ظفر کی حکایت سن رکھی تھی اور بہت سی داستانیں اس نمونے کی پڑھ رکھی تھیں چنانچہ اس نے پیر مرد کی بات سنی ان سنی کی اور آخر حسن بانو کو مطمئن کر کے اس کی شادی منیر شامی شہزادے سے کرا دی۔

آپ نے اپنی دادی اماں سے وہ کہانیاں ضرور سنی ہوں گی جن میں ماں اپنے احمق بچے کو سفر کے لیے گلگلے دے کر نوکری کی تلاش میں روانہ کرتی ہے۔ وہ طرح طرح کی حماقتیں کرتے ہیں مگر آخر میں شاد کام و بامراد لوٹتے ہیں۔ اس زمانے کی تمثیلی کہانیوں پر بھی میں نے غور کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں ؎

بناداں آں چناں روزی رساند کہ دانا اندراں حیراں بماند

جو جتنا زیادہ گاؤدی ہوگا سفر میں اتنا ہی کامران اور شادماں ہوگا۔ آپ نے وہ پنجابی کہانی بھی ضرور سنی ہوگی جس میں ایک شوہر نامدار گائے فروخت کرنے جاتے ہیں اور خالی ہاتھ واپس لوٹ کر بیوی کو قصہ سناتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے گائے کا سودا بکری سے اور بکری کا سودا مرغی سے کیا اور ایک وقت کے کھانے کے لیے مرغی بھی دے ڈالی۔ وہ عفیفہ شوہر کی ہر بات کی تعریف کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ خاوند کا چھپا ہوا دوست شرط ہار جاتا ہے اور گائے

کی نسبت سے بھی زیادہ اسے دیتا ہے اور یوں وہ مرد احمق، اور زن شوہر پرست ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔

مگر یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب جو کوئی اس قول پر اعتبار کر کے گھر سے نکلے تو سمجھئے دنیا اس پر تنگ ہوئی۔ کہاں کے مرد باریش اور پیر مرد کہ لوگوں کو راہ سجھانے کے انتظار میں کھڑے ہوں۔ یہاں تو کوئی بات نہیں پوچھتا۔ اشارے کیجئے، بلائیے۔ اے بھائی صاحب ذرا بات سنئے۔ مگر بھائی صاحب ہیں کہ ناک اٹھائے خیالوں میں مست چلے جا رہے ہیں۔ اگر کسی ناکردہ کار لونڈے کو رحم آیا تو وہ آپ کی آواز پر چلا آیا۔ اب آپ اس سے حمام باد گرد کا نہیں، سیدھا سادا سا راستہ کسی سڑک کا پوچھئے تو کہے گا کہ کس کے گھر جانا ہے؟ شجرہ نسب آپ کا اور جن کے گھر آپ جا رہے ہیں ان کا پوچھ کر لاتعلقی سے کہے گا "کوئی پتہ نہیں جی" اور پھر ساتھیوں کے ساتھ گولیاں کھیلنا شروع کر دے گا۔

غرض جس غرض سے نکلو سفر میں سوائے زیاں کے کچھ نہیں۔ آج کل پردیس میں نوکری ڈھونڈنا ایسا ہے جیسے خشک تالاب میں مچھلیاں پکڑنا۔ وہ زمانہ گزر گیا جب سارا شہر شہر پناہ کے باہر اس لئے کھڑا رہتا تھا کہ جو بے دال کا بودم سب سے پہلے اس طرف آتا نظر آئے اس کے سر پہ تاج رکھے اور اسے اپنا بادشاہ بنائے۔ اب تو پھر اسی تک کی نوکری بڑے آدمیوں کی سفارش سے ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ پردیس میں کوئی ہیر مرد سفارشی چٹھیاں لئے نہیں گھومتا۔ جب تک پولیس اجنبی آدمی کی تحقیق نہ کرے، خانساماں گیری بھی نہیں ملتی۔ کہاں بادشاہت آپ کی منتظر ہے اور کہاں یہ حال کہ ہر گھڑی "عزت سادات" کے جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ آپ اچھے بھلے جا رہے ہیں، ایک گلی میں مڑے کہ سپاہی نے سیٹی دی اور آ کر نام نمبر نوٹ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ "ون وے" ہے۔ یہ "ون وے" کی لعنت پہلے کبھی سنی تھی؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا اور انسان نے خود کو "ون وے" کا غلام کیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ یک طرفہ راستے کی لعنت حاتم کے زمانے میں ہوتی تو وہ قیامت تک حمام باد گرد تک نہ پہنچ پاتا۔

پہلے زمانے میں بادشاہ تک بھیس بدل کر اس غرض سے نکلتے تھے کہ مسافروں کو گھر لائیں اور ایک وقت کا کھانا کھلا کر ثواب دارین حاصل کریں۔ آج کل ہر شخص اس فکر میں رہتا ہے کہ کوئی پردیسی ملے تو اسے لوٹیں۔ رکشا اور ٹیکسی والوں کے لئے فرلانگ بھر راستے کو بارہ میل کر دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دوکاندار نئے آدمی کی بو سونگھ کر دام دُگنے کر دیتے ہیں اور جیب کترے تو رہتے ہی اس فکر میں ہیں کہ کوئی پردیسی نظر آئے۔

سفر وسیلۂ ظفر کے زمانے میں ٹریفک حادثے نامی کوئی چیز نہیں تھی۔ کنگھے گٹھری میں باندھے، گٹھری ڈنڈے میں لٹکائی اور اکسٹھ باسٹھ کرتے چل دیئے۔ چاہے آنکھیں بند کر کے چلئے اور اب ع "یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد" والا معاملہ ہے۔ سفر کو چلئے تو ماں سے دودھ، بیوی سے مہر اور پڑوسیوں سے کہا سنا معاف کرا لیجئے۔ ہوائی جہاز کا سفر ہے تو سمجھئے آپ فرشتۂ اجل کے پروں پر سوار ہیں۔ ریل کا سفر ہے تو راستے میں بہت سے لیول کراسنگ آئیں گے جہاں جلد باز ٹرک والے سر دھڑ کی بازی لگائے آپ سے پہلے گزرنے کے لئے تیار کھڑے ہوں گے۔ اگر خدانخواستہ سڑک کا سفر ہے تو جان لیجئے کہ ایک جانِ ناتواں کے پیچھے سینکڑوں بسیں، ٹرک اور ہر قسم کی گاڑیاں لگی ہوئی ہیں۔ ان حادثوں سے بچ نکلنا کسی جادوئی قلعے سر کرنے اور آدم خور دیووں کی گردن مروڑنے کے برابر ہے۔

اپنے شہر میں چاہے آپ طرم خاں ہی کیوں نہ ہوں، پردیس میں اگر آپ جھنڈے والی گاڑی پر نہیں ہیں تو محض ایک بے کس اور بے بس مسافر ہیں۔ یقین نہ ہو تو کسی دن ہولڈال میں گودڑ بھر ٹیکسی کی چھت پر رکھ کر نکلئے۔ عزت کس چیز کا نام ہے، اخّوہ، خود آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔ کوئی شریف آدمی آپ سے سیدھے منہ بات نہیں کرے گا جیسے آپ ان کے شہر کے سوتیلے باسی ہوں۔ دوکانداروں کے پاس کبھی ٹوٹے ہوئے پیسے نہیں نکلیں گے۔ ٹیکسی والا الگ آپ کو چکر میں رکھے گا۔ یہاں تک کہ ہاتھ پھیلا کر مانگنے والا فقیر بھی آپ کو حقارت سے دیکھے گا کیونکہ وہ اس شہر کا فٹ پاتھ کا شہری ہے اور آپ محض چلتی پھرتی چیز ہیں۔

لہ ملاحظہ ہو میرا انشائیہ "راہ بتا" غیر مطبوعہ۔

جوش ملیح آبادی

ویران آبادیاں

دھوپ کھائے ہوئے کانٹوں میں بیابانوں کے
پھول بکھرے ہوئے ملتے ہیں شبستانوں کے

کل جہاں، اہلِ خرابات کی اُتری تھی برات
اب وہاں ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

سینکڑوں سوئے ہوئے شہر ہیں سرگرمِ فغاں
لوگ پردے ہی اُٹھاتے نہیں ویرانوں کے

دھوم سے جن کا نکالا تھا جوانی نے جلوس،
دوش پر آج جنازے ہیں اُن ارمانوں کے

حلقۂ زود یقیناں کو یہ معلوم نہیں
کہ روایات ہیں انبار ہیں افسانوں کے

سینۂ رنگ میں سیلاب ہے خونِ دل کا
خیمۂ رقص میں پُرزے ہیں گریبانوں کے

بے زباں خاک کے ذرّات میں کب سے اے جوشؔ
حرف غلطیدہ ہیں گزرے ہوئے انسانوں کے

ظہور نظر

جھڑیاں

برف گرنے لگی
نیلگوں، نرم، ٹھنڈی سپیدی تلے
پوری وادی چھپی

پوری وادی کے اشجار کی ٹہنیاں
برف کے بارِ نازک سے بوجھل ہوئیں
ڈول اپنے، کنوؤں میں لٹکتے ہوئے
چھوڑ کر، دوڑ کر آنکھ اوجھل ہوئیں
سرخ کپڑوں میں ملبوس پنہاریاں

اور کچھ دیر تک ———،
نیلگوں، نرم، ٹھنڈی سپیدی تلے
جسم کا کوہِ تنہا بھی دب جائے گا
بوڑھی کبڑی ہوا کے سوا کوئی اب
پوچھنے حال میرا نہیں آئے گا۔

بوڑھی کبڑی ہوا ———،
جس کے دامن میں ہوگا نہ اک برگ تک
برف گرتی رہے گی دمِ مرگ تک!!

ظہور نظر

ویت نام کو سلام

ولولوں کے رقص، عزم کے خرام کو سلام
حوصلوں کے کاروانِ بے قیام کو سلام
جرأتوں شجاعتوں کے اژدہام کو سلام
جوشِ جدّ و جہد، جوشِ انتقام کو سلام
جنگِ حرّیت کی فوجِ تُند گام کو سلام
ویت نام کو سلام

شب کے خون میں نہا کے سرخرو ہُوئی سحر
جگمگا اُٹھے ہیں شہرِ حرّیت کے بام و در
اب نہیں گھرے گا ڈر کی تیرگی میں کوئی گھر
اب نہیں جھکے گا کوئی سر کسی کے پاؤں پر
اب نہیں رہے گا کوئی اس جہان میں غلام
ویت نام کو سلام

ابن انشا

کوریا کی خبریں (ایک طویل نظم)

۱۹۵۲ء کی لکھی ہوئی یہ نظم جو بوجوہ اُن دنوں نہ چھپ پائی اور ابھی تک غیر مطبوعہ ہے، سوائے پانچ چھ اشعار کے جو "چاند نگر" میں خالی جگہیں پُر کرنے کے کام آئے۔ فی الاصل شاعر کی اسی سلسلے کی دوسری نظموں "مضافات" "امن کا آخری دن" "کوچے کی لڑائی" وغیرہ کے ساتھ پڑھنے کی چیز ہے۔ ویت نام کی لڑائی اور کوریا کے حالیہ بحران کے پس منظر میں اس نظم کی موجودہ اشاعت عین وقت کی چیز ہے۔

۱۹۵۲ء میں کوریا کی جنگ کی دوسری سالگرہ اور عید الفطر کا تہوار ایک ہی روز پڑے تھے اور اخباروں میں دریائے یالو کے عظیم بند کی تباہی کی خبر کو عید کے رسمی پیغاموں کے بہت نیچے جگہ ملی تھی۔ انہی دنوں ایک سرحدی گاؤں سنیتو کو مع اس کی آبادی کے بے دردی سے تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ خبروں اور سانحوں کے بارے میں لوگوں کی کے رویے سے اس نظم کی تحریک ہوئی۔ آج جب کہ ویت نام میں کتنے ہی بند اور کتنے ہی سنیتو کے سے قریے وحشیانہ بمباری سے بے نشان ہو چکے ہیں۔ نظم کے آخری بند میں پیدا کردہ سوال دہرانا بے محل نہ ہوگا:

آنے والے ہیں جو ایام وہ کیسے ہوں گے؟

آج امریکہ کے بماروں نے بمباری کی / بند یالُو کا تبہ کرکے بالآخر چھوڑا
نیم شب گنجے اڈیٹر کو جماہی آئی / ایک کالم میں کہیں اس کو بھی اُس نے جوڑا
عیدِ مسعود کے پیغاموں کے تھوڑا نیچے / اور اسی شام کو اخبار وہ باسی بھی ہُوا

اور یالُو کے بڑے بند کی بجلی گاہیں / ایک جھُلسے سے خرابے کے سوا کچھ نہ رہیں
کف اُڑاتی ہُوئی یکبارگی لپکیں موجیں / آہن و سنگ کی دیواریں جو تیورا کے گریں
اور اُس رات کہیں نور نہ تقسیم ہوا / کارخانوں میں بھی دیوزاد مشینیں نہ چلیں

اتنے برسوں سے انسان نے پتھر ڈھوئے / تب کہیں ساحلِ یالُو کا یہ پشتہ اُبھرا
دُور کی رِل کے مچلتے ہُوئے پہیے گھُومے / دُور کے شہر کی شہراہ کا چہرہ چمکا
لیکن امریکہ کے بماروں کی اک ٹکڑی نے / ایک ساعت میں اسے نیست و نابُود کیا

اپنے ہی اِس ملک سے وہ پیار ہے ہم کو کہ اِدھر   دوسرے ملک کا کوّا بھی نہ آنے پائے
لیکن اک دیس میں جب وحشی ہنوں کے لشکر   موت کے تحفے، غلامی کے سندیسے لائے
ہم نے اِن لوگوں کی نصرت کی دعائیں مانگیں   ہم نے اِن لوگوں کی عظمت کے قصیدے گائے

یاں نہ شعلوں کی لپک آئے نہ توپوں کی شلک   یالو دریا ہے بہت دور، بہت دور کہیں
پھر بھی اک بات ہے انسان سے حیوان تلک   جس کا اس حال میں مشکل ہی سے آئے گا یقیں
اب کہ یالو کے بڑے بند کی بجلی گاہیں   ایک جھلسے سے خرابے کے سوا کچھ نہ رہیں

(۲)

”کوریا میں ہے لڑائی کی نئی سالگرہ   آج اِس جنگ کے آغاز کو دو سال ہوئے“
پڑھنے والے نے کنکھیوں ہی سے اس کو دیکھا   اور اخبار کے دو چار اُلٹ کر صفحے
”اب کے شہزادہ علی کس سے کریں گے شادی!“   ایک مضمون کو پڑھنے لگا بے تابی سے

جیسے یہ سالگرہ عیدِ عزیزاں ہی تو ہو   جیسے کچھ دیر میں لاتے ہوں سجیلے مہماں
ایک ننھے سے حسیں چاند کی دلجوئی کو   نکہت و رنگ و لطافت میں بسے خوانِ گراں
شورِ تبریک میں تحفوں کے کھلیں گے دھاگے   اور ہر شے پہ مچل جائے گا وہ جانِ جہاں

اور یہ جشن، یہی سالگرہ دور کہیں   ایک وادی میں سے گزری ہے چپکے چپکے
کوئی صحرا کا چھلاوا، کسی لاشے کے قریں   کس کے ہونٹوں کی حلاوت کے پرانے قصّے
ایک ملبے کو سناتے ہوئے رُک جاتا ہے   اور کہتا ہے کہ اس بات کو دو سال ہوئے

دُور کے دیسوں سے آتے ہیں سجیلے مہماں — کوریا کے لیے تحفے میں کھلونے لے کر
یہ ہیں بمبار، یہ نیلا سا ہے یو۔این کا نشاں — یہ رہے ٹینک، یہ توپیں، یہ جیالے لشکر
یہ رہی موت، یہ ویرانی، یہ بندی خانے — تجھ سے کیا چیز ہے، اے جانِ برادر، بہتر

دشتِ ویراں میں کسی غولِ بیاباں کی طرح — قافلے کوریا والوں کے بھٹکتے نکلے
درد کی رات ہے لمبی شبِ ہجراں کی طرح — جس میں ہے مشعلِ مہتاب نہ تاروں کے دیے
کون منزل ہے، کہاں پہنچیں گے بھٹکے راہی — آپ کٹ جائیں گے اس راہ کے کتنے کتنے

(۳)

سطحِ کاغذ پہ سیاہی نے چُنی ہے افشاں — ملگجے ملگجے صفحوں پہ یہ بے جا سی سطور
کتنی گودوں کے اُجڑنے کا بنی ہیں عنواں — کتنی مانگوں سے دُھلاتی ہیں رسیلا سیندور
کتنے کھیتوں میں اُگاتی ہیں پُرآشوب دھواں — کتنے میدانوں میں قبروں کی قطاریں بھرپور

ریڈیو شام کو لاتا ہے شتاپ شپ خبریں — ہر نئی صبح چلا آتا ہے تازہ اخبار
• آج تو گاؤں سنبجو کا بھی آیا زد میں — اب تو اک جھلسا خرابہ ہے وہ خستہ مسمار"
• آج نیپام نے جھلسائی ہے کشتِ دہقاں — آج زندوں کے لیے کھودے ہیں زندوں نے مزار"

بحثیں ہوتی ہیں بھرے کیفوں میں ایوانوں میں — کون اس جنگ میں مجرم ہے، یہ کس کو معلوم
کون سے ملک کی سرحد ہے کہاں، کیا جانیں — کوریا والے کہ امریکی ہیں اس میں مظلوم
کیوں عبث جی کے جلانے کو تم اخبار پڑھو — ایک ہم زندہ حقیقت ہیں، یہ باقی موہوم

زخمی پنچھوں کی کراہوں میں ترنم ہے نہ لوچ
ننگی نرسوں کی نگاہوں میں نہ رس ہے نہ مٹھاس

جلتے کھیتوں کے نظارے سے تو جلتی نہیں سوچ
سُونے شہروں نے تو پہنا ہے اُداسی کا لباس

پھر وہ کچھ لوگ سجانے چلے ایوانِ غزل
کوئی مضموں جو نہیں شاعرِ مجبور کے پاس

آج یا کوُ ہے تو کل اور بھی پشتہ کوئی
اب سنبھو ہے تو کل اور بھی قریے ہوں گے

آج پوُرب کے خرابوں میں ہے اُترا کوئی
کل یہ کرگس سبھی اطراف میں پھیلے ہوں گے

آج کے روز جو یہ بات نہ سمجھا کوئی
آنے والے ہیں جو ایّام وہ کیسے ہوں گے!

زہرا نگاہ

ویت نام

دیکھو تو خرامِ پا فگاراں
کانٹوں کی زباں پہ گُل کھِلے ہیں
ہر دیدۂ تر کے لعل و گوہر
ہر سینۂ چاک پر سجے ہیں
ویرانے میں زندگی چھپی ہے
سنّاٹے میں دل دھڑک رہے ہیں
تاروں میں اک آگ سی لگی ہے
ذرّوں کے چراغ جل رہے ہیں
جو سر کہ قلم ہُوئے، نشاں ہیں
جو خاک ہُوئے وہ راستے ہیں
ہر ظلم کی وسعتوں کے آگے
ہر درد کے کتنے حوصلے ہیں
برسوں سے ہے موت رقص فرما
برسوں سے یہ لوگ جی رہے ہیں

زہرا نگاہ

ایک بچہ — شمالی ویت نام کا

جب سے میری آنکھ کھلی ہے
میں نے اپنی اس بستی پر آگ برستی ہی دیکھی ہے
خندق کی اس گود میں، میں نے
جینا سیکھا، رہنا سیکھا
ہر دکھ درد کو سہنا سیکھا
جب سے میں نے کہنا جانا
میرے لبوں سے یہ نکلا ہے
میری بستی پر چھائی یہ چھت آخر کب نیلی ہو گی
کب اس میں تارے چمکیں گے
اور کب دودھ سے بادل، جو میں سوچوں گا وہ بن جائیں گے
اور کب روشن دھوپ کے ذرّے میری مٹھی میں آئیں گے
کب کھیتوں میں دوڑتے میں بھی ہوا کے جھونکوں کو چوموں گا
اور کب چاند کی ٹھنڈک کو میں اپنے ہاتھوں سے چھُو لوں گا

میں نے سُنا ہے
مجھ کو یقیں ہے
اِس دنیا میں
سورج، چاند، ہوا پر کوئی قید نہیں ہے

تابش صدیقی

قاتل

لوگو! میں نے قتل کیا ہے
میری جانب دیکھو،
میں کل شام کی تنہائی میں
شام کے سانولے رُوپ میں ڈوبا
اس منظر کو دیکھ رہا تھا ۔۔۔!
میں نے دیکھا،
مجھ سے تھوڑی دُور اک سایہ
اپنے آپ میں کھویا ہوا ہے
بکھرے بال، آشفتہ چہرہ
آنکھیں ۔۔۔ دُور افق سے حمائل
اور کچھ ہونٹ سے کانپ رہے ہیں
پھر اک جانب سے اِک سایہ
چپکے چپکے، ہولے ہولے، چلتے چلتے
اس سائے کی اور میں پہنچا
اور اچھل کر
اپنے آپ میں کھوئی ہوئی اِس منزل کی گردن کو دبوچا
جو سوچوں کے بوجھ سے نیچے دبی ہوئی تھی
اک ساعت میں
میرے سامنے لاش پڑی تھی،
اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں
اپنے اپنے دروازے پر آن کھڑی تھیں،
اُبلی اُبلی، پھیلی پھیلی، نُور سے عاری
لیکن اب بھی جیسے مجھکو دیکھ رہی تھیں،
قاتل ۔۔۔؟
دُور دُور تک اس کا کہیں بھی پتہ نہیں تھا،
اور میں سمٹ کر خول میں اپنے ۔
دل ہی دل میں کانپ رہا تھا
حیران، تنہا!
میں نے بے بس لاش کی جانب غور سے دیکھا
مُردہ آنکھوں کی دھندلی تحریر میں جھانکا
میں تیرے رستے کا پتھر،
تیرے مستقبل کا دشمن،
تیرے ہاتھوں میں اپنے انجام کو پہنچا،
لیکن ۔۔ اب بھی تیری راہیں،
پہلی سی مسدود رہیں تو ۔۔۔؟
اور میں اچانک خواب سے چونکا
اور پھر چیخا
لوگو! میں نے قتل کیا ہے،
لوگو! میری جانب دیکھو،
لوگو! دوڑو، مجھکو پکڑو،
لوگو! مجھکو دار پہ کھینچو

احمد ظفر

چاندنی

پھر وہی چاند اُبھر آیا ، وہی دشنۂ غم
میرے سینے میں اُتر جائے گا
میں کسی راہیٔ واماندۂ منزل کی طرح
خواب دیکھوں گا ، وہی دُھند میں لپٹے ہوئے خواب
روشنی پھیلی ہوئی ہے ـــــ جس میں
ایک دوشیزہ چلی آتی ہے
جس کی آنکھوں میں تبسّم کے کنول روشن ہیں
سانس ، رفتارِ صبا کی جیسے
ہونٹ پھولوں کی قبائے رنگیں
اور ـــ کچھ اور قریب آتے ہیں
میں کسی وادیٔ گمنام میں کھو جاتا ہوں
چاند چپ چاپ مرے ساتھ رواں رہتا ہے

عشرتِ خواب مگر راس کِسے آئی ہے
خواب پھر خواب ہیں ، ہر روز بکھر جاتے ہیں
دیکھتا ہوں وہی دوشیزۂ خواب
اک بھکارن کی طرح ، ہاتھ میں کشکول لیے
میرے بُت خانۂ احساس کی دہلیز پہ آ بیٹھی ہے
میرے سینے سے لہو بہتا ہے دریا بن کر
چاند کا عکس بھی افسردہ ہوا جاتا ہے

صہبا اختر

قیامت

جب آدمی ارتقائے ذہنی کی آخری منزلوں میں ہوگا
جب انتہائے عروج پر قوتِ ارادی پہنچ چکے گی
تو ذہنِ انساں میں آخری آگ جوشِ تخلیق سے جلے گی

یہ جوشِ تخلیق اپنی عظمت کا آپ آئینہ دار ہوگا
یہ جوشِ تخلیق اک دماغِ عظیم کا نقش کار ہوگا
اور اس دماغِ عظیم سے خلق ہونے والے
خیال کے خوفناک عفریت بے کراں قوتوں کے مالک
ہمالیہ کو بھی ایک چٹکی سے مثلِ خاشاک اٹھا سکیں گے
اگر کسی رات تیرگی سے الجھنا ہوگا
تو وہ بھیانک سمندروں کو جلا سکیں گے
اگر کسی دن فضا میں مطلوب ہوگی ظلمت
تو ایک سورج تو کیا، جہانِ مہ و ستارہ بجھا سکیں گے

خیال کے خوفناک عفریت آدمی کے غلام ہوں گے
وہ جن کو تعمیلِ حکم میں ایک ثانیے کی نہ دیر ہوگی
عجیب وہ کائنات ہوگی، عجیب تر صبح و شام ہوں گے
مگر جب اس عجب کی فضا میں
ہر اک تمنا بر آ چکے گی
حیات ہر رنگ کے شگوفے کھلا چکے گی
تو اک نہ اک دن سرشتِ آدم کے شر سے پیدا
خیال کے خوفناک عفریت فطرتاً سرکشی کریں گے
وہ اپنے خالق سے انتقامِ خودی بھی لیں گے
خیال کے خوفناک عفریت جنگ سے جنگ ہی کریں گے
پھر آدمی لاکھ چاہے اُن کو ہلاک کرنا
وہ اپنے خالق کو ساتھ لے کر ہی مر سکیں گے

محسن احسان

قرب

تمام شب مرے کمرے کی زرد کھڑکی پر
کبھی ہواؤں کے جھونکوں نے آکے دستک دی
کبھی دھڑکتی ہوئی تیرگی نے سر پٹخا
کبھی سمٹتی بکھرتی سی سرد بوندوں نے
خموش شیشے کی دیوار سے گلے مل کر
وہ ایک بات باندازِ محرمانہ کہی
جو میں نے رات کی مہکی ہوئی خموشی میں
رفیقِ راہِ محبت سے والہانہ کہی
وہ رات جس میں سرِ دشتِ آسماں، بادل
کھنکتے موتیوں کی دل نواز رم جھم میں
زمیں کی تشنہ دہانی کے راز کھول گیا
شفق کے رنگ مرادوں کی شب میں گھول گیا

پھر آج رات فلک پر تنا ہے خیمۂ ابر
برستی بوندوں سے روشن ہیں ذہن میں شمعیں
چھتوں پہ ناچتی پھرتی ہیں بے زباں پریاں
لہو میں رقص کناں ہے تمازتِ خورشید
خمارِ قرب دل آرا، فراق کی تمہید
لرزتی بوندوں کے یہ جاں گداز شیش محل
کھلے ہوئے ہیں کسی درد آشنا کے لئے
ترس رہے ہیں کسی جشنِ بے صدا کے لئے

دیارِ شب میں بڑی دیر سے اداس ہوں میں
نگارِ شیشہ گری کا ادا شناس ہوں میں
نظر اٹھا کے مجھے دیکھ، تیرے پاس ہوں میں

عرفانہ عزیز

ہفت پیکر

مترنّم ہے مری روح میں یوں تیری صدا
آبشاروں کی سکوں ریز روانی جیسے
میری پلکوں پہ ہیں یوں گوہرِ شبنم غلطاں
میرے ہونٹوں پہ ہو پھولوں کی کہانی جیسے
میری سانسوں میں مہکتی ہے حنا کی خوشبو
تیری نوخیز محبّت کی نشانی جیسے
کتنا خوش رنگ ہے معصوم تبسّم تیرا
مسکراتی ہو بہاروں کی جوانی جیسے
بس گیا میرے تصوّر میں ہیولیٰ تیرا
ذہنِ شاعر میں کوئی یاد سہانی جیسے
دل کے آنگن میں اُبھرتا ہے ترا عکسِ جمیل
چاندنی رات میں ہو رات کی رانی جیسے

شہاب جعفری

اَدھوری ہستیاں

رفیقِ ازل بہتے پانی!
یہ پتھر ترے ماضیوں کی ہے بھولی ہُوئی اک نشانی
زمانے کی گردش نے تجھ کو سفر
اور مجھ کو حضر
تجھ کو فردائے پیہم
مجھے ماضیِ مستقل
تجھ کو پیکر سے آزاد احساسِ دوراں
مجھے بے حِس و بے صدا جسم بخشا
تجھے سارا اظہار اور مجھ کو ساری خموشی
تجھے کُل عمل، مجھ کو بس آگہی دی
کچھ اس طرح ساکت مجھے کر کے تجھ کو مری رہگذر میں رواں کر دیا ہے
کہ تو ہی مرا ہمنشیں ہو سکے اور نہ میں ہی ترا ہمسفر بن سکوں
اب کچھ اس طرح اپنا ملن ہو رہا ہے کہ تا زیست
تو ہی مرے دل کے صحرائے اعظم کو پہنچے
نہ میں ہی تری ایک بھی موج کو اپنی آغوش میں بھر سکوں
اس نے ماضی و فردا کے ہر لمحۂ وصل کو بے نشاں کر دیا ہے
اسی سوچ میں کب سے گم ہوں
کہ کب لمحۂ حال آئے گا
کب تو مرے پاس ٹھہرے گا
کب میں ترے ساتھ چلنے کے قابل بنوں گا

کمار پاشی

طلسمِ آب

سنا گیا میں زیرِ آسمان پہلی بار جب
دِشا دِشا، ہزار سُو
تو یہ زمیں لہو لہو
اجاڑ حیرتوں میں گم
صدا کی حسرتوں میں گم
طلسمِ آب بن گئی
کہ میرا عکس پا کے اک حسین خواب بن گئی

عذابِ مرگ میں نہ تھا، کسی سراب میں نہ تھا
لکھا گیا تھا میں: مگر کسی بھی باب میں نہ تھا
پڑھا گیا تھا میں: مگر کسی کتاب میں نہ تھا

جو آگ گردشوں میں تھی
جو زندگی تہوں میں تھی
جو تیرگی صفوں میں تھی
وہ میرے دائروں میں تھی
وہ مجھ میں تھی

کہا گیا: کہ اس سفر کا اختتام ہی نہیں
جہاں چلو — جدھر چلو
فضا میں نقش نقش بے نیازِ خیر و شر چلو
صدا صدا بکھر چلو

سنا گیا: کہ وہ شبِ دراز ختم ہو چکی
سنا گیا: کہ پھر سے ہم تماشۂ سحر میں ہیں
کہ گردشِ سفر میں ہیں
کہ رنگ رنگ چار سُو لباسِ بحر و بر میں ہیں

وہ دن بھی ختم ہو چکا
سنا گیا تھا جو یہاں: وہ تیرگی میں کھو چکا
یہ شب جو آج پھر یہاں
افق افق پہ چھائی ہے
ترے مرے وجود کا جواز بن کے آئی ہے

امجد اسلام امجد

جمود

سرد جذبوں کے تعفن سے ڈرو
آرزو کے بند خیموں کی طنابیں کھول دو
خواہشیں چہرہ نمائی کے لیے بیتاب ہیں
سینکڑوں باتیں اسیرِ حلقۂ اظہار ہیں
اپنے حرفوں کو قبائے لفظ دو
کیا صدا کے بخت میں صحرا نوردی ہے رقم؟
خامشی کا قفل توڑو، کچھ کہو
ذہن کے سارے دریچوں سے ہٹا دو چلمنیں
روشنی کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹو — روشنی
زہرِ ظلمت کے لیے تریاق ہے
خواہشوں کی موت وحشت ناک ہے
اپنے چہروں سے نقابیں نوچ لو
موت ہے سب کا مقدر، موت کا آنا اٹل
موت لیکن اختتامِ قصۂ آدم نہیں
بند کمروں میں نہ گھٹ گھٹ کر مرو،
موت سے ایسے ملو
دستکِ شبنم پہ جیسے پھول سے خوشبو چلے
لذتِ اظہار بھی توجیہِ تخلیق ہے!
آرزوؤں کی طنابیں کھول دو
بانجھ ہونے سے بچو
سرد جذبے بدبوئے مُردار ہیں
سرد جذبوں کے تعفن سے ڈرو!!

ناہید ثانی

روایت — ایک اجنبی شہر میں

صبح آئی تو اک موت آسا اجالا ہمارے سروں پر مسلط ہوا
ہم نے وہ پھول جو رات کے دشت سے توڑ کر
سرد لہروں سے لڑتے ہوئے
گرم لمحوں کو اپنی نشانی میں سونپے تھے
مرجھا گئے
ان کی خوشبو وہ پیمان تھی
جو ہمارے تعاقب میں ان موت آسا اجالوں کے گرداب سے
ہم کو آواز دے کر سناتی رہی
داستاں ان بزرگوں کی
جو عہد و پیمان کی عظمتوں کے لئے
منجمد پانیوں میں سلگتے رہے
برف میں آگ کی طرح جلتے رہے
ہم مگر موت آسا اجالوں میں تھے
ہم نے سوچا کہ پیمان، ان داستانی بزرگوں کا
ایسا کشادہ لبادہ کہ جس کو
اگر اوڑھ کر
ہم نے تاریک روشن دریچوں کے قانون کی زد میں آئے ہوئے
شہر کو اپنی منزل بنایا
تو سب لوگ ہم کو ہیولا سمجھ کر ہنسیں گے
ہمیں اجنبی، غیر ملکی سمجھ کر
پھر اک بار
اس دن کے صحرا میں تنہا سفر کے لئے چھوڑ دیں گے

فہیم جوزی

واپسی

جب بھی سوئے ہوئے پانی میں اکیلا کنکر
آن گرتا ہے کبھی بھولے سے
ان گنت دائرے بنتے ہی چلے جاتے ہیں
دائرے، جو کبھی گھٹتے نہیں، بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
پھیلتے پھیلتے پھیلتے موہوم سی اک لہر میں مٹ جاتے ہیں

کوئی تو دائرہ لوٹے، سمٹے
اپنے مرکز سے لپٹ کر روئے
اور محکوم سفر کی روداد
اپنی بے نام نگاہوں سے کہے

لوگ کہتے ہیں یہ سب کھیلنے اور ہنسنے کی باتیں ہی ہوا کرتی ہیں
دائرہ لوٹ کے آیا ہے نہ آئے گا کبھی
میں بھی کہتا تو یہی ہوں، لیکن
میری خواہش ہے کہ اک دائرہ، لوٹے، سمٹے ....

دائرہ لوٹ کے آسکتا ہے تو میں بھی یونہی
ایک دن لوٹ ہی آؤں گا اُسی مرکز پر
جس سے تیرے مرے رشتے کو بقا حاصل ہے !!

اعجاز گل

وفا کے رشتے عظیم تر ہیں

نجانے کس منزلِ وفا پر شبیہہِ و تنام جل رہی ہے
مگر
ہماری جوان آنکھوں کے طاقچوں میں سجے ہوئے خواب بجھ گئے ہیں
ہمارے چہروں کے عکس تحلیل ہو رہے ہیں
ہمارے جسموں کے سُرخ سورج ـــــــــــ
ازل سے نازل شدہ ستم کے سمندروں سے گزر رہے ہیں
کہ آنے والے حسین لمحے سنور رہے ہیں

ہمیں خبر ہے
زمیں کی سچائیاں ـــ گذشتہ صداقتوں سے بھی معتبر ہیں
وفا کے رشتے عظیم تر ہیں

صائمہ خیری

اُلجھن

اک اک کر کے
اتنے کمرے!
اک کمرے میں
چُپ تصویریں،
سوچ میں ڈوبے
سے کچھ صوفے،
بُت کی صورت
چند کھلونے،
اک کمرے میں
ہونٹ کو سیتی
اک الماری،
چند بچھونے!

اک کمرے میں
چُپ چُپ، گُم سُم
چند رسالے
چند کتابیں!

اک کمرے میں
کچھ خراٹے!

اور آخر میں
اک یہ کمرہ
یہ دیواریں
شیشے کے یہ
بند دریچے
دُور سڑک پر
اِکاّ دُکاّ
کوئی مسافر
یا سناٹا —!
بوجھل آنکھیں
گھٹتا سینہ
تپتی سانسیں
چُپ چُپ بیٹھی
سوچ رہی ہوں
ہجر اسی کو
کہتے ہیں کیا؟

سیّد عابد علی عابد

مختصر نظم کی ناکامی

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ گروہ بندی، خود پسندی اور اشتہار بازی کے اس دور میں معیاری اور صحیح شاعری کا معیار ناقص اور مصنوعی شاعری کے مقابلے میں ساقط ہو کر نہ رہ جائے۔ صحیح شاعرانہ تاثر اور مصنوعی غیر شاعرانہ اُبال میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ علامت پسندی کا درس دینے والوں اور علامت تخلیق نہ کر سکنے والوں کے مقابلے میں بغیر غوغا آرائی کے علامتیں تخلیق کرنے والوں کو فوقیت دی جائے۔ الفاظ کے اندر داخل ہو جانے والوں اور الفاظ سے باہر کھڑے رہنے والے شاعروں کا صحیح موازنہ کیا جا سکے۔ ہنگامہ آرائی اور سطحی شور و غوغا کو گہرے احساسِ انقلاب سے ممیز کر کے دیکھا جا سکے۔ اقبال اور جوش میں، احمد فراز اور احمد ظفر میں اُنیس بیس کا فرق نہ سمجھا جائے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ بلراج کومل، کمار پاشی، جمیل ملک، احمد ظفر، شاد امرتسری، شاذ تمکنت اور فارغ بخاری کے مجموعہ ہائے کلام ایک "مسجد قرطبہ"، ایک "بیکراں رات کے سناٹے میں"، ایک "انفرادیت"، ایک "مفاہمت"، ایک "موضوعِ سخن"، ایک "تاثراتِ قدرت"، ایک "خلش تاثر"، ایک "دور کے پیڑ" اور ایک "آوارہ" کے حریف نہیں ہو سکتے۔

شاعری منفرد خیالات اور منفرد الفاظ کا امتزاج ہے جس طرح خیالات و احساسات کا منفرد ہونا بلند شاعری کے لئے لازمی ہے۔ اسی طرح الفاظ کا منفرد ہونا بھی ضروری ہے۔ شاعری میں الفاظ کی انفرادی معنویت کے ساتھ ساتھ ان کی ترتیب کا غنائی ہونا بھی لازم ہے۔ لیکن غنائیت یا آہنگ یا وزن کی قوت اور اثر انگیزی کا انحصار خیالات و احساسات کی صداقت اور توازن پر ہے۔ صداقت اور توازن کے بغیر شاعری کی حیثیت محض خام مواد کی ہوگی جس میں کسی تنظیم کا پتہ نہ ہو۔ غنائیت کی تشکیل میں الفاظ کی تکرار کا (جس میں قوافی کا استعمال بھی شامل ہے) ایک خاص حصہ ہے۔ قوافی میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ خیالات اور احساسات کو ترقی دیتے نظر آئیں اور آہنگ کی تکمیل میں حصہ لیں۔ قوافی کا پر معنی ہونا ان کی بنیادی ضرورت ہے۔ خیالات اور احساسات کی انفرادیت کا یہ مفہوم ہے کہ شاعر کے مشاہدات، احساسات اور تاثرات ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہوں جو دوبارہ بعینہٖ معرضِ وجود میں نہ آ سکے۔ منفرد مشاہدے، احساسات اور تاثرات مناسب الفاظ اور متوازن آہنگ کے مجموعے کو ہم ہیئت (FORM) کے لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ رسکن نے حرکت کو زندگی اور ہیئت کو موت کہا ہے۔ یہ وحدت کا غیر فلسفیانہ تصور ہے جیسے زینو کا ساکن تیر ریاضیاتی مغالطہ پر مبنی ایک غیر فلسفیانہ تصور ہے۔ نا شاعری اور خود زندگی میں بھی حرکت اور سکون باری باری اس انداز سے آنے چاہئیں کہ دونوں مل کر ہیئت کی تشکیل کر سکیں۔ خیالات، احساسات اور تاثرات کے پیچھے انسانی تجربات، اعیان اور نظریات کام کرتے ہیں۔ یہ تجربات، اعیان اور نظریات، انسان اور فطرت کے باہمی اختلاط اور تصادم سے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ اس اختلاط و تصادم سے مختلف و متضاد نظریاتِ زندگی متشکل ہوتے ہیں۔ رومانی اور حقیقت پسندانہ، داخلی اور خارجی، کلاسیکی اور رومانوی، قدیم اور جدید وغیرہ۔ ان نظریات میں بظاہر اختلاف و تضاد نظر آتا ہے لیکن یہ اختلاف و تضاد بلند، معیاری اور مکمل شاعری میں آ کر مٹ جاتا ہے۔ قدیم و جدید ایک ہو جاتے ہیں۔ بلند، معیاری اور مکمل شاعری کا کوئی خاص زمانہ یا کوئی مخصوص لب و لہجہ نہیں ہوتا۔ جلال اور جمال دونوں حسن ہی کے مختلف پہلو ہیں۔

جنھیں شیکسپیئر، غالب اور اقبال میں الگ الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اقبال کا لہجہ اونچا ہے اور میر کا دھیما لیکن دونوں بلند مرتبہ شاعر ہیں۔

شاعری میں جس طرح تصورات اور احساسات کی قید نہیں لگائی جاسکتی کسی خاص ہیئت کی تخصیص بھی نہیں کی جاسکتی۔ ہیئت کا حسن بھی بوقلموں ہے۔ ایک بے قافیہ نظم اسی قدر حسین اور اثر انگیز ہوسکتی ہے جس قدر ایک سخت پابند قسم کی نظم۔ راشد کی بے قافیہ نظمیں جس قدر مکمل اور دیرپا ہیں اسی قدر منیر نیازی کی نظمیں "حرف سادہ و رنگیں" اور "نوری سالان نئے آثار" ہیں جن میں قوافی کا قوام ہے۔

شاعری کے حسن و قبح کا تجزیہ ایک حد تک ممکن ہے لیکن یہ تجزیہ محدود ہوگا کیونکہ اس حسن و قبح کا بیرومیٹر ذوق سلیم ہے اور ذوق سلیم کا تجزیہ کچھ دور چل کر رک جاتا ہے۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز سے بڑھ کر شاید ہی کوئی نقاد شاعری کے حسن کا تجزیہ کرسکے گا۔ لیکن رچرڈز بھی ذوق سلیم سے بہرہ ور نہیں کرسکتا۔ صرف چند اصطلاحات کی مدد سے بعض شعری محاسن یا معائب کی نشان دہی کرسکتا ہے۔ پھول کی ناپائدار زندگی کا مضمون ذیل کے دو شعروں اور ایک رباعی میں ادا کیا گیا ہے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا!

مسکرانے لگی تھی ایک کلی　　　کہ اچانک بہار بیت گئی

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے　　　بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا　　　یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

میر کے شعر کا تاثر مکمل ہے جس کی پوری توجیہہ نہیں ہوسکتی البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ کلی کے تبسم کے عملی اظہار کا جس میں ذومعنویت ہے، شعر کے حسن میں خاص حصہ ہے۔ دوسرے شعر کی نمایاں خامی یہ ہے کہ اس کے دوسرے مصرعے میں بہار کا اچانک بیت جانا اس کی ناپائیداری کو ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر رہا ہے جو سلامت روی اور اعتدال سے دور ہے۔ جوش کی رباعی کا لہجہ حسب معمول بلند اور پرشکوہ ہے جو شعر کے نازک و لطیف احساس کے منافی ہے۔ لفظ 'بابا' کا استعمال بھی مضمون کی متانت سے ہم آہنگ نہیں۔

جھوٹی اور سچی شاعری کی پہچان کے تین طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں:

(۱) ایک معیاری اور ایک غیر معیاری شاعر کا موازنہ

(۲) ایک ہی شاعر کی ایک معیاری اور ایک غیر معیاری نظم کا موازنہ

(۳) ایک ہی نظم کے معیاری اور غیر معیاری اجزا کو الگ الگ کرکے دیکھنا

(۱) جن شاعروں کے مجموعوں کو مضمون کے شروع میں اتنی سختی سے رد کیا گیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے ابھی تک ایک خوبصورت اور اثر انگیز نظم بلکہ مصرع بھی موزوں نہیں کیا۔ ان کی نظموں کی تعریف کرنا کامیاب شاعروں پر ظلم کے مترادف ہے۔ الفاظ اور تاثرات کے باہر کھڑے رہ جانا ان شاعروں کا نمایاں ترین نقص ہے۔ الفاظ شاعر کا واحد ساز و سامان ہیں۔ اگر وہ ان سے صحیح کام نہیں لے سکتا تو اس کی شاعری میں تاثر، گہرائی، سکون اور بلندی پیدا نہیں ہوسکے گی۔

۲-۳-۱۔ ایسے شاعر بھی ہیں جنھوں نے معدودے چند نظمیں اچھی لکھی ہیں۔ ان سے مستقبل کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں لیکن انھیں مکمل شاعر نہیں کہا جاسکتا۔

وزیر آغا کی نظم "دسمبر کی ایک شام"[1] "اعراف" اور "سرخ سویرا" کامیاب نظمیں ہیں۔ عرشؔ صدیقی کی کامیاب نظم "دعائے نیم شبی" کے مقابلے میں "ازلقار کا ایک تاریک موڑ" ناکام اور بے اثر ہے۔ اس کا اہم نقص وہی غیر شاعرانہ ابال ہے جس نے لاشعور کے کنکر روڑے، اندھا دھند کھود کر باہر نکال پھینکے ہیں۔ کاش عنوان کو کامیابی سے سنبھالا جا سکتا۔ ظہورؔ نظر کی پہلی جزوی طور پر کامیاب نظم آخری مصرعے کی بے اثری کے باوجود "دل اور میں" ہے۔ اس کے دو ٹکڑے کتنے اثر انگیز ہیں ؎

ذہن میرا مجھ سے کہتا ہے کہ تو
ہے خود اپنے دل کے صحرا کا سراب
کون تیرے پاس آئے، کس لئے آئے؛
کہ خواب
جاگتی آنکھوں سے کرتے ہیں گریز

تو جب اپنی تشنگی کو خود دکھاتا ہے سراب
چھوڑ کر جاتے نہیں تجھ کو تری
روح کے بے چین و بے منزل سحاب

پہلے ٹکڑے کا پانچواں مصرعہ مکمل تاثر رکھتا ہے۔ بعد سراب اور سحاب کے قوافی کے استعمال نے جذبے کو صحیح اور بھرپور آہنگ سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اس نظم کے مقابلے میں اسی شاعر کی نظم "ٹھنڈی آگ" کا ایک مضحکہ خیز ٹکڑا دیکھیے:

ذہن میں پھیلی ہوئی تنہائی نے
مجھ سے پوچھا، آرزوؤں کی وہ اُجلی شال کس نے چھین لی
ہم نے، ہم نے، ہم نے، میلی دھجیاں چلا اُٹھیں

تیسرے مصرع میں، ہم نے کی تکرار اور میلی دھجیاں، کا نگڑا مضحکہ خیز صورت اختیار کر گیا ہے۔ پھر ذہن میں پھیلی ہوئی تنہائی اور اُجلی شال بھی ناقص تخیل کی پیداوار ہے
وزیر آغا کی نظم "دسمبر کی ایک شام" کامیاب نظم ہے لیکن اس کے مقابلے میں "سرپھرا"، "نقارہ"، "پہاڑ" اور "المیہ" اثر سے خالی ہیں۔
الفاظ کا صحیح ادراک جذبے اور تصویر کو صحیح بناتا ہے۔ یہ خوبی انیسؔ، اقبالؔ اور راشدؔ میں پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ ظہورؔ نظر کا ایک محبوب لفظ 'ذہن' ہے لیکن کہیں بھی یہ موزوں بیٹھتا معلوم نہیں ہوتا۔

"ذہن میرا مجھ سے کہتا ہے کہ تو" اور "ذہن میں پھیلی ہوئی تنہائی نے" (یہ مصرع ناقص تخیل کی پیداوار ہے) ان مصرعوں میں "ذہن" بالکل غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ برعکس اس کے اب راشدؔ کے اس مصرعے میں ؎

ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی

یا اس ٹکڑے میں:

---

[1] بدقسمتی سے یہ نظم "شام اور سائے" میں شامل نہیں کی گئی۔

ایک مبہم سا خیال
دفعتاً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی ؛

یا جیسے جوش کے اس مصرعے میں ؎

ابھی تک ذہن انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

یا اقبال کے اس مصرعے میں ؎

شکوہ ترکمانی ، ذہن ہندی ، نطق اعرابی

یہی لفظ ذہن اپنی پوری موزونیت کے ساتھ استعمال ہوا ہے ۔

وزیر آغا کے اس مصرعے میں ؎

اک پتھریلی چپ نے سینہ تان لیا

پتھریلی چپ کا "سینہ تان لینا" ، دل کو دستک دے کر کہنا غیر فطری تخیل کی علامتیں ہیں؛ اور ویسے بھی "پتھریلی چپ" کہنا بھدا معلوم ہوتا ہے ۔ سنگین خاموشی غالباً زیادہ موزوں ہوتا ۔ الفاظ کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے اور اپنی ایک خاص زندگی اور رجحان ۔ مترادفات کا شاعرانہ وجود کوئی نہیں ۔ یہ صرف لغت سازی کے کام آتے ہیں ۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنے میں شبلی نے اس پر خیال انگیز بحث کی ہے ۔ فلابیر لفظ صحیح کے پیچھے بارہ چودہ برس تک سر کھپاتا رہا ۔ پو نے مختصر نظم کا نعرہ لگایا تھا ، یہ وقت کی صحیح ضرورت تھی ۔ تاہم اس کی نظمیں "ایلڈا راڈو" اور RAVEN اتنی مختصر نہیں ہیں جتنی کہ آج کی مختصر نظم ہے ۔ "شاہنامہ" اور "ایلیڈ" کے بعد سے نظم کا قد بتدریج گھٹتا چلا گیا ہے ۔ گذشتہ سات سال میں جو مختصر آزاد نظمیں[1] شائع ہوئی ہیں انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان میں آزاد نظم کے امکانات ختم ہو چکے ہیں ۔ اس میں قصور کچھ مختصر نظم کا بھی ہے (اس کا سنبھالنا انتہائی دشوار کام ہے) لیکن ناکامی کا الزام شاعروں ہی پر عائد کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ ہمارے مختصر نظم گو شاعروں کے بعض نمایاں نقائص یہ ہیں :

(۱) ریزہ خیالی یا تعمیری صلاحیت کی کمی

(۲) احساس اور تخیل میں جلد بازی

(۳) نفسِ مضمون کی یکسانی (جو مضامین غزل کی تکرار کی یاد دلاتی ہے)

(۴) مصرعوں کی بے آہنگی یا بد آہنگی جو ایک مقبول وزن فعلن کی تکرار اور اس کے متنوعات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے ۔

(۵) قوافی کی عدم موجودگی یا ان کا غلط استعمال

(۶) بعض غزل گو شاعروں کا نظم گوئی پر اصرار

(۷) انگریزی ، اردو کے پروفیسروں کا خود کو شاعر سمجھنا

(۸) انگریزی شعرا اور ان کے دبستانوں ، تحریکوں سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہونا ۔

(۹) اپنے شعور ، مشاہدہ اور احساس کو نظر انداز کرنا ۔

---

[1] مجھ سے زیادہ کوئی اس بات کو جاننے کا جواز نہیں رکھتا کہ کافی تعداد میں خراب نثر نظم معرا کے نام سے لکھی گئی ہے ۔ ایلیٹ

(۱۰) الفاظ کی معنوی انفرادیت سے بے خبری

(۱۱) ناقص تخیل

(۱۲) بعض شعراء اس وجہ سے ناکام ہیں کہ وہ نثر بھی خراب لکھتے ہیں اور بعض کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ وہ نثر اچھی لکھتے ہیں۔ مثلاً اعجاز فاروقی وغیرہ مختصر نظم عموماً پانچ سے آٹھ دس مصرعوں تک کی ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ لمبی نظم کو مختصر نہیں کہہ سکتے۔ پانچ مصرعے کی نظم کا اکثر و بیشتر بے ہیئت ہو جانا ممکن ہے۔ ڈاکٹر رچرڈز نے بے ہیئت اور ناکام مختصر نظم کی ایک مثال پیش کی ہے:

THE POOL

ARE YOU ALIVE?

I TOUCH YOU.

YOU QUIVER LIKE A SEA FISH,

I COVER YOU WITH MY NET

WHAT ARE YOU — BANDED ONE?

یہ نظم تاثر کی ناکامی کی وجہ سے بے ہیئت ہو گئی ہے۔ حمایت علی شاعر کی نظم "ثلاثی" کی بے اثری کا سبب بھی بے ہیئتی ہی ہے۔ جس کا مطلب مصرعوں کی کمی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر وہ اپنی تین ثلاثیوں کو ملا کر نو مصرعوں کی ایک نظم بنا لیں جس میں وحدتِ خیال موجود ہو تو ثلاثی کا انفرادی حسن ثانیاً زیادہ کارآمد صورت اختیار کر سکے گا۔ یورپی شاعری میں مختصر نظم کی کافی تعداد میں مثالیں مل جاتی ہیں جس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اس مختصر سے کینوس پر بھی شاعری کا نقش ابھارا جا سکتا ہے۔ محمد صفدر کی نظم "صبح" ہر اعتبار سے کامیاب ہے اور امیجزم کی تحریک سے وابستگی کی یادگار ہے۔ رابرٹ فراسٹ کی نظم "برف کی گرد" ایک اور کامیاب کوشش ہے۔ اردو کی مختصر نظموں کی ایک سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کی اٹھان تو خوب ہوتی ہے مگر ان کے آخری مصرعے گذشتہ حصے کی کیفیت کو مجتمع کرتے نظر نہیں آتے، ایک طرف لڑھک جاتے ہیں پھر کس تاثر کیسے پیدا ہو۔ ایلیٹ کی نظم PRELUDES میں شام کے لیمپوں کے یکایک روشن ہو جانے کا منظر جھلک اٹھتا ہے، اس کا آخری مصرعہ دیکھیے:

AND THEN THE LIGHTING OF THE LAMPS.

اس مصرعے میں "THEN" کے STRESS نے سارا کام کیا ہے۔ چھوٹی نظموں کی ناکامی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ قوافی کی عدم موجودگی اور غیر موثر قوافی کا استعمال۔ محمد علوی کی نظم "خوفناک رات" میں صرف قوافی کے تواتر نے اثر پیدا کیا ہے:

آنکھیں تڑپ رہی ہیں اندھیرے میں ڈوب کر
کمرے میں اور کوئی نہیں، کوئی ہے مگر!!
دیوار و در پہ ہانپ رہا ہے عجیب ڈر
میں سوچتا ہوں بھاگ ہی جاؤں مگر کدھر
ٹوٹا ہوا پڑا ہے مرا جسم خاک پر

اب اسی شاعر کی نظم "چور رہوا" میں قوافی کا غیر موثر استعمال دیکھیے:

کھڑکی کھولی کے چیکے سے باہر نکلی !
گلی میں مجھ کو دیکھ کے شرمائی بھاگی
میں نے دوڑ کے اس کا دامن تھام لیا
پڑی ہوئی تھی اس کی جیب میں مڑی تڑی
ایک نہائے جسم کی خوشبو بھینی سی

نظم میں شروع سے آخر تک قوافی کی بنیاد "ی" پر رکھی گئی ہے اور شروع سے آخر تک ہر جگہ "ی" بدآہنگی کا شکار ہے۔ قوافی سے بہترین کام راشد، احمد فراز اور منیر نیازی نے لیا ہے۔ راشد کی ہر نظم میں سوائے معدودے چند کے قوافی متواتر آتے ہیں جو آہنگ کو کامیاب بناتے ہیں۔ احمد فراز کی تازہ ترین نظموں میں "دروزنا" "درکشن بی بی" میں بھی گر کامیابی سے برتا گیا ہے اور منیر نیازی کی پنجابی نظم "نوری سالاں دے آثار" "حرف سادہ و رنگیں" میں بھی اسی طریق کار کا کامیاب استعمال نظر آتا ہے۔

ظہیر کاشمیری کی نظم "وہی رات" غالباً اس کی بہترین نظم اور اردو زبان کی چند بہترین نظموں میں سے ہے (قطع نظر آخری بند کی ناکامی کے) اس نظم میں قوافی کی تنظیم مثلث فارم میں کی گئی ہے :

ان گنت حسرتوں میں اک امید
جیسے عصر کہن کی لاشوں پر
تھرتھراتی ہوئی تابشِ خورشید

تصویر کی کامیابی میں امید اور خورشید کے قوافی جو مناسب وقفے کے بعد آئے ہیں، پورا رول ادا کر رہے ہیں ؎

بحر کے منحنی کناروں پر
موتیوں کے چراغ جلتے ہیں (ان دو مصرعوں میں تصویر کتنی جاذب اور نادر ہے)
موج ان کو اگر بجھا دے گی
تندیٔ سیل میں بہانے ہوئے
ظلمتِ بحر میں چھپا دے گی

صرف ان تین مصرعوں میں تاثر گہرا اور مکمل ہو گیا ہے۔ یہاں بھی مثلث فارم استعمال کی گئی ہے۔

عصمت اللہ کی نظم "بکھرتا پیکر" کا آخری لفظ "نامکمل" ہے جس کا صوتی اثر، تشدید، حسن اختتام پیدا کرنے سے قاصر ہے :

خیال — اک سلسلہ ادھورا ہے
خواب — تصویر نامکمل !

"کینسر" (ساقی فاروقی) کے آخری دو مصرعے بھی گذشتہ کیفیت کو مجتمع کرتے نظر نہیں آتے ؎

آج خدا سے وعدہ کرتا ہوں
جس کے بسوں کا مہلک ڈیزل
جس کے ملوں کا اندھا کاجل

ویرونیکا کی سانسوں سے گزر رہا ہے
ویرونیکا کے سینے میں اُتر رہا ہے
جس کے ہاتھوں کی جنبش میں
ہنگاموں کی دھوپ چھاؤں ہے
اسے اکیلا کر دوں گا

اعجاز فاروقی کی نظم "پانی" کا آخری لفظ "کھینچوں" سے آہنگ کا حسن بگڑ گیا ہے:

میں بھی پانی
ندی بن کر بہتا جاؤں
سخت چٹانوں کا دل چیروں
دھرتی کے ہاتھوں پر ریکھا کھینچوں

یہاں "دھرتی" اور "ریکھا" دونوں لفظ غیر موزوں ہیں اور یہ غیر موزونیت عام ہے۔ غرض اکثر نظمیں بد اختتامی کے باعث تاثر کھو دیتی ہیں۔ محمد علوی کی نظم "ریت" کا بھی یہی حال ہے۔

"ریت"
سکوں ریت کا ایک ذرہ ہے
جو ریت نے کھا لیا ہے
اسے ڈھونڈنے کی نہ کوشش کرو
اونٹ پر اپنی تنہائیاں لاد کر
پابرہنہ
دہکتے ہوئے ریگ زاروں میں
بھٹکا کرو
اور سرابوں کو دیکھو
تو آنکھیں پھرا لو
کہ سب ریت ہی ریت ہے
ریت ہی ریت ہے
ریت ہی،
ریت!

نظم کے آخری دو مصرعے بالکل فالتو ہیں ان سے اوپر کے دونوں مصرعے ریت کی وسعت کا مفہوم ادا کر رہے ہیں۔ تکرارِ الفاظ کی ایک فنکارانہ حد ہے جس سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

مختصر نظم کی ایک کامیاب مثال رابرٹ فراسٹ کی نظم "برف کی گرد" ہے۔ یہ پابند نظم ہے۔

"برف کی گرد"

ایک کوے نے
ہملاک کے درخت سے مجھ پر
برف کی گرد
جھٹک کر
میرے دل کی کیفیت ہی بدل ڈالی ہے
اس نے میرے دن کے ایک حصے کو
وقفِ افسردگی ہونے سے بچا لیا ہے

آخری مصرعے OF A DAY. I HAD RUED میں RUED کے بجائے طویل نے تاثر کو کامیاب بنا دیا ہے۔ جین مائیکلس کی نظم "رات کا خیال" میں بھی ایک دھچکے سے تاثر کو اختصار سے ادا کر دیا ہے۔

جدید طرزِ احساس کی فہرست میں شامل ہونے کی آرزو نے بہت سے نوجوانوں کے اصلی جوہر کو خود ان سے چھپا رکھا ہے۔ یہ الٹی مت والی بات ہے آپ ساقی فاروقی، وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک ایک غزل پڑھیئے۔ جو ان کی متعدد نظموں پر بھاری ہے۔ بغیر کسی امیج کے بغیر کسی علامت کے۔ یہ دو لفظ تو ایسے ہیں کہ ہر نیا لکھنے والا بچوں کی طرح انہیں موقع بے موقع بول کر ایک عجیب لطف لیتا ہے۔

یہیں کہیں پہ کبھی شعلہ کار میں بھی تھا
شبِ سیاہ میں اک چشمِ مار میں بھی تھا

بہت سے لوگ تھے سقراط کا رو عیسیٰ نفس
اسی ہجوم میں اک بے شمار میں بھی تھا

یہ چاند تارے مرے گرد رقص کرتے ہیں
لکھا ہوا ہے، زمیں کا مدار میں بھی تھا

سنا ہے زندہ ہوں، حرص و ہوا کا بندہ ہوں
ہزار پہلے محبت گزار میں بھی تھا!

جو میرے اشک تھے برگِ خزاں کی طرح گرے
برس کے کھل گیا ابرِ بہار میں بھی تھا

وہ بیل بوٹے بنائے کہ دیکھتے رہے لوگ
یہ ہاتھ کاٹ لئے، مینا کار میں بھی تھا

مجھے سمجھنے کی کوشش نہ کی محبت نے
یہ اور بات ذرا پیچ دار میں بھی تھا!

سپردگی میں نہ دیکھی تھی تمکنت ایسی
یہ رنج ہے کہ انا کا شکار میں بھی تھا

مجھے عزیز تھا ہر ڈوبتا ہوا منظر
غرضکہ ایک زوالِ آشکار میں بھی تھا!

مجھے گناہ میں اپنا سراغ ملتا ہے!
وگرنہ پارسا و دیندار میں بھی تھا

برائے درس اب اطفالِ شہر آتے ہیں
حرام کارِ غنا و قمار میں بھی تھا

میں کیا بھلا تھا یہ دنیا اگر کمینی تھی
درِ کمینگی پہ چوب دار میں بھی تھا

وہ آسمانی بلا لوٹ کر نہیں آئی!
اسی زمین پہ امیدوار میں بھی تھا

اس زور دار غزل میں روش کے اعترافات کی سی عظمت اور جرأت ہے۔ نئی تراشیدہ ترکیبوں کی میں تعریف نہیں کرتا کیونکہ ان میں کئی فلسفیانہ نظاموں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ترکیبیں محض لفظوں کا جوڑ نہیں ہوتیں۔ یہ غزل ایک نئی زبان کی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ اور فراق اور ناصر کاظمی کی لمبی غزلوں کے بعد ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔

وزیر آغا کی غزل کا آہنگ اور انداز بھی دیکھئے۔ اور ان کی متعدد نظموں کو بھول جائیے:

ستارے شب کے صحن میں عجیب گل کھلا گئے کسی کو گدگدا گئے، کسی کا دل دکھا گئے
ہوا ہی کیا جو آپ نے چراغ سب بجھا دیئے فلک پہ دیپ جل اٹھے پلک پہ اشک آ گئے
جہاں جہاں بھی ہم گئے لباس تار تار میں شگوفہ ہائے آرزو کھلا گئے، ہنسا گئے
سکوت ریگ زار میں تھے ہم مثال ابر تر کبھی ہوس کے کھل گئے، کبھی چمک کے چھا گئے

ہم اپنی بات کیا کہیں، ہماری بات ہے بھی کیا
ہوا کے ساتھ چل دیئے، ہوا کے ساتھ آ گئے

شمس الرحمٰن فاروقی کی بے رنگ نظموں کے مقابلے میں ان کی یہ غزل کتنی جاندار اور پُراثر ہے،

لغزش پائے ہوش کا حرف جواز لے کے ہم خود کو سمجھنے آئے ہیں روحِ مجاز لے کے ہم
درد کے ایک لمحے میں کتنے برس گزر گئے مالک حشر کیا کریں، عمر دراز لے کے ہم
شام کے دھندلے سائے میں پھیلے ہیں سائے یار کے سجدہ کریں کہ آئے ہیں ذوق نماز لے کے ہم
رات ڈھلی ہے چاند گم، دور چلے ہیں رو سیے راز تو ہے یہ کس کے پاس جائیں یہ راز لے کے ہم
دور افق پہ جا کہیں دونوں لکیریں مل گئیں آئے تو تھے حضورِ عشق ناز و نیاز لے کے ہم
رقص شرر میں کھو گئے برق کے دل سے مل گئے لالہ و گل میں کھل گئے موت کا راز لے کے ہم

روئے سخن بدل گیا، بڑھنے لگے ہیں فاصلے
آہ سکوت منجمد بیٹھے ہیں ساز لے کے ہم

شاید آپ نے ایک دلچسپ مضمون پڑھا ہوگا:

EVERYBODY'S DESIRE TO BE SOMEBODY ELSE.

محولہ بالا شعراء کی نظم گوئی محض "مختلف[1] بننے" کی خواہش کا اظہار ہے۔

---

[1] میں نے اس مضمون میں نئی غزل کی کیفیتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا جو شاید نظم کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیابی کی مظہر ثابت ہوتی ہے۔ اگر نئی غزل کا آغاز "شعلۂ سایہ" کی اشاعت سے کیا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ نئی غزل کی تعمیر میں فراق، ناصر کاظمی، محبوب خزاں، احمد مشتاق، شہزاد احمد، شہزاد، منیر نیازی، اور ظفر اقبال کا نمایاں حصہ ہے۔

عتیق اللہ

بیسویں صدی میں منظوم ڈرامے کا فن — اور ایلیٹ

شیکسپیئر سے عہد جدید تک کا تین سو سال کا وقفہ ڈرامے ـــــ بالخصوص منظوم ڈرامے کے لحاظ سے بڑا مایوس کن رہا ہے۔ یوں تو اس بنجرپن کی کئی وجوہ ہیں مگر ایک سب سے بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ڈرامے کی ذیل میں شیکسپیئر ایسی منفرد شخصیت اس طرح محیط و ساری رہی کہ کسی بھی فن کار نے اس صنف کو پورے طور سے اپنانا پسند نہیں کیا ـــ گو شیریڈن ایسی دو ایک مثالیں مل بھی سکتی ہیں مگر اس نے نہ تو منظوم ڈرامے لکھے اور نہ اُن سے متعلقہ فن کا دائرہ ہی اس قدر وسیع ہے کہ ہم کسی بھی طرح خواہ وہ کامیڈی ہی کیوں نہ ہو ـــ انہیں شیکسپیئر کی قد آور شخصیت کے مماثل کھڑا کر سکتے ہوں۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہی کافی مدوش امکانات کے ساتھ تخئیلیت کا احیاء شروع ہو جاتا ہے۔ اس تجدید فکر کے پس پشت کئی عمرانی اور نفسیاتی اسباب ہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم سے ہی امریکہ اور انگلستان میں کئی اہم نام سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ معاشی اور سیاسی اعتبار سے اس عہد کی خواہ کوئی نوعیت ہو مگر ادب کے لحاظ سے یہ صدی کافی امید افزا اور منفرد امکانات اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اس دوران ڈرامے کو ان تین مختلف مکاتیب کے ذریعے بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔

(۱) جدید کونٹی نینٹل اسکول

(۲) تاریخی ڈرامہ نگار

(۳) منظوم ڈرامہ نگار

امریکہ میں آرچی بالڈ میک لیش اور میکسویل اینڈرسن نے منظوم ڈرامے کے لئے راستہ ہموار کیا تو انگلینڈ میں ایلیٹ، آڈن اور ڈوروتھی سیئرز نے نئی قدروں اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر منظوم ڈرامے کو اعلیٰ روایتوں سے مستفید کیا۔ اسی گنجلک اور حیات آفریں مدت میں بارکر، گالسورذی اور برنارڈ شا، ابسن کی روایتوں کو ایک نئی طرح دینے میں جٹے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے ساتھ طے شدہ فارمولے رکھتے تھے اور عمومی مسائل اور زندگی کے تاریک ترین اور گھناؤنے گوشوں کو اجاگر کرنے میں اپنی انا کی تشفی محسوس کرتے تھے۔ اس لئے ان کے ہاں خارجی حقیقتوں و صراحت تو مل جاتی ہے مگر ان داخلی محسوسات کی دھڑکنیں بے نام ہو کر رہ جاتی ہیں جن میں ہر دور اپنے جذبات و احساسات کے بجائے اسلافی روابط اور آفاقی تلازمات کے ذریعے اپنے شعور کی آزمودہ سرگرمی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح ان اصحاب فن کے ہاتھوں سماجی تنقید کے نتیجے تو تیار ہو گئے مگر ابدی سچائیوں کی روپ ریکھائیں ادھوری کی ادھوری ہی رہیں۔ انھوں نے وہی دیکھا جو منظر کی پیش سمت دکھا رہی تھی۔ مگر وہ جو پس منظر میں نا صاف ارتسامات کی ایک مخلوط دنیا اپنے وجود کا یقین دلانا چاہتی تھی ـــــ اس تک تو ان کی رسائی تھی نہ ان کو اپنی گرفت میں لینے کی انھوں نے کوشش کی اور نہ ہی اُس انمٹ صداقت کو اپنے خود ساختہ آگہی کے گھیرے میں سمیٹنا چاہا جو اپنے میں اونچ نیچ کی ایک مسلسل اور لاابدی تاریخ رکھتی تھی۔

اس کے برعکس سائنس نے ایک طرح کی ازلی تشنگی کا احساس بیدار کر دیا تھا۔ اس واسطے سے حقیقت اور صداقت کے معنی اور مفہوم کی نئی تشکیل ہوئی۔ خارج کی تلب ماہیت نے داخل کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا۔ آخر کار مراجعت ایک نئی شکل میں عود کر آئی اور پھر انسان نے پہچانے کا ایک نیا طریق کار ڈھونڈ نکالا —— اور وہ تھا مذہب —— جس کے دم سے مابعد الطبیعیاتی اور رومانی رجحانات کی از سر نو تجدید ہوتی ہے —

اس طرح ڈرامہ نگاروں نے نشاۃ الثانیہ کی پیدا کردہ معقولیت پسندی کو بھی اس نو رومانیت کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہوئے عقلیت کو ایک لعنت تصور کیا مگر سوال یہ اٹھتا تھا کہ کیا منظوم ڈرامہ اس اقتصادی نظام کا پوری طرح ساتھ بھی دے سکے گا جیسا کہ کلیفورڈ بیکس نے اپنے شک کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے :۔

"IN SUCH A DEFLATED AGE AS OURS THE REBIRTH OF POETIC DRAMA IS LIKELY TO BE POSTPONED FOR AN INCALCUABLE LENGTH OF TIME."

جبکہ ایلیٹ منظوم طریق کار کو انسانی فطرت کے تئیں ایک مستقل خواہش کا اہم حصہ سمجھتے ہوئے شاعری کو ڈرامے کا ایک فطری اور قطعی ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یہاں وہ نظم کی منفرد اور شدید اکسانے والی قوت کو ذہن میں رکھتے ہوئے تھیٹر کی اس کمی کا جو کہ نثر سے پیدا ہوتی ہے —— تلافی کرتا ہے۔

ایلیٹ کے علاوہ ہیئت و موضوع کے لحاظ سے کم و بیش ہر ڈرامہ نگار جداگانہ نوعیتوں کا حامل ہے۔ مجموعی اعتبار سے مذہبی، فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی رجحانات[1] جس کا بالواسطہ تعلق ریجرڈ کرشا، ہنری وان، ہربرٹ اور ڈن سے تھا، علامتی انداز فکر[2]، یونانی دیو مالائیت، کیو بزم[3] اور مادی سفروضے۔ جدید تحرکات و عوامل، اظہاریت پسندی[4] اور آئرستانی[5] نو رومان پرور دیہاتی زندگی وغیرہ کے اثرات صاف صاف دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ڈرامہ نگار مشرقی شان و شوکت اور مشرقی رکھ رکھاؤ[6] سے متاثر تھے تو کچھ نے جمالیاتی تفریح اور جنسی اپیل[7] اور رومانیت و نو رومانیت[8] پر اپنی تمثیلات کی اساس رکھی۔ اس طرح یہ حقیقت پسند، نیم حقیقت پسند اور غیر حقیقت پسند، منظوم، منثور اور شعری ڈرامے اس صدی کے نصف حصے میں اہم اور غیر اہم، تاریخی، تخلیقی اور ادبی قسم کے ملے جلے اضافے کرتے رہے۔

ان جملہ ڈرامہ نگاروں میں ایلیٹ نے نہ صرف بہترین منظوم ڈرامے لکھے بلکہ اس صنف میں نئی حرارتیں پیدا کرنے کے لئے اپنی تعمیری تنقید کے ذریعے ایک نیا لائحہ عمل بھی دیا جس کی وجہ سے ایلیٹ منظوم ڈرامے کی تجدید کا سب سے بڑا محرک اور سرخیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بلاشبہ ایلیٹ بذاتہ ایک تحریک، ایک منشور اور ایک ناقابل فراموش شخصیت کا مالک ہے۔ گو ایلیٹ کچھ اعتبار سے فرانسیسی ڈرامہ نگار شاعر پال کلوڈیل (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۵ء) سے متاثر تھا مگر فنی معقولیت اور چابکدستی کے ضمن میں وہ ایلیٹ سے سبقت نہیں لے جا سکا۔ کلوڈیل کے ہاں بھی رمزیت اور مذہبی باطنیت رچی بسی ہے جبکہ ایلیٹ بھی ان ہر دو خصوصیتوں کو مزاجی اعتبار سے قبول کرتا رہا ہے، مگر کلوڈیل کے وہ عقیدے جو نیچر سے متعلق ہیں، ایلیٹ کے ہاں ان کی نہ تو پورے طور سے توضیح ملتی ہے اور نہ ہی تردید۔ وہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ میکانکی عہد کے الجھاوؤں نے انسان سے اس کے مقدس ترین روحانی روابط و ہمہ رنگ فطری تلذذات، یہاں تک کہ ستھرے اور سبلے لاگ ذائقے بھی چھین لئے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو یہ دونوں بڑے

۱؎ ایلیٹ۔ بیبی خیلڈ نکولسن۔ کرسٹوفر فرائی
۲؎ ڈیوڈسن: یہ مروجہ مذہب و اخلاق کی سختی سے نفی کرتا ہے۔ اسٹیفن اسپینڈر
۳؎ او کیسی
۴؎ ڈیوڈسن
۵؎ ییٹس۔ آسکر وائلڈ
۶؎ ییٹس۔ ایس۔ ایم۔ سنج
۷؎ بوٹملی۔ بیبی فیلڈ۔ بنیون۔ آڈن
۸؎ ییٹس۔ لارنس بنیون
۹؎ ایلیٹ۔ آڈن۔ آئی شروڈ
۱۰؎ میکڈ یے فس۔ گورڈن بوٹملی

شاعرانہ روایت کا پیغام دیتے ہیں تو دوسری طرف ادب کی اپنی دائمی قدروں کو ادب کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں مگر کلوڈیل اپنی تمام خوبیوں کے باوجود تھیٹر کی ضروریات کے مطابق پورا نہیں اترتا جبکہ ایلیٹ نے تھیٹر کرافٹ کو ڈرامہ نگار کے لیے نہ صرف ضروری قرار دیا ہے بلکہ خود بھی کامیابی سے اس پر ثابت قدم رہا۔ کلوڈیل کے ہاں نغمگی اور موسیقیت اس قدر حاوی ہے کہ ناظر کے دل میں اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ ایک ایسا ڈرامہ دیکھ رہا ہے جس کا مصنف ایک بہترین شاعر ہے۔ اس طرح ناظر بجائے اس کے کہ ڈرامے کی خصوصیت کو ذہن میں جگہ دے، شعری خصوصیت کے حصار میں گھر جاتا ہے۔ ایلیٹ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ لوگ ڈرامے سے زیادہ شاعری سے لطف اندوز ہوں۔ اسی بنا پر ایلیٹ نے اپنے پہلے ڈرامے "مرڈر ان دی کیتھڈرل" کے کورس ایسے خالص شعری نمونے دوبارہ ڈرامے میں پیش نہیں کیے۔

ایلیٹ نے اپنے مختلف مضامین میں منظوم ڈرامے کے احیاء کے سلسلے میں کئی باتیں کہی ہیں مگر اس کے دو مضمون "ڈائیلاگ ان ڈرامٹک پوئٹری" اور "پوئٹری اینڈ ڈرامہ" خصوصاً اور "پوسی بلیٹی آف پوئٹک ڈرامہ" "دی نیڈ فار پوئٹک ڈرامہ" اور "ڈائیس آف پوئٹک ڈرامہ" عموماً کئی لحاظ سے ڈرامے کے فنی اور تعمیری پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان مضمونوں میں ایلیٹ نے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے کہ منظوم ڈرامہ اپنی بے شمار صلاحیتوں کی بدولت نثری یا شعری ڈرامے سے کہیں موزوں اور افادی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ انھیں مضامین میں اس نے ان غلط فہمیوں اور شکوک کا ازالہ بھی کرنا چاہا ہے جو منظوم ڈرامے کے حدود و امکانات کے واسطے سے پچھلی اور بیسویں صدی کے اوائل سے تعلق رکھنے والی نسل کے ذہن سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ اس یک طرفہ ذہنی جانبداری کو گمراہ کن بتلاتا ہے کیونکہ یہ غلط انداز سے منظوم ڈرامے کی ترقی میں ایک عرصے سے اچھلے پانیوں پر کائی کی طرح جمے رہے جس کی وجہ سے یہی نہیں کہ منظوم ڈرامہ جو کہ شیکسپیر اور مارلو ایسے غیر معمولی آثار اپنے ساتھ رکھتا تھا ایک مسلسل اور زندہ روایت نہیں بن سکا بلکہ از خود ڈرامے کی راہ میں یہ بدعتی اور ناویلاتی مغالطے اور منفی خیالات بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے۔

منظوم ڈرامے کے سلسلے میں عموماً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ نئے مسائل اور نئے رجحانات کے لیے نظم ناکافی ہے اور ڈرامے کا جذباتی کینوس اور حقیقی سچائی محدود ہوتی ہے جبکہ نظم میں وہ اور کھنچ کر رہ جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ایلیٹ نے "دی فیملی ری یونین" لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ ڈرامہ نہ صرف یہ کہ نئے محسوسات اور عوامل کے اظہار کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے بلکہ نظم کے اپنے وسائل اور ذرائع نثر سے کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ایلیٹ "دی فیملی ری یونین" سے "کوکٹیل پارٹی" اور "کونفی ڈینشل کلرک" وغیرہ ڈراموں میں نثر کی مداخلت سے دانستہ گریز کرتا ہے۔ یہ گریز اس قدر چابک دستی سے عمل میں آیا ہے کہ ناظر کو نثر اور نظم کا فرق محسوس نہیں ہو پاتا اور نہ ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایلیٹ کی شاعری سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ ان ڈراموں میں کرداروں کا انتخاب بھی موجودہ تہذیب میں سانس لینے والوں سے عمل میں لایا گیا ہے۔ انھیں دیکھ کر فوری طور سے آج کی بدلتی ہوئی قدروں، نئے تہذیبی اضافوں اور ماضی قریب و بعید اور موجودہ عہد کے درمیانی فاصلوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انھیں ڈرامے کو آگے بڑھانے کے لیے نثر کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی کہیں نظم غیر فطری اور بوجھل ہی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے کردار نہ تو قرون وسطی سے متعلق ہیں اور نہ "منفرد" ہے بلکہ ان میں بیسویں صدی کے گوشت پوست کے انسان چلتے، بولتے اور شاعری میں بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گو شاعری والی بات کہیں حقیقت سے بہت دور لے جاتی ہے مگر ایلیٹ اس ضمن میں یہ جواز پیش کرتا ہے کہ جب ہم ڈرامے میں "حال" کو اپنی پوری زندگی کے ساتھ گرفت میں لے لیں گے تو ناظر یا سامع کے دل میں اجنبیت کا احساس یوں بھی باقی نہیں رہے گا ناظر وہی دیکھے گا جو اسے تھیٹر میں داخل ہونے سے پہلے نظر آتا ہے یا تھیٹر سے نکلنے کے بعد اس کے تجربے میں شامل ہوتا ہے۔ ایلیٹ سوال کرتا ہے کہ کیا ہر ڈرامائی پیش کش مصنوعی نہیں ہوتی؛ یا کیا ہم اپنے آپ کو اس وقت فریب نہیں دیتے جب ہمیں بڑے سے بڑے حقائق کا سامنا ہوتا ہے؛ یا کیا ایسکلس سے اس عہد جدید تک

انسانی احساسات میں نسبتاً کافی تبدیلی آگئی ہے، وہ ان سب سے انحراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نثری ڈرامہ منظوم ڈرامے ہی کی ضمنی پیداوار ہے۔ شدید جذباتی تموج کے دوران انسانی روح چاہتی ہے کہ وہ اپنے احساسات نظم کی صورت میں پیش کرے۔ یہ ایک داخلی پیاس ہوتی ہے جس کا تعلق اضطراری عمل کے ساتھ ساتھ اندرونی نظام اعصاب اور عضلاتی ترتیب سے ہے۔ بہرحال ڈرامے میں نثری رجحان پر زور دینا اضافی اور مصنوعی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا مقصد اگر ہمہ گیریت اور استقلال ہے تو ہمیں اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے نظم ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ ایلیٹ نے شاعری سے پیدا ہونے والی اجنبیت کو ختم کرنے کے لئے ہی IAMBIC TENTRAHETER پر ڈرامے کا ڈھانچہ بنانا پسند نہیں کیا۔ یہی وہ وزن ہے جو منظوم ڈرامے میں ایک عام معیار بن کر رہ گیا تھا۔ اس طرح ایلیٹ نے شعوری طور سے شیکسپیریت کی عام لعنت سے گریز کی سمت پہلا قدم اٹھایا[1] اور ہیئت میں اس بات کا خیال رکھا کہ کہیں موضوع اور شعر ٹوٹی ہوئی وحدتوں کی شکل میں علیحدہ علیحدہ تقسیم ہو کر نہ رہ جائیں۔

انگریزی میں ڈرامے کی وہ شاندار روایت جو شیکسپیئر کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی۔ اس لئے بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی کہ —— اسٹیج کا استعمال اب فلسفے اور نظریے کی توسیع اور تشریح و ترویج کے لئے ہونے لگا تھا۔ اور ڈرامائی عمل کی سچی پیش کش والی بات ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تحریک جس نے نہایت آزادانہ طریقے سے اسٹیج کو پروپیگنڈے اور تشہیر کا ذریعہ بنایا اسے ہم حقیقت پسند تحریک کا نام دے سکتے ہیں۔ ہنرک ابسن نے ناروے میں اس رجحان کے لئے راستہ صاف کیا اور ولیم آرچر نے اس کے لئے انگلینڈ میں موافق فضا تیار کی جس کی تکمیل بعد کو کڈر، آرتھر جونس، پنرو، شا اور گالسوردی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ایلیٹ مجموعی طور سے اس تحریک کو حقیقت پسندی یا ادب برائے حیات کے نظریے کی شروعات کا نام دیتا ہے۔

عموماً ناظرین شاعری کو ڈرامے میں اب اس واسطے پسند نہیں کرتے کہ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ منظوم طریق کار اپنے میں غیر فطری، مصنوعی اور محدود امکانات رکھتا ہے۔ اس لئے کسی منظوم پیش کش کو دیکھنے سے پہلے وہ اپنے ذہن میں اسی یک طرفہ فیصلہ کو محفوظ رکھتے ہیں حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی عام روزمرہ کی گفتگو سے شعری ڈرامے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایلیٹ اسے بے بنیاد بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک اچھے ڈرامہ نگار کی نثر بھی ایسی ہی مصنوعی ہوتی ہے جیسی کہ نظم — یا بصورتِ دیگر نظم بھی ایسی فطری ہو سکتی ہے جیسی نثر۔

ایلیٹ منظوم ڈرامہ نگاروں کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ پہلے اسٹیج کے علم سے بخوبی واقف ہوں تب کہیں لکھنے کی طرف قدم اٹھائیں۔ کیونکہ کئی ڈراموں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ اس کے لکھنے والے اسٹیج کرافٹ سے بڑی حد تک نابلد تھے، حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری میں ان کا مرتبہ بلند اور اعلیٰ رہا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسے بھی تھے جو اسٹیج کے بہترین جانکار تھے مگر بدقسمتی سے وہ شاعر نہیں تھے یا کم اچھے شاعر تھے۔ اس لئے وہ پرکاری سے نثر اور نظم کی خلیج کو پاٹنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں میں ایک بات اور صاف کرتا چلوں کہ قاری عام طور سے پوئٹک پلے اور ورس پلے کا فرق نہیں کر پاتے۔ یہاں یہ ذہن میں ہونا چاہئے کہ نثر میں لکھے جانے والا ڈرامہ بھی اپنی غنائی اور موسیقی آمیز خوبیوں کی وجہ سے پوئٹک (شعری) کہلایا جا سکتا ہے جیسے آسکر وائلڈ کے چند ڈرامے نثر میں ہونے کے باوجود اپنے میں شاعرانہ رنگ، رس اور مٹھاس لئے ہوئے ہیں۔ یا جے۔ ایم سنج کا "ایڈرس ان دی سی" اپنے میں بے پناہ پوئٹک اپیل رکھتا ہے۔ ایلیٹ کہتا ہے کہ شعری ڈرامہ —— شعری بندھی ٹکی روایت کی وجہ سے کبھی نامعقول پابندیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایلیٹ نے اس قسم کا تجربہ اپنے اولین شاہکار "مرڈر ان دی کیتھڈرل" میں کیا لیکن وہ زیادہ اطمینان بخش ثابت نہ ہو سکا۔ وہ ایسے اوقات میں ایسی ہی بے ساختگی اور فطری پن چاہتا ہے۔ جیسا "اوتھیلو" میں شیکسپیئر اپنے ہیرو کی زبان سے ایسے برجستہ

---

[1] اسٹیفن فلپس جو کہ بیسویں صدی کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے میں والہانہ اپیل رکھنے کے باوجود اس لئے اعلیٰ مقام پیدا نہ کر سکا کہ وہ ایلزبتھن روایت کی بچی ہوئی ہڈیوں کو اکٹھا کر کے اس سال خوردہ ڈھانچے میں از سر نو روح ڈالنا چاہتا تھا جس کی کورانہ تقلید کرنے میں گورڈن بوٹم لی نے اپنی صلاحیتوں کو ٹھپ کر کے رکھ دیا تھا۔

الفاظ کھلواتا ہے:

KEEP UP YOUR BRIGHT SWORDS, FOR THE DEW WILL REST THEM.

(اپنی جھلملاتی ہوئی شمشیریں ہٹا لو کیونکہ اوس انھیں زنگ آلود کردے گی) بظاہر یہ عبارت نثر کی ہے مگر جس ماحول میں آؤ تھیلو سے ادا ہوتی ہے وہاں اس کی موزونیت اور شان و شوکت اسے نظم کا لطیف آہنگ عطا کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ حسنِ ادا ہر ایک کا حصہ نہیں۔ اس کے برعکس منظوم ڈرامہ جو کہ ورس پلے کہلاتا ہے شروع سے آخر تک استثنائی واقعات کو چھوڑ کر ۔۔۔ نظم کا پابند ہوتا ہے۔

منظوم ڈرامے میں بعض اوقات موثر ڈرامائی زبان کی کمی بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ فقدان کردار کی شخصیت کے طریق کار کی راہ میں اس وقت بے ہنگم ثابت ہوتا ہے جب وہ ڈرامے کو کام میں لاتی ہے نہ کہ ڈرامے کی ضرورت پورا کرتی ہے۔

اس کے علاوہ ایلیٹ منظوم ڈرامے میں شاعری کی ڈرامائیت پر بھی کافی زور دیتا ہے اس لئے شاعری بہ ذاتِ خود ڈرامائی ہیئت میں شعری محاسن سے مالا مال ہے اور ڈرامائی اعتبار سے پوری نہیں اترتی تو یہ بھی ایک غلط روّیہ ہے۔ نثر کا استعمال وہیں ہونا چاہیئے جہاں نظم ساتھ دینے میں قاصر ہو مگر ایسا ہر وقت ممکن نہیں کیونکہ ڈرامہ پورے کا پورا نظم میں لکھا جا سکتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے بلکہ اگر ایسی نوبت آ بھی جائے تو وہ اتنی چابک دستی سے ہو کہ ناظر کو اس بات کا احساس تک بھی نہ ہو سکے کہ ابھی ابھی اسے نثر سے سابقہ پڑا تھا یا نظم سے بلکہ یوں کہا جائے کہ شاعر اپنے فن میں ایسی مہارت رکھتا ہو کہ ناظر نظم کی محرکیتوں کے بموجب ہر تصنع اور بناوٹ یا ڈرامائی عیب کو پس پشت ڈال دے اور دیکھنے والا عمومی زندگی سے متعلقہ زبان اور ڈرامے کی زبان میں کوئی فرق محسوس نہ کر سکے۔

ایلیٹ ڈرامے میں نظم کو نثر پر یوں بھی فوقیت دیتا ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کے اپنے وسائل اور امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ نظم کے الفاظ میں جو تہ داری اور معنی خیزی ممکن ہے وہ نثر کے حصے میں کہاں۔ اس کے علاوہ گہرائی، مرکزیت اور وحدتِ شعری اظہار کے مزاج کے سبب منظوم ڈرامے میں نہایت خوش اسلوبی سے تکمیل تک پہنچتے ہیں جبکہ نثر میں ایسی صلاحیت کم ہی ہوتی ہے۔ اگر نظم ان تینوں باتوں کو پورا نہیں کر پاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے خاص مقصد ہی میں ناکام ہے۔ ایلیٹ کے مطابق منظوم ڈرامے میں جذباتی وحدت ہوتی ہے اور شاعر جو بھی جذبہ چاہتا ہے اس میں ہو سکتا ہے۔ اس کا ایک متعین لہجہ بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ لہجہ موثر ہے تو مختلف احساسات نظم کو اور بھی وزن دار بنا دیتے ہیں۔

جمیل ملک

"بیلے بیلے" کا مسافر

احمد ظفر نے پنجابی شاعری کے کوچے میں اُس وقت قدم رکھا جب وہ اُردو کے ادبی حلقوں میں ایک باعزت مقام حاصل کر چکا تھا اور اس کی شاعری فکر و فن کے نوبنو سانچوں میں ڈھل کر نکھر رہی تھی۔ یوں تو اُس کی اردو اور پنجابی شاعری میں چار پانچ برس کا ہی فاصلہ ہے۔ لیکن اس عرصے میں وہ تخلیق کام و دہن کی اتنی آزمائشوں سے گزر چکا تھا کہ ۱۹۴۹ء میں جب اُس نے "کام تے امن" کے عنوان سے پہلی ہی نظم کہی تو اُس کی منجھی ہوئی پرسوز اور شیریں آواز نے سنجیدہ اذہان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ احمد ظفر نے "بیلے بیلے" کی سیاحت کا خوشگوار مگر کڑا فریضہ کیونکر اپنے ذمے لیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اثر صحت مند اور افادی ادب کی تخلیق و ترویج نے ایک اہم تقاضے کی صورت اختیار کر لی تھی اور وقت کی آواز کو دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا تھا کہ اکثریت تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے اکثریت ہی کی زبان میں بات کرنے کا قرینہ واجب بھی ہے اور اہم تر بھی۔ یہی وہ احساس تھا جس نے اُس دور کے بعض نوجوان اور نمایاں اردو شاعروں کو پنجابی شاعری کی طرف مائل کیا اور نئے ذہنوں کا رشتہ علاقائی زبانوں کے کلاسیکی ادب سے منسلک کر دیا۔ اس تحریک کے شعرا میں سے بعض کی تخلیقی سرگرمیاں آگے چل کر شاید اس لئے مدھم پڑ گئیں کہ وہ ہنگامی تقاضے اور وقتی تحریک کے تحت لکھ رہے تھے۔ صرف وہی شعرا مسلسل کہتے رہے ہیں اور آج بھی کہہ رہے ہیں جنھوں نے پنجابی شاعری کے مزاج کو اپنی روح کی گہرائیوں میں ضم کر لیا ہے یا جن کے خون میں پانچ دریاؤں کی گردش رقص کر رہی ہے۔ روح اور ابدیت سے اسی دیرینہ تعلقِ خاطر کی بنا پر احمد ظفر نے نئی پنجابی شاعری میں ایک منفرد آواز پیدا کر لی ہے۔ آج جب ہم اس آواز پر کان دھرتے ہیں تو یہ آواز ماضی کے بیلے سے اُبھرتی، حال کے بیلے سے گزرتی مستقبل کے بیلے کی طرف پرواز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مستقبل کی اس پرواز میں شاعر ماضی اور حال کی اڑانوں کو اپنے تخیل کی رفعتوں سے جدا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک کُرّے سے دوسرے کُرّے اور ایک برج سے دوسرے برج کی طرف سلسلہ بہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ "بیلے بیلے" کے مسافر کی پہلی منزل کو حقیقت یا ارضیت کی منزل کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب احمد ظفر اپنی تنہائی، آبلہ پائی اور بے قراری کا مداوا ملکی اور بین الاقوامی مسائل میں تلاش کرتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی دکھ درد کو کائناتی غموں پر قربان کر دیتا ہے۔ خوبصورت ذہن اور معصوم دل کی ہمکتی ہمکتی اُمنگوں کو اپنے ہاتھ سے حقائق کی بھٹی میں جھونک دیتا ہے۔ اور مسائل حیات کی آندھیوں کے مقابل بھی اپنے آدرش کا چراغ روشن رکھتا ہے۔ ایک مروجہ شاعرانہ روایت کے مطابق یوں بھی ہو سکتا تھا کہ احمد ظفر اپنے آپ کو افلاطونی یا لمسیاتی محبت کے قلعے میں اسیر کر لیتا، شراب کے پیالے میں ڈوب جاتا اور کباب کی سیخ پر جل کر راکھ ہو جاتا مگر وہ تو شاعروں کے اس بدنام قبیلے کا فرد ہی نہ تھا۔ اگرچہ زمانے سے نیک نام کا لقب تو اُسے بھی نہ ملا اور زندگی کی جس شاہراہ پر اُس نے قدم رکھا، رسوائی نے قدم قدم پر اُس کا استقبال کیا مگر یہ کلنک کا ٹیکہ ایسا تھا، جس کی روشنی ہمیشہ سامراجیوں، جنگ بازوں، استحصال پسندوں اور وطن دشمنوں کو اندھا کرتی رہی ہے اور جو بوکھلا کر ہمیشہ حسن، نیکی اور خیر کی اقدار کا تحفظ کرنے والوں پر اندھا دھند سنگ و آتش و آہن کی بارش کرتے رہے ہیں۔ احمد ظفر کی

نظمیں "امن تے لام" "میری جمن بھوئیں"، "اناڑی"، اور "دیکھے سارا جگ" حق و باطل، مثبت و منفی کی اسی آویزش کی نمائندگی کرتی ہیں جن میں شاعر نے واضح طور پر زندگی کی مثبت اور متحرک قوتوں کا ساتھ دیا ہے۔ ان نظموں کے بیلے میں امن کی چاندنی، جنگ کی گھن گرج، معاشرے میں پھیلی ہوئی طوائف الملوکی، طبقاتی کشمکش، جہالت کی تاریکی، داخلی اور خارجی استحصال، وطن دوستی، شاعر کے نظریے کی توانائی اور پُر امیدی بیّن طور پر نظر آتی ہے:

بیلے بیلے سپاں دی شوکر دل نوں ڈس ڈس جاوے   کالا بھور غضب دا بدل پل پل وس وس جاوے   (لام)

نماں نماں چن دا چانن گجیاں گجیاں گلاں   مٹھڑے مٹھڑے بول پیار دے جیوں راوی دیاں چھلاں   (امن)

میری جمن بھوئیں ــــ سدھراں مٹی دے وچ رلدے پھل
میری جمن بھوئیں ــــ اک انھے دی نگری
میری جمن بھوئیں ــــ جناں دی اک بستی
میری جمن بھوئیں
کدی تے دسے
کدے تے کوئی چن جیا مکھڑا
بوہے وچ کھلوتا ہے   (میری جمن بھوئیں)

اچیاں محلاں
اچیاں ماڑیاں
توڑیا جگ داماں
کدے تے ایہناں محلاں اتے
اگ اسماناں دے
کدے تے ایہناں ماڑیاں اتے
قدرت رب دی ہے
کدے تے ایہناں محلاں دے ایہہ کنگرے ڈگ ڈگ پین
کدے تے ایہناں ماڑیاں والے نیویں ہو ہو بہن
اپنا کیتا پان
چودہ رگھے ٹھگ
دیکھے سارا جگ   (دیکھے سارا جگ)

احمد ظفر کی ان نظموں کی بلند آہنگی میں اُس کے دل سے زیادہ اُس کا شعور کارفرما ہے جو پوری طرح بیدار ہے اور جس کے ذریعے شاعر اپنے دل کے تقاضوں کو شعورِ حیات کی ہمہ گیری سے وابستہ کر لیتا ہے کہ دل کو عقل کی پاسبانی سے ذرا فرصت کم ہی ملتی ہے۔ پھر ایک دن اُسے کارزارِ حیات میں عقل کی بازی ہار جانے کا احساس اس شدت سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی سادگی اور خود فریبی پر تڑپ اُٹھتا ہے۔ آتشِ نمرود میں بے خطر کود جانے کے باوجود وہ دیکھتا ہے کہ آگ برابر جل رہی ہے اور باغ و بہار کا منظر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ شاید آئینۂ دل گداز کرنے سے پہلے ہی اُس نے عقل کی رہنمائی قبول کر لی تھی۔ اور اُس کے دل کی جگہ اُس کے شعور نے دل کا فریضہ سرانجام دینے کی ٹھان لی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ شاعر کی سخت جانی اور خلوص اُس کے کام آیا ورنہ کتنے جیالے اس آگ کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو گئے۔ احمد ظفر کو نو عمری ہی میں زندگی کے اتنے بڑے تجربے کا سامنا ہوا کہ اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی شدت کم ہوتے ہی راکھ کے نیچے دبے ہوئے انگاروں کی آنچ اُس کے روئیں روئیں سے گزر کر اُس کے دل کو بھی گداز کر گئی۔ اُس کی نظروں سے ادبی و سیاسی شعبدہ بازیوں کے پردے ہٹ گئے۔ جھوٹ اور سچ آئینہ ہو گئے اور اُس کی شکست ہی اُس کی فن کارانہ جیت کا پیش خیمہ بن گئی "اناڑی" میں اُس نے اس تجربے کا اظہار بڑے بے ساختہ انداز میں کیا ہے جو اُس کے ماضی کا المیہ بھی ہے لیکن جو اُس کے شعور کی یکرنگی اور بلند آہنگی کو اُس کے دل کی دھڑکنوں کا ہمنوا بنا کر اُس کی شاعری کو ایک نیا موڑ بخش دیتا ہے:

بازیاں کھیڈاں بازیاں ہاراں	سونے دی تھاں پیتل تاراں
کھوٹے پیسے دا نگوں آون	مڑ مڑ ہو تھاں دل پکاراں
ایتھے کوڑ سوداگر سارے	ایتھے چکن کالے تارے
ایتھے پیار دی ونج کما دے	ایتھے سوگ دی جنج سداوے

(اناڑی)

ہوش و خرد کے بیلے سے زخمی اڑانوں کے ساتھ احمد ظفر جب دل کے بیلے کی طرف اپنے پنکھ پسارتا ہے، اور مرزا بن کر صاحباں کے گیسوؤں کی چھاؤں تلے اپنے احساس و شعور کی چوٹوں کو سہلانے کے لئے رُکتا ہے تو یہاں بھی لاٹھیاں، چھویاں، نیزے اور شمشیر اُس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں اور اس طرح دل کی دنیا میں بھی اُسے اُسی شکست و فتح کی آویزش کا سامنا ہوتا ہے جس کا تجربہ اُسے خارجیت کے خارزاروں میں ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں صاحباں کا کردار اپنے رسمی معنوں میں نہیں اُبھرتا۔ شاعر جب ہیر کے کردار سے صاحباں کے کردار کا موازنہ کرتا ہے تو ہیر خلوص و ایثار کا پیکر بن کر اُبھرتی ہے اور صاحباں فریب و جفا کی علامت بن جاتی ہے۔ یہاں تک تو شاعر نے صاحباں کے روپ میں اپنی ناکامیٔ محبت کا شخصی ردِ عمل پیش کیا ہے لیکن چونکہ شاعر پہلے ہی نارِ نمرود کے سیاق و سباق کے عملی تجربے سے گزر چکا ہے۔ اس لئے صاحباں کا کردار شخصی ردِ عمل سے بڑھ کر معاشرے کے اجتماعی سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور ایک منفرد اور موثر صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو مرزے کی صاحباں شاعر کی بے وفا محبوبہ کی صورت میں ہی جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ عروسِ ہزار داماد بن کر بھی اُبھرتی ہے جسے ہم دنیا کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ جو سب کی دوست ہے مگر کسی کی بھی دوست نہیں اور جس کے تیروں سے شاعر ہی نہیں، ہم سب ہی گھائل ہیں:-

بیلے بیلے ساڈے پیار نے لئے ہلارے
بوٹے بوٹے پچھے
سدھراں محل اسارے
قدماں دے وچ رُل رُل ڈگے
اسماناں دے تارے

جو ہویا، سو ہویا
سو ہے اک رویا
جہنوں ہیر سیالاں والی بھیا
اوہ مرزے دی ویرن صاحباں نکلی
(صاحباں)

محبت کے بیلے میں دل کی بازی ہار جانے کے بعد شاعر کی ذات میں طوفانوں کا شور برپا ہو جاتا ہے۔ وہ خارجیت کے چکا چوند معیاروں کو آزما چکا ہے۔ اب اُس کی آواز داخلیت کے حصار و حس سے ٹکرا ٹکرا کر خود کلامی اور فریاد زیرِ لب کی صورت اختیار کرنے لگتی ہے۔ وہ صاحباں کے کردار کے دوگونہ عذاب سے کنارہ کش ہونا چاہتا ہے۔ اُسے ترکِ دنیا بھی منظور ہے اور محبوبہ سے قطع تعلق بھی گوارا ہے۔ اُسے چپ کی آگ میں جلنا منظور ہے مگر وہ جھوٹ کو سچ اور خزاں کو بہار کا نام نہیں دے سکتا۔ محبت اور دنیا کے بازار میں اُسے کھرے اور کھوٹے سکوں کی پہچان خوب ہو چکی ہے:

جھوٹا وہم — اج نیاں
اج نیاں
کیہڑی تھاں
ایتھے وکدا — اوتھے وکدا
تیرا ناں — کدے نہ لاں
(تیرا ناں)

احمد ظفر کی وارداتی نظموں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر جس عزم اور قوت کے ساتھ مروجہ غلط نظامِ اقدار کے خلاف کارزارِ حیات میں سینہ سپر ہو گیا تھا اور جتنی جلدی یہ طوفان اُس کے سر سے گزر گیا تھا بزمِ محبت میں اُسے اتنی ہی طویل اور جانگسل آزمائشوں سے بار بار گزرنا پڑا۔ اس میں کس کو کلام ہے کہ معاملاتِ من و تو میں دنیا کے سارے ہی دانا اپنی تمام تر بصیرت کے باوجود نادانیوں ہی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ احمد ظفر نے بھی اس کوچے میں ایک بار تو ایسی ٹھوکر کھائی کہ آج تک اُس کے زخموں سے رخِ یار کی مہک اور اُس کی باتوں سے اُس کے گھائل پیار کی چنگ صاف سنائی دیتی ہے۔ احمد ظفر شبستانِ محبوب میں پیکرِ وصال سے لذت یاب تو ہوتا ہے مگر اس مرحلۂ وصال میں بھی یوں لگتا ہے جیسے وہ فراق کے عالم میں انتظارِ مسلسل کی گھڑیاں گن رہا ہو۔ اس کے پیار میں انتظار کی کیفیت اور اُس کے وصال میں فراق کا پرتو، اُس کو ایسی ناختم تنہائی سے ہمکنار کر دیتا ہے جس کی خاموشی میں اُس کے دل کی صدائیں ٹیسیں بن بن کر اُبھرتی رہتی ہیں اور اُسے اُس محبت کی یاد دلاتی رہتی ہیں جس نے اُس کے درد کو لازوال کر دیا ہے، اور اب یہی درد بھری تنہائی اس کا انمول اور انمٹ سرمایۂ حیات ہے۔ احمد ظفر کی حیاتِ معاشقہ کی تقریباً ساری نظموں کا آہنگ خود کلامی کا آہنگ ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں یا چھوٹے چھوٹے مصرعوں کے دھاگوں میں اپنے دل کے ارمانوں کو الفاظ کے آبدار موتیوں کی صورت پرو دیتا ہے۔ اُس کی خود کلامی کا آہنگ بار بار ان جواہر پاروں کو دہراتا ہے۔ الفاظ کے تواتر اور تکرار سے اُس کی نظموں کے پیکر میں وہ نغمہ جنم لیتا ہے جس کی لہریں سامع یا قاری کے رو میں رو میں سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گزر کر اُس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ غنائیت میں ڈوبی ہوئی یہ خود کلامی تنِ تنہا شاعر کے گنبدِ دل کی صدا بن کر آہستہ آہستہ نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی ہے اور ہر ہر مرحلے پر نغمہ و صدا سے احساس و وجدان کے پردے پر نو بنو پیکر تراشتی چلی جاتی ہے۔ ۵

تیریاں اکھیاں
نیڑے ہو کے تکیاں
دیر کمایا سکھیاں

تیریاں گلاں
نیڑے ہو کے سنیاں
کاہنوں سولاں چنیاں

تیریاں زلفاں
کاہنوں ہتھ وچ لیاں
سپنیاں ڈنگدیاں رہیاں

آساں پیاساں بنیاں
تم نے تانیاں تنیاں
کاہنوں تینوں میت بنایا
کاہنوں تینوں لبھ کے
اپنا آپ گنوایا

(واٹاں)

کہیاں دل تے سہیاں
تے ان کہیاں انجھ
کچ کنوارے انجھ
چیتی اتے ڈگن
کہیاں کہیاں گلاں
کہیاں تے ان کہیاں رہیاں
کہیاں فیر دی کہیاں

(سدراں دی موت)

خود کلامی اور نغمگی کا یہ آہنگ "بیلے بیلے" کی بعض نظموں میں گیت کی لطیف، مانوس، سریلی اور دلسوزی میں ڈھل گیا ہے۔ "دیوا" "مٹھے بول" "اڈیک" "ہنجواں دے ہار" "اک دن جھٹ دا" "اکھیاں" اور "سولاں" میں فراق و وصال کے دیے کبھی بجھتے ہیں اور کبھی لو دے اٹھتے ہیں۔ زندگی کے

مقدر میں کبھی ہار ہے اور کبھی جیت۔ محبت کی گتھیاں سلجھتے سلجھتے پھر اُلجھ جاتی ہیں۔ شاعر کی آنکھوں میں جدائی اور تنہائی کے کنارے آنسو جھلملاتے رہتے ہیں۔ اُدھر فریب پیہم ہے اور اِدھر انتظار مسلسل۔ فراق و وصال اور درد و کرب کی یہ پھانس سینے سے نکلتی ہی نہیں۔ یہ عرصۂ اذیت کٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ "سولاں" میں تو اس دکھ اور محرومی کا اظہار شاعر نے اتنے موثر، دھیمے اور جاں گداز انداز میں کیا ہے کہ اس نظم کے نسائی کردار میں شاعر کا اپنا ہی زخم رستا ہوا نظر آتا ہے۔ شاعر نے بظاہر ایک دلہن کے نالے کو پابند لے کیا ہے مگر بین السطور وہ اپنی بے برگ و بار زندگی کی طرف بھی بلیغ اشارہ کر گیا ہے۔ ماں سے تخاطب کے انداز میں بے پناہ پیار کے ساتھ ساتھ شکایت کا بحر ذخار بھی موجزن ہے جس کا رخ ماں کی ممتا سے زیادہ ماں کی بدنصیبی کی طرف ہے۔ یہ وہ شاخ ہے جس پر ایک بھی پھول جنم نہ لے سکا۔ شاعر اپنی خزاں رنگ زندگی کی مرثیہ خوانی بھول کر اس عظیم ترغم کو اپنے سینے سے لگا لیتا ہے۔ جو اس کی بہنوں کا غم ہی نہیں بلکہ ارض وطن کی ہزاروں جواں سال مجبور و محروم بیٹیوں کا غم بھی ہے اور یوں "ماں" دھرتی ماتا کی علامت بن جاتی ہے جس کی بیٹیوں کو "کھیڑے خوید کر" زنگ پڑ رے جاتے ہیں مگر نہ بابل کا بس چلتا ہے اور نہ کوئی ویر ہی اُن کا ہاتھ پکڑ کر روک سکتا ہے ؎

اور کھ کیہڑا ر کھ سی ماں
جیہڑا کنڈیاں نال پُرتا
جنھے اک دی پھل نہ دِتا
دھیاں نال نے تیر نے سکھے
دھیاں نال تے کریں نیاں
اور دکھ کیہڑا رکھ سی ماں
بابل کسے دے نال نہ لڑیا
ویر کسے دا ہتھ نہ پھڑیا
زنگ پڑ رے گئے کھیڑے میندوں
بھل گئی میں سجناں دے ناں
اور دکھ کیہڑ رکھ سی ماں

(سولاں)

اگرچہ احمد ظفر کی بعض رومانی نظموں میں شکست کا شخصی اور ہنگامی ردعمل بھی ملتا ہے لیکن جلد ہی عاشق و محبوب کے کردار زندگی کی ایک ہی سطح پر افتاں و خیزاں اگریاں و خنداں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل کی دنیا میں کھو کر بھی شاعر ادراک کی شمع روشن رکھتا ہے جس کے اجالے میں وہ اپنے ہی نہیں اپنے محبوب کے زخموں کا شمار کرنے میں بھی معروف نظر آتا ہے۔ جو اسی کی طرح زمانے کے تیروں سے گھائل ہے۔ بادی النظر میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عاشق و محبوب کے کردار بعض شخصی اور مزاجی مجبوریوں کی بنا پر ایک دوسرے سے مطابقت پیدا نہیں کر سکے لیکن بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان دو رومانی کرداروں کی طبیعتوں کے اختلاف کے پس منظر میں معاشرے کا ظلم اور طبقاتی سازش کارفرما ہے جس نے لوگوں کی معصوم قربتوں کو پر فریب خارجی فاصلوں میں بدل دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عرصے تک ان دونوں مجروح کرداروں کو ایک طرف خارجی تصادم سے سابقہ پڑتا ہے اور دوسری طرف داخلی کشمکش کی چتا پر جلنا اُن کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس دوراہے پر ان کی محبت ایک ایسی استفہامیہ علامت بن جاتی ہے جس کا مثبت جواب آج تک فرسودہ نظام اقدار پیش ہی نہیں کر سکا :

ہیسے تے ایہہ دنیا والے
ہاسیاں اتے ہنجو کیرن
تے جے رویئے تے ایہہ ہسن
ہاواں بھریئے تے ایہہ بجھن
جت اساڈی ہاراںھاں دی
کہیئے کی نہ کریئے
کیڑے پاسے جایئے
کیڑا بھیس وٹایئے

(دُکھ سکھ)

رومان اور محبت کے سلسلے میں احمد ظفر کو جاں پرورہی اور جانکاہی کے جس عمل سے گزرنا پڑا، وہ بالآخر رنگ لایا اور اس کے ہاں شکست و فتح کا مفہوم ہی بدل گیا۔ عاشق و محبوب کی روحیں ایک ہی قالب میں ڈھل گئیں۔ اُن کی ہار خلوص و استقامت کی آنچ سے ارتفاع پا کر اُن کی جیت بن گئی۔ دو دلوں کی دھڑکنیں ایک ہی آہنگ میں سمٹ آئیں:

میں اوہدا اوہ شیشا میرا
جس چن دا اے روپ گھنیرا
اوسے اگ دا بھانبڑ بلدا
اوہو جیہڑی پاندی چھالے
اوہو دیوے بالے

(ایک تصویر۔ دو پلے)

شعور کے سلسلے میں شاعر کی پہلی شکست اُسے دل کے سلسلے میں کھینچ لاتی ہے مگر خود آگہی یہاں بھی کارفرما رہتی ہے۔ یہ آگاہی شعور سے زیادہ دل کی آگاہی ہے۔ دل جو عقل کی پاسبانی کے باوجود خود آگاہی کے جلو میں سراغِ زندگی پانے پر مصر نظر آتا ہے۔ شاعر کو اس منزل پر دل کی انانیت اور خودنگری کے ہاتھوں دوسری شکست ہوتی ہے مگر خود آگاہی کا ہالہ بدستور شاعر کی شخصیت کے گرد موجود رہتا ہے اور پھر اُس کی پے بہ پے شکستوں کا خلوص اُسے وہ توانائی اور روشنی بخش دیتا ہے کہ جب وہ عقل و دل کی شکستوں کا حساب کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو اُس کا درد ہی اُس کی دوا اور اُس کا غم ہی اُس کا مسیحا بن جاتا ہے۔ یوں اُس کے اعجازِ مسیحائی کے ڈانڈے حیات و کائنات کی حدود سے مل جاتے ہیں۔ اُس کے اِس اعجازِ مسیحائی کو میں نے ارتفاع کا نام دیا ہے۔ اُس کی نظم "سوال" میں جو نسائی کردار رقصاں ہے "رہا نگی" تک آتے آتے اُس کردار کی پکاریں ساری کائنات کے سینے میں اُتر جاتی ہے جیسے کون و مکاں کی طنابیں کھنچ گئی ہوں:

اک پکھرو جاں وچ ڈکھیا تے کنب کنب گیا جہان
مکھ دھرتی دا سی سنولیا تے رتا سی آسمان
اٹھ لٹی تان کے سنیاہن کتھے ای اوہ مان
میں بوں جناں گھر کے مار یا مری ہے گئے نیں پران

(رہانگی)

آزادی کے وقت امرتا پریتم کے ہونٹوں پر بھی یہی فریاد گونج رہی تھی۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول

گو احمد ظفر نے اس نظم کے مرکزی کردار کے فریادی لہجے کے لئے اسی بحر کا انتخاب کیا ہے جس میں امرتا پریتم کی نظم موجود ہے اور اس اعتبار سے اس نظم پر تکرار و اعادہ کا اعتراض وارد ہو سکتا ہے، تاہم میری نظر میں یہ نظم اپنے چہار جہتی محاسن کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نظم صرف فراق کا ہی اشارہ نہیں ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے کلاسیکی پس منظر میں اپنے دکھ، محبوب کے دکھ اور دھرتی کے دکھ کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ ہمرنگ کیا ہے کہ شاعر، محبوب اور کائنات کا غم اکائی کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جب غم اتنا عظیم اور ہمہ گیر ہو جائے تو پھر اس غم کو سینے سے لگا کر عمر بھر کسی آنے والے محبوب، کسی مسافر اور کسی آدرش کا انتظار کرنا بجائے خود عبادت بن جاتا ہے:

میں بوہا دل دا مار کے تے ڈوہے دتے کھول
اج ہنجو رسم رسم آندے بھر اکھاں دے کشکول
اج لنگھی رات اوہ رہانگلی اج کی ہے میرے کول
میرا اوں وں پچھ پچھ جاندیا مرے نوں نوں تریج نزول

(رہانگلی)

اس نظم میں "رہانگلی" کا کردار ہمارے کلاسیکی کرداروں سسی، ہیر، سوہنی، صاحباں کے مقابلے میں بلند تر شخصیت کا حامل ہے کہ یہ دلہن ایک لٹی پٹی طوائف کی صورت ہی میں نہیں ابھرتی بلکہ دھرتی کا وہ مثالی پیکر بھی ہے جسے اس کے اپنے ہی چہیتوں اس کے اپنے ہی براتیوں نے لہولہان کر دیا ہے، مگر وہ اس حالت میں بھی اپنے محبوب اپنے مطمح نظر اور اپنے مستقبل کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہے:

کیہنوں آکھن لوک رہانگلی میرا گھبرو رنگا رنگ
میرا ساؤ رت وچ ونگیا رہیں سارے جگ دی منگ
میرا تخت ہزارہ لٹ لیا، میرا لٹ لیا اکاں جھنگ
میں باری وچ اڈیکدی، توں کدے تے ایتھوں لنگ

(رہانگلی)

"سوچاں اک مٹیار" میں شعوری اور قلبی سطحوں سے بلند ہو کر شاعر کی سوچ کا کینوس اور وسیع ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں مصنف نے اپنی سوچ کو ایک "مٹیار" (دوشیزہ) کی صورت میں مجسم کر دیا ہے۔ مٹیار کا سراپا زندگی ہی کا ایک متنوع اور متحرک روپ ہے۔ یہ سوچ، یہ عشوہ گر ہرجائی۔ ہزار رنگ میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ کسی کے قتل کا سامان کرتی ہے اور کسی کو حیات جاوداں عطا کر دیتی ہے۔ یہ وہ "مٹیار" ہے جس کو ہم زندگی کے مانوس نام سے پہچانتے ہیں:

وساں شہر گراں	سوچاں میرا ناں
میں بیلے دی نار	میلے وچ مٹیار
میرے سو رنگ	نار جاں الگ
محلاں دے مینار	پل وچ دیاں اسار
پھر دیواں تار	میرے روپ ہزار

"سوچاں اک منیار" اور آخری دور کی نظموں میں شاعر زندگی کے خطِ مستقیم سے نکلتے ہوئے ان گنت راستوں پر تو سر اپنے سفر کا آغاز کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔" رہا گلی" نے اس جیالے فن کار کو ارتقاء کے جس بیلے تک پہنچایا تھا وہاں اس مسافر کا سفر ختم بھی ہو سکتا تھا مگر فن کا تو وہ سیال ہے جو ہر لحظہ نئی نئی سرزمینوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ ٹھہراؤ تو اس کے لئے موت کی علامت ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ ہر چند فن کار کے اندر چھپا ہوا جوہر ہی ہمیشہ اُس کے فن کو صیقل کرتا ہے لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ بعض حادثات اُس کے احساس و وجدان اور دل و دماغ میں یوں قیامت برپا کر دیتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی سطح کا قرینہ ہی بدل جاتا ہے۔ احمد ظفر کو بھی ایک ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ یہ اُس کے والد کی موت تھی (جن کے نام اُس نے اپنی نظموں کا انتساب کیا ہے) اس حادثۂ عظیم کو احمد ظفر کی تیسری شکست کہا جا سکتا ہے مگر میں تو اسے بھی اُس کی شکست ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ تو اس کاری وار کو بھی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ سہہ گیا۔ مگر اب کے یہ وار اس نے دل و دماغ سے زیادہ اپنی روح کی ڈھال پر روکا تھا۔ مجھے تو اس دور کی تمام شاعری احمد ظفر کی روح کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے فن کار پر تو جو گزرنا تھی گزر گئی مگر اس سے احمد ظفر کے فن کو ایک اور سطح، ایک اور جہت مل گئی۔ یہ انکشافِ ذات کا مرحلہ تھا جسے شاعر نے دل و دماغ کی رفاقت میں روح کے وسیلے سے دریافت کرنے کی بھرپور کوشش بھی کی ہے اور پھر اپنی ذات ہی کے واسطے سے حیات و کائنات اور اس کے بوقلموں مظاہر اور اسرار کا سراغ لگانے کا بیڑا بھی اُٹھایا ہے:

جنڈری نمی وانٹ   بلدے بجھدے دیوے وی اک لاٹ

رڑھدیاں بیڑیاں، ڈبدے گھاٹ

روح کے بیلے میں احمد ظفر کا یہ سفر اتنا کٹھن اور صبر آزما ہے کہ اس سے اُس کی روح کی توانائی اور استقامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر فن کے ساتھ اُس کی لگن خلوص پر مبنی نہ ہوتی تو وہ کب کا مخفی حقیقتوں کی تلاش میں ازل اور ابد کی حدود سے اُدھر اتنا دور نکل جاتا کہ خود اُس کا سراغ لگانا نا ممکن ہو جاتا مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ شاعر نے ابتدا ہی سے ارضیت کے ساتھ اپنا رشتہ محکم کر لیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ روح کے ساتھ پرواز کرنے کے باوجود اُس کے پاؤں زمین سے پیوست رہتے ہیں اور وہ اپنے گرد و پیش کو فراموش نہیں کرتا بلکہ وہ ان دیکھی دنیاؤں سے داخلی بصیرت کے ایسے ایسے صدف چن کر لاتا ہے جن کی روشنی سے سارے پاپ کٹ جاتے ہیں اور ہماری روحیں دھل کر آئینے کی طرح چمک اُٹھتی ہیں۔ اپنی نظموں "زندگی"، "کھوج"، "دل دیاں گلاں"، "موتاں" "دیلاں"، "ہونی"، "لہراں"، "پرچھاواں" اور "للاری" میں اُس نے زندگی کے خطِ مستقیم سے ملتے اور جدا ہوتے ہوئے پیچ در پیچ راستوں پر سفر کیا ہے اور حیات و ممات کے ازلی و ابدی مسائل کو موضوعِ فن بنایا ہے۔ جب وہ روح کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب جاتا ہے تو اُسے یہ زندگی عارضی اور مستعار نظر آتی ہے جس کی بنیاد ہی ایسے پر ہے۔ اس دنیا سے جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ انسان وقت کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلاتا رہ جاتا ہے مگر بھاگتی ہوئی تیز رفتار زندگی اپنی تمام تر خوشیوں اور غموں سمیت اُس کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ جاتی ہے۔ آخر کار زندگی کا دھارا موت کے دھارے سے مل جاتا ہے شاعر کے نزدیک اپنے لغوی معنوں میں نہ موت موت ہے اور نہ زندگی زندگی۔ یہ سلسلۂ روز و شب، حیات و ممات اور فنا و بقا کا یہ دائرہ تو ایک ہی تسلسل کا نام ہے جسے دنیا والے اپنے خود ساختہ وقت کے پیمانے سے ماپنے کی سعی لاحاصل میں مگن رہتے ہیں۔ احمد ظفر تو اس تسلسل کو روح کی میزان پر تولنے کا قائل نظر آتا ہے:

گھڑے دی چھوٹی موردی ہونی

موریاں ساری گلاں

پانی دے اک چڑھتے دے وچ

دس سو سو چھلاں

مڑ وے کدی نہ مڑ کے تکسئے
کی پانی کی لوکی
بھلکے پتھر بن جائے گی
اج دی گل اجوکی

(سموڑتاں)

جے میں نکے جیہے اک پل نوں
سینے دے وچ رکھ لیناں واں
تے اوہ پل دی
اک پل میرا بن نہیں سکدا
ویہندیاں ویہندیاں اوہ اک پکھیرو بن جاندا اے
پھُر دینی کے اڈ جاندا اے
تے میں کلّے رکھ دے وانگوں
کھلا کھلوتا رہ جاناں واں

(ہونی)

جب فن کار ابدی صداقت، عظیم تر زندگی یا خدا کی کھوج میں نکلتا ہے تو اُسے پالینے کے لئے بیروں بینی کے مقابلے میں دروں بینی پر زور دیتا ہے:

جے توں وسدا
کدرے نہ لوکی
مندر جا کے بیس نواندے
کدرے سیتاں دل نہ جاندے
ویکھن والیاں اکھاں تینوں بھولبھو تکیاں
انھے تینوں بن اکھاں دے بھولینے نیں

(کھوج)

سزا وجزا اور جبرو اختیار کے ضمن میں وہ گناہ و ثواب اور اسباب و علل کے مروجہ تصورات سے انحراف کرتا ہے۔ وہ پُن کے باغ باغیچے چھوڑ کر پاپ کے تھل خونِ دل سے سیراب کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کسی ایسی معصوم اور پاکیزہ روح کی جستجو میں ہے۔ جس کا خلوص اُس کی عاقبت سنوار دے۔ یہ آرزو دراصل اُس کی روح میں چھپی ہوئی اُس نیکی کی صدائے بازگشت ہے جو اُسے ہمہ وقت بے قرار رکھتی ہے:

دل پاپی اے انگیاراں وچ ٹھنڈا جل کیوں لبھے
جاندیاں بجھدیاں اٹھدیاں بیٹھدیاں اگوں کیوں لبھے
پُن دے باغ بغیچے چھڈ کے پاپ دے تھل کیوں لبھے

(دل دیاں گلاں)

میں پاپی آں میری جھولی پُن کسے واپا
پیار دی راہ وچ پتھر ہو یا کا ہنوں اکھاں لا
نمی وا دیئے جاندیئے بھرے میرے دل دی آ

(لہراں)

"للاری" "پتن" اور "دریا" میں شاعر کا یہی ایمائی انداز نظر طبع علامتوں کے ساتھ اُبھرتا ہے۔"للاری" میں شاعر وقت، انسان اور زندگی کے ارتباط کو پیش کرتا ہے۔ جس کے خمیر میں انسانی ارتقا کے ایسے اور طربیہ عناصر یوں گھل مل گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا انہونی کو ہونی بنانے کے مترادف ہے اور اگر کوئی وقت کے بڑھتے ہوئے ریلے کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود بھی اس دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جاتا ہے انسان کے اختیار میں یہی ہے کہ وہ یا تو آرزو کی تال پر مسلسل رقصاں و خنداں رہے یا اس بازیچۂ اطفال اس حیرت خانۂ دنیا کو دیکھتے دیکھتے خود بھی مجسمۂ حیرت بن جائے۔ انتخاب اُس کے اپنے ہاتھ میں سہی لیکن وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا:

جگ بیلا اے
بیلے دے وچ
سدھر وٹجلی دی اک تان لے جنجھے
ساہواں دے وچ دیوے بالے
راہوں دے ونگ اج وی وسدے
ہیرتے رانجھے

ایہہ ویلا اے
جیہڑا اک للاری بن کے
جن دے جانن ورگی دل دی چُنی
سوہنیاں کوجھیاں رنگاں دے وچ رنگ جاندا اے
ویکھن والے پتھر وانگوں دہندے دہندے
تکھن والا چھلاں وانگوں لنگھ جاندا اے

(للاری)

مزے کی بات یہ ہے کہ وقت کی اس تیزی تندی کے باوجود شاعر کی انفرادیت اور اس کی انا اس کے مقابل چٹان بن کر ایستادہ ہے۔ رسوم و قیود اس کے لئے ہزار طوفان اٹھائیں، وہ زندگی اور وقت کے کہنہ اور پٹے ہوئے راستوں پر چلنے کے لئے تیار نہیں۔ خدا کا وجود برحق ہی سہی مگر شاعر کے نزدیک اپنی ذات کی تشخیص اپنی انا اور خودی کی پاسداری بھی تو اس کا بنیادی حق ہے۔ پھر وہ اپنے آپ کو کیوں دریافت نہ کرے۔ خدا کو پانے کے لئے بھی تو پہلے اپنی تلاش ضروری ہے۔ وقت ایک پُرشور دریا سہی مگر عشق اپنی ذات سے عشق اور انکشاف ذات کے ذریعے اسرار کائنات کی آگہی سے عشق بھی تو ایک سیل بے پناہ سے کم نہیں جو زمانے کی تند و تیز سیر رد کر آگے بڑھ کر تھام لیتا ہے:

میں تے جگ دے پچھے ٹرنہیں سکدا
نکے جیہے پرچھاویں لئی میں
بھاویں تھاں تھاں ٹھیڈے کھاواں

میرے لئی توں جگ ایں
فیر وی جگ دی لگن مناں
جگ دی اس کے لگن آپنے آپ نوں بھاں

توں اک روپ ایں
بھاویں مینوں تھاں تھاں دسیں
میں تے اج دی بھو رہیاں واں
آپنا نکا جیہا پرچھاواں

(دریا)

ان نظموں میں شاعر روح کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر جب اُبھرتا ہے تو ہر دفعہ کوئی نیا بھید، کوئی نیا صدف لا کر ہماری جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ اسرار و رموز کی بھول بھلیاں کے کھوج میں از خود رفتہ رہنے کے باوجود اُس کا رشتہ زندگی کی حقیقتوں سے کسی نہ کسی صورت میں ضرور قائم رہتا ہے۔ اس سلسلے میں "پتن" اُس کی نمائندہ نظم ہے جس میں شعور، دل اور روح کی حدود اس طرح آ ملی ہیں اور ماضی، حال اور مستقبل اس طرح مربوط ہو گئے ہیں کہ اس سے انسانی زندگی کی ایک بصیرت افروز مگر جانگداز تثلیث مرتب ہو گئی ہے۔ یہاں روح کے بیلے میں رومان اور محبت کی یادیں ایسے ایسے طوفان اُٹھاتی ہیں کہ ان کی لہروں سے روح کی ساری آلائشیں دھل جاتی ہیں اور فن کار کے ساتھ قاری یا سامع کی روح بھی ایک پرندے کی طرح زمان و مکان کی بیکراں فضاؤں میں اوپر ہی اوپر اُڑتی چلی جاتی ہے مگر زندگی کی سنگین حقیقتوں کی زد میں آ کر روح کا پاکیزہ اور انمول پرندہ بھی اپنی الوہیت اور پُراسراریت کھو بیٹھتا ہے اور ایک کھلی حقیقت بن کر اس طرح سامنے آ جاتا ہے جس طرح فن کار کا رومان پرور آدرش وقت کی بھٹی میں جھلس کر زندگی کی تہ در تہ حقیقتوں کے چراغ روشن کر جاتا ہے:

—— ایہہ یاداں نے
جیہڑاں وقت دے بڑھے گھنے تے ڈونگھے بیلے دے وچ دگدے پانی دے سینے تے
نیاں نیاں اُبھر چھلاں بن کے کنڈیاں دا منہ چم جاندیاں نیں
اج فیر شام دے گھنے ہنیرے دے وچ
بوہا مار کے ویہڑا بال کے
اپنی روح دے چھٹے دودھ بکھیر دتاں جد سدا دتا
اکھاں دے وچ کوئی نہ آیا
ایہہ کی سفنا دیکھ رہیا واں

میری رُوح کا چٹا دودھ پکھیرو
سینے وچوں مار اڈاری
روشن دان تے جا بیٹھا اے
توں اندر اک نکڑے لگی ہوئی
پلا پا کے چھم چھم اتھرو کیر رہی ایں
(پنتن)

احمد ظفر کی آواز شعور کی بلند آہنگی سے گزر کر دل کی خود کلامی اور نغمگی کا قرینہ سیکھتی ہے اور پھر رُوح کی آہستہ، نرم، سبک اور دھیمی آواز میں ڈھل جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں "بیلے بیلے" کا یہ سفر خارجیت سے داخلیت کی طرف ارتقا پذیر نظر آتا ہے۔ ہوتے ہوتے فکر و فن اُس کی رُوح اور شخصیت سے ہم آہنگ ہو کر اکائی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہی نظم گوئی کا منصب بھی ہے اور کمال بھی۔ احمد ظفر کی صدا میں ایقان و عمل کا جلال بھی ہے، محبت و شیفتگی کا جمال بھی ہے اور پیغمبرانہ سکون و طمانیت بھی ہے۔ یہ تینوں لہریں ایک ہی آواز کی مربوط لہریں ہیں جو ماضی و حال کے بیلے سے گزرتی ہوئی مستقبل کے بیلے کی طرف پرواز کناں ہیں۔ یہ آواز ایک ایسے شاعر کی گھائل فریاد ہے جو ہجوم میں بھی تنہا رہتا ہے، شبستان وصال میں بھی فراق کے خواب دیکھتا ہے، جو چھپے ہوئے خزانوں کی تلاش میں تن تنہا رُوح کے نہاں خانوں میں دور بہت دور نکل جاتا ہے۔ زندگی اُس کے لئے طویل اور جانگسل ریاضت کا نام ہے۔ وہ عمر بھر اپنے آدرش کی آگ میں جلتا رہا ہے۔ انتظار حبیب میں اُس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں مگر بند نہیں ہوئیں۔ جان لبوں تک آ گئی ہے مگر برابر یہ آواز ابھرتی رہی ہے۔

ڈریاں دی اس باری وچوں
کدی تے میرے بوہے آ جا
(اینجوآں کی برسات)

اُس نے ہمیشہ اپنی عزت نفس اور انفرادیت کی حفاظت کی ہے۔ عزتِ نفس کے ساتھ انفرادیت کا تحفظ سچ کا دوسرا نام ہے جس کے مقابلے میں زندگی، موت اور زمانے کے عمومی اور فرسودہ تصورات ہیچ ہیں۔ کارزارِ حیات میں زندگی اور موت کی بازی لگی رہتی ہے۔ عدم سے وجود اور وجود سے عدم میں منتقل ہونے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ موت خود مر جاتی ہے مگر سچ کبھی نہیں مرتا۔ وہ کسی شاعر، کسی مفکر اور کسی پیغمبر کی آواز میں تا ابد زندہ رہتا ہے اور احمد ظفر اسی آواز کا نقیب ہے۔

مَیں وی مُک جاواں گا
توں وی مُک جاویں گی
جھوٹ مُک جاوے گا
اگ بجھ جاوے گی
جگ مُکھ کھوے گا
سچ سچ رہوے گا
(اندر دی آواز)

حسین شاہد

شاہ حُسینؒ کی چند علامتیں

کچھ لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ادب میں علامت نگاری کوئی نئی چیز ہے جس کا آغاز حال ہی میں ہوا ہے۔ ان لوگوں کا خیال درست بھی ہے اور غلط بھی۔ درست یوں کہ علامت نگاری کے نام پر ایک طرح کی "بجھارت نگاری" ضرور زمانہ حال کی پیداوار ہے اور غلط اس لئے کہ ابلاغ و تفہیم کے معاملہ میں انسان نے سب سے پہلے جس ہتھیار سے کام لیا وہ علامت ہی کا ہتھیار تھا۔ اگر آج علامت نگاری کی حدیں "بجھارت نگاری" سے جا ملی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ تجربے کے نام پر اُلٹی سیدھی ہانکنے میں مصروف رہتے ہیں۔

علامتوں کی تاریخ کے سلسلے میں دو لوگ بات کرنا مقصود ہو تو اس کی صورت کچھ اس طرح ہو گی کہ انسان نے سب سے پہلے علامت کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنا لیا۔ پھر جیسے ہی اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا، وہ زبانیں ایجاد کرتا گیا۔ پھر زبانوں کے الفاظ میں اضافہ ہوا لیکن الفاظ کو بار بار استعمال کرنے سے ان کا شعلۂ معانی بجھ جاتا ہے اس مقام پر پہنچ کر الفاظ کسی جذباتی اور فکری تجربے کو اپنی روایتی جوئے معانی کی مدد سے دوسروں تک اسی شدت سے نہیں پہنچا سکتے جس شدت سے الفاظ کو استعمال کرنے والا پہنچانا چاہتا ہے اس لئے وہ الفاظ میں نت نئی بارود بھرتا رہتا ہے۔ علامت بھی لفظ کو پٹاخا بنانے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ جب الفاظ کے گولوں میں علامت کی بارود بھر دی جائے تو ان کے معانی کا دھماکا اتنا زوردار ہوتا ہے کہ جس فرد کے حواس خمسہ درست حالت میں ہوں اس کے جسمانی نظام میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ ایک تو علامتی لفظ تنہا بہت سے غیر علامتی الفاظ کا بدل ہوتا ہے۔ دوسرے اس میں معانی کا ایک "ڈرائنگ باکس" رکھا ہوتا ہے۔ آپ اس باکس کو کھولیں تو کئی رنگ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان رنگوں کو ہم نے پہلے سے اتنی دفعہ دیکھا بھالا ہوتا ہے کہ ہم ڈبہ کھولے بغیر بھی تمام نہیں تو کچھ رنگوں کی نشان دہی ضرور کر سکتے ہیں۔ لیکن آج کل علامتی الفاظ میں یہ صفت بہت کم رکھی جاتی ہے۔ آج علامت نگاری اسی کا نام ہے کہ لفظ کے آس پاس کوئی معنوی جواز مہیا کئے بغیر لفظ "مرغی" استعمال کیا جائے اور اصرار یہی ہو کہ اس سے مراد عورت لی جائے کیونکہ لکھنے والے پر ایک لمحہ ایسا گزرا تھا جب اسے مرغی عورت کی علامت نظر آئی تھی۔

میں علامت کی ضرورت اور اس کے فنی حسن سے انکار نہیں کر رہا ہوں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ کوئی ایک شخص علامت کی ایجاد کا سہرا انفرادی طور پر اپنے سر نہیں باندھ سکتا۔ علامت اپنے تمام تر معنوی حوالے کے ساتھ معاشرے میں موجود ہوتی ہے۔ فن کار اسے گرفت میں لاتا اور ظاہر کرتا ہے۔ علامت اور فنکار کے درمیان وہی رشتہ ہوتا ہے جو لاشعور اور فرائڈ کے درمیان تھا۔ لاشعور پہلے سے موجود تھا لیکن ظاہر نہیں تھا، فرائڈ نے اسے ظاہر کیا۔ علامت معاشرے کی چھاتی پر تیرتی رہتی ہے۔ فن کار کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی لذت کو ہم تک منتقل کرے۔ وہ علامت کو اپنی جیب سے نکال کر "چاٹی" میں نہیں پھینکتا۔ علامت کے پہلے سے موجود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے معنوی رنگوں کی روایت سے واقف ہوتے ہیں چنانچہ علامت نگاری انفرادی فعل ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر جب تک علامت فہمی نہ ہو علامت نگاری بے معنی ہے۔ ایک معمولی سی مثال لیجئے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء والی جنگ سے پہلے لفظ "چونڈہ" محض ایک گاؤں کا

نام تھا۔ راوی بیدیاں تک ایک نہر سے زیادہ کچھ نہ تھی اور اسی طرح "اٹک" بھی دو پھیکے سے لفظ تھے اور کچھ نہیں تھے۔ آج بھی ان کی غیر علامتی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑا، چونڈہ بھی وہیں ہے، راوی بیدیاں تک بھی بدستور بہ رہی ہے اور "اٹک" کے لغوی معنی بھی نہیں بدلے لیکن جنگ کے بعد جب ان الفاظ کو بطور علامت استعمال کیا جائے گا تو یہی الفاظ گولوں کی طرح گونجیں گے، تلوار کی طرح کاٹیں گے اور تیروں کی سی خلش پیدا کریں گے مطلب یہ کہ ترکش میں روایت کے تیر نہ ہوں تو علامت للکار کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔

تھوڑا سا اور آگے چلیے۔ یہ تین علامتیں بڑی متاثر کرنے والی سہی لیکن صرف پاکستانیوں کے لیے ہیں۔ گویا علامت کا اپنا اپنا حلقۂ اثر بھی ہوتا ہے۔ کوئی علامت محض ضلعی سطح پر، کوئی کسی صوبے میں تو کوئی کسی ایک ملک میں پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح بعض علامتوں کا حلقۂ اثر پوری دنیا پر محیط ہوتا ہے لیکن اگر کوئی علامت "علامت کو ذاتی حدود" تک لے آئے یعنی وہ اسے اتنا تنگ کر دے کہ باقی رہ خود رہ جائے یا اس کی علامت۔ تو اس کی مثال اس بنیئے کی سی ہے جس نے اپنی عزیز ترین آرزو کا اظہار یوں کیا تھا کہ "اے اللہ! ایسا ہو جائے کہ تمام گاؤں بہترین کھانے پکائے۔ کھانے پک جائیں تو سارا گاؤں مر جائے سوائے میرے اور میری امی کے جب میں اور امی ان کھانوں کو اپنے گھر میں جمع کر لیں تو امی کو بھی موت آ جائے"!

لاریب کہ فن کار کسی تجربے سے یکہ و تنہا ہی گزرتا ہے لیکن جب وہ اپنے تجربے کو فن کے سانچے میں ڈھالتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے پیشِ نظر یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے تجربے میں شریک ہوں۔ یہی ابلاغ کا مسئلہ ہے جو اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ فن کار اور قاری کے درمیان علامات پر اشتراکِ فہم موجود ہو۔ اگر یہ اشتراک نہیں ہو گا تو سب بے معنی ہے

زبان کا معاملہ یوں ہے کہ پہلے پہل انسان مختلف قسم کی آوازوں سے انتقالِ مطلب کرتا تھا۔ یہ علامت کا دورِ عروج تھا۔ جب لکھنے کے لئے تصاویر اور بولنے کے لئے آوازیں بطور علامت استعمال ہوتی تھیں۔ پھر الفاظ نے جنم لیا۔ ہر لفظ کے پیچھے ایک روایت ہوتی تھی اور وہ لفظ اس روایت کی علامت ہوتا تھا۔ یہ علامت گھس گھس کر خود روایت بن گئی۔ اور ایسی کئی روایتیں ایک نئی لفظی علامت کے پیچھے چھپ جاتی ہیں۔ گویا علامت اور روایت آگے پیچھے چلتی ہیں اور آئندہ بھی چلتی رہیں گی۔

تمہید طویل ضرور ہو رہی ہے لیکن ایک اور مثال بہت ضروری ہے۔ جب ہم لفظ نظم بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو معنوی رنگ ابھرتے ہیں۔ ایک رنگ نظم کے اپنے لغوی مفہوم کا اور دوسرا تقابلی مفہوم کا رنگ یعنی نظم وہ ہوتی ہے جو نثر نہ ہو۔ تیسرا غیر متعلق قسم کا کوئی رنگ نہیں ابھرتا۔ مثلاً یہ خیال نہیں آتا کہ نظم وہ ہوتی ہے جو کرسی نہ ہو حالانکہ یہ بات درست بھی ہے۔ لیکن اسی لفظِ نظم کو اس کائنات کے لئے علامت کے طور پر استعمال کریں تو رنگوں کا کوئی شمار ہی نہیں رہتا۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے لفظ کو جھٹکا دے دیا ہے اور چاروں طرف سے اس کے معانی کی جڑیں ابھرتی آ رہی ہیں۔ یہ ایک ہی لفظ کے علامتی اور غیر علامتی استعمال کا فرق ہے۔

شاہ حسینؒ کی علامتوں کا ذکر اس تمہید کے بغیر بھی ہو سکتا تھا لیکن آپ کا تھوڑا سا وقت ضائع کر کے میں نے دوسری طرف بہت سا سفر طے کر لیا ہے۔ اب تک میں علامتوں کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کر چکا ہوں اب اس کی روشنی میں شاہ حسینؒ کی علامتوں کا ذکر کرنا میرے لئے آسان ہو گا اور اسے میرے نقطۂ نظر کے مطابق سمجھنا آپ کے لئے آسان ہو گا۔ جو کچھ میں نے اب تک عرض کیا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق نہیں ہیں تو ممکن ہے آپ کا اور میرا ساتھ یہیں چھوٹ جائے۔

شاہ حسینؒ کے زمانے تک دنیا خوگرِ پیکرِ محسوس تھی۔ اس وقت تک تجریدی علامتوں کے بارے میں سوچنا شروع نہیں ہو سکا تھا۔ تب تک علامتیں صرف تشبیہ، استعارے کے روایتی انداز میں ہی آیا کرتی تھیں۔ اس وقت تک لوگوں کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ "دستِ صبا" کو سینے سے لگا سکتے یا

گردنِ حساب میں باہیں ڈال سکتے۔ تب تک مشاہدۂ حق کی تجریدی کیفیت کا ذکر بھی "بادہ و ساغر" کی ٹھوس علامت کے سہارے ہی کیا جاتا تھا۔ اس وقت شعلوں کو پی جانے اور ریاضی کی کرسی پر بیٹھنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں علامتی اظہارِ خیال آج کی نسبت بہت مشکل تھا لیکن شاہ حسین کی علامتیں دیکھ کر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بہت آسان تھا۔ یہ وہی کیفیت ہے جسے سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے۔

شاہ حسین کا کمال یہ ہے کہ اس کی علامتوں کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اتنی گہری کہ چار سو سال گزر جانے کے باوجود یہ جڑیں اب ذرا سی ڈھیلی تو شاید ہو گئی ہوں مگر زمین سے باہر اب بھی نہیں۔ آئیں حسین کے علامتی اظہار کی سب سے گہری اور پہلی سطح یہ ہے کہ وہ ذکر عورت کا کرتا ہے اور اس سے مراد مرد یعنی عاشق یعنی اپنی ذات لیتا ہے۔ شاہ حسین اس علامت کا بانی نہیں تھا جیسے کوئی بھی کسی علامت کا بانی نہیں ہوا کرتا! لیکن شاہ حسین نے اس علامت کی بانہہ پکڑی تو اسے اتنے حسن سے نبھایا کہ علامت امر ہو گئی۔ میں یہاں آپ کو پھر یاد دلاؤں گا کہ عورت اور مرغی میں تو پھر بھی کوئی نہ کوئی قدرِ مشترک موجود ہے لیکن مرد اور عورت تو جنس مخالف سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے باوجود عورت مرد کی علامت بن گئی اس لئے کہ حسین نے صرف چسکا لینے کے لئے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس علامتی جواز کے پیچھے روایت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ مولانا حالی نے فارسی اور اردو شاعری میں مرد کا مخاطب امرد کو بنانے کا جواز یہ بتایا تھا کہ مشرقی معاشرے میں عورت کا نام لینا تو درکنار محض ضمنی طور پر اس کا ذکر کرنا بھی اس کی شرم و حیا پر ڈاکہ ڈالنے کے برابر ہوتا ہے اگر اس خیال کی روشنی میں دیکھا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ پنجاب تو بڑے بے شرم لوگ ہیں کہ ان کی شاعری میں عورتیں گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے عشق کا اظہار کرتی ہوئی ملتی ہیں لیکن حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں۔ پنجاب کی عورت تو شرم و حیا کا پیکر ہوتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ روایت کے یہ دونوں رنگ کہ عورت مرد کی ضد ہوتی ہے اور پنجاب کی عورت درجۂ کمال تک حیادار ہوتی ہے ایک تیسری روایت کے رنگ کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں کیونکہ فن کے میدان میں اگر وہ رنگ زیادہ شوخ ہو جاتا ہے اور وہ رنگ ہے مشرقی عاشق کے تصور کا۔ مشرقی عاشق اپنے محبوب کا ایک بے بس غلام کہلوانا چاہتا تھا اور اس معیار پر شاہ حسین کے زمانے کی عورت جس طرح پوری اُترتی تھی، دنیا کی اور کوئی جاندار مخلوق نہیں اُترتی تھی، بلکہ وارث شاہ نے تو اس میں مزید تابعداری کا رنگ بھرنے کے لئے "چوہڑیڑی نامہ" لکھا اور بار بار اپنے آپ کو "صاحب تُسِے دربار دی چوہڑیڑیاں" کہہ کر اظہارِ غلامی کیا۔ عورت کو عاشق کی علامت بنانے میں عورت کی جن صفات کا دخل تھا ظاہر ہے آپ ان سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کا ذکر بیکار رہوگا۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ حسین کی اس علامت کو بعد میں آنے والے شعراء صدیوں تک استعمال کرتے رہے لیکن جب تک عورت کا معاشرتی تصور نہیں بدلا۔ یہ علامت اپنی تازگی اور نیا پن اسی طرح سے برقرار رکھے رہی جیسے حسین کے وقت میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسین نے یہ علامت جیب سے نکال کر کلام میں نہیں پھینک دی تھی، علامت نے خود اپنے زورِ روایت کے بل پر حسین کو مخاطب کر کے کہا کہ مجھے استعمال کرو اور ابدی زندگی پا جاؤ۔ اچھی علامت کی یہی علامت ہوتی ہے کہ وہ بقول حسین پھوہڑ ناری کی طرح "داج وہونی" نہیں ہوتی۔ اس کے جہیز میں روایت موجود ہوتی ہے۔ اسے جہیز دینے والے میکے پر ناز ہوتا ہے اور وہ شعر کی سسرال میں آ کر گردن بلند کر کے رہتی ہے۔ آپ اسی علامت کو دیکھ لیجئے عورت کی وفا، خاکساری، شرم، حیا، تابعداری، صبر، توکل، قناعت، خلوص، نباہ، ایثار، پیار، بیبی، استقلال، یہ سب چیزیں اس علامت کے جہیز میں آتی ہیں تو سسرال والوں کی مجال کیسے ہو کہ اسے سر آنکھوں پر نہ بٹھائیں۔

حسین نے جگہ جگہ عورت کو عاشق کی علامت بنانے کا جواز خود ہی پیش کر دیا ہے۔ کہیں تو ایک آدھ مصرعہ کی صورت میں اور کہیں پوری کی پوری کافی کے طور پر۔ مشرقی عورت میں یہ صفات ضمنی طور پر پائی جاتی تھیں اور انہیں صفات کی بدولت وہ عاشقِ زار کی علامت بن گئی۔ مثلاً:

سادھاں دی میں گولی ہو ساں گولیاں والے کم کریساں

یا

جس ساجن دا دُوتسی بھنا تسیں ساجن دی میں گولی آں نی

جیموں بھاوے تیویں راکھ پیا ریا میں تیرے در آن پڑی !

اس قسم کے مصرعے ہمیں ہر کہیں نظر آتے ہیں اور اس رنگ میں لکھی ہوئی کافیاں بھی بہت ہیں۔ مثلاً یہ کافی:

رہیئے وو نال سجن دے رہیئے وو

لکھ لکھ بدیاں سو سو طعنے۔ بھو سرتے سہیئے وو

نال سجن دے رہیئے وو

تڑے سر دینجے دھڑ تاروں تاں بھی حال نہ کہیئے وو

رہیئے وو

سخن جنہاں دا ہووے دارد حال انہاں میں کہیئے وو

رہیئے وو

چندن رکھ لگا وچ ویہڑے زور دھگانے کہیئے وو

رہیئے وو

کہے حسین فقیر سائیں دا جیوندیاں مر رہیئے وو

رہیئے وو

اس کے بعد ایک اور علامت کی طرف آیئے۔ جس طرح برگد کی داڑھیاں بڑھتے بڑھتے بذاتِ خود ایک الگ درخت بن جاتی ہیں، اسی طرح ایک گہری علامت سے کئی ضمنی لیکن اپنی جگہ پر مکمل علامتیں نکل آتی ہیں۔ عورت کو عاشق کی علامت بنانے سے جو دو ضمنی علامتیں وجود میں آئیں ان میں سے ایک چرخہ ہے اور دوسری میکے اور سسرال کی علامت۔ چرخے کی علامت تو ضمنی ہونے کے باوجود اپنا انفرادی اور مکمل وجود رکھتی ہے بلکہ یہ علامت بعد میں ایک شعری صنف کا درجہ اختیار کر گئی اور حسین کے بعد ہر کوئی کہنے لگا ع

کت چرخہ شام منا دیں گی ایس کھیڈن نوں پچھتا دیں گی

چرخے کی علامت کے کئی معنوی رنگ ہیں لیکن دو رنگ زیادہ شوخ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو چرخہ انسانی جسم کی علامت بنتا ہے۔ چرخے کا ہر پرزہ کسی نہ کسی انسانی جسم کے عضو سے مطابقت رکھتا ہے اور چرخے کا ایک اکائی کی صورت میں چلنا دوسرا علامتی رنگ ہے جو انسانی اعمال کی تشانی ہے۔ اسی سے "داج" بنا کر سسرال جانے کی تیاری کا تصور جنم لیتا ہے۔ اسی انداز سے شاعر نے جیسے جیسے سوچا چرخے کی علامت ایک انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کی پوری زندگی سے منطبق ہوتی گئی۔ حسین سے پہلے چرخے کی علامت ممکن ہے لوک سطح پر کہیں دریافت ہو چکی ہو لیکن کسی قابلِ ذکر شاعر کے ہاں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ممکن ہے اس علامت کو ذریعۂ اظہار بنانے میں حسین کے پیشے کا تعلق بھی ہو، اس کے باوجود علامتی میدان میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ اسی چرخے کی علامت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی تمام کافیوں میں یہ علامت فکرِ حسینی کے محور کی طرح نظر آتی ہے۔ اس نے چرخے کی "ہتھی" پر اپنا تمام فلسفہ گھما دیا ہے۔ حسین کے تصوف کی پوری عمارت چرخے کے "منوں" پر کھڑی نظر آتی ہے۔ اس نے چرخے کی "بائڑ" میں تمام راگ سمو دیئے ہیں۔ چرخے کی ذات پر آج کے زمانے میں تو مشینی تکلا اور پاور لوم عجیب اندازِ تمسخر میں ہنس رہے ہیں لیکن حسین نے چرخے کو جو علامتی طاقت بخش دی ہے، وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ چرخہ مشینی تکلے اور پاور لوم سے کسی صورت ہار نہیں مان سکتا۔ کم از کم شعری میدان تو ہمیشہ چرخے کے ہاتھ میں رہے گا۔ چرخہ بنانے والے کے پیشِ نظر تو

یہی مقصد تھا کہ اس سے موٹا موٹا سوت کات کر ایسا کھدر تیار کیا جا سکے جو مفلوک الحال لوگوں کا تن ڈھانپ سکے۔ اور آج کی دنیا میں یہ مقصد بھی ختم ہو گیا ہے۔ نہ صرف مقصد ختم ہو گیا ہے بلکہ چرخہ خود بھی ہماری زندگی سے نکل گیا ہے لیکن چرخہ بنانے والے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ کوئی خدا کا بندہ اسے علامتی سطح پر اس طرح عمر طویل بخش دے گا کہ چرخے کا ذاتی وجود ختم ہو جانے کے باوجود وہ اپنے علامتی وجود کے سہارے زندہ رہ سکے گا۔

عورت کی رعایت سے جب چرخے کے بعد دوسری سطح پر پیکے اور سسرال کی علامت سامنے آئی تو یہاں بھی ماں، باپ، بہن بھائی، ساس نند، سسر و دیگر رشتہ داروں کا الگ الگ علامتی وجود بنتا چلا گیا۔ ان کے علامتی مفہوم کو سمجھنے کے لئے بھی اندھی ٹکریں نہیں مارنی پڑتیں۔ ان رشتہ داروں کا روایتی کردار خود بخود اپنے علامتی مفہوم کو واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ تو خالصتاً "ماڈرن" دنیا کا ہے کہ کسی محفل میں علامتی نظم کے نام سے کوئی چیز پیش ہوتی ہے تو ساری محفل سہم جاتی ہے۔ ہر کوئی یہی سوچتا ہے کہ نظم پیش کرنے والا اچھا بھلا انسان ہے۔ وہ کوئی بے معنی بات تو کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا نظم کا مطلب ڈھونڈنا سب کا فرض ٹھہرا۔ جب کچھ پتے نہیں پڑتا تو سب کو اپنی کم فہمی اور کوتاہ اندیشی کا احساس ہوتا ہے۔ آخر کار شاعر کا کوئی قریبی دوست جسے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو کب یہ کائنات گھومتی ہوئی نظر آتی ہے اور اسے ایک کے دو دو دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ان "بھارتی" کارناموں کو شعری تجربہ ثابت کرنے کی کوشش کا آغاز کرتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی کوئی نہ کوئی مطلب اس معمے کا ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ لیکن مطلب ڈھونڈنا کون سی مشکل بات ہے؟ کچھ نہ کچھ مطلب تو ہر چیز سے نچوڑا جا سکتا ہے۔ اسے نفسیات میں "ٹیک جینیت" کہتے ہیں۔ شاید آپ حیران ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ان پڑھ اور جاہل دیہاتیوں نے تمام جانوروں کی بولیوں سے کوئی نہ کوئی مطلب منسوب کر رکھا ہے یہاں تک کہ گدھا بھی اس سے نہیں بچ سکا۔ اس تلاش مطلب کی بنیاد جانوروں کے لہجے پر ہوتی ہے۔

شاہ حسین کے پورے کلام میں ہمیں ایک علامتی نظام نظر آتا ہے۔ اس آئین کی موٹی موٹی دفعات یہ ہیں کہ عورت عاشق کی علامت ہے۔ اس کا شغل یعنی چرخہ کاتنا اس کے اعمال کی دھری ہے۔ عورت کے پیکے اس دنیا کے لئے اور سسرال آخرت کے لئے علامتی وجود رکھتے ہیں۔ جب ان دفعات کو شاہ حسین کے معاشرتی پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو ایک ایسا جال سا بن جاتا ہے جسے پھینک کر آپ مطالب حسین کی ہر "مچھلی" پکڑ سکتے ہیں، لیکن کہیں کہیں کچھ علامتیں ایسی بھی ہیں جو اس جال میں نہیں پھنستیں، وہ ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے جال میں سے باہر رہ جاتی ہیں لیکن آخر یہ "مچھلیاں" بھی حسینی معاشرے کے "تالاب" سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب میں ایسی ہی چند ایک علامتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ان علامتوں کے کئی ایک رنگ ہیں لیکن جو رنگ مجھے زیادہ بھائے ہیں، میں انہی کا ذکر کروں گا مجھے یہ اصرار نہیں کہ ان میں ایک ہی اور وہی رنگ موجود ہے جو مجھے نظر آیا ہے۔ میرے سامنے کافیوں کا وہ نسخہ ہے جو چوہدری افضل خاں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اس لئے کافی کے نمبر کا شمار اسی نسخے کے اعتبار سے کیا جائے گا۔

کافی نمبر ۲ میں حسین کہتا ہے:۔ راتیں بھی کالی تے میں بھی کالی چھڑیا لوڑن بیلے

اس کا ترجمہ چوہدری صاحب نے یوں کیا ہے "میری جوانی کی راتیں بھی کالی ہیں، میری خواہشات بھی کالی ہیں۔ وہ تنہائی میں عیش و عشرت چاہتی ہیں۔" گویا بھینیں نفسانی خواہشات کی علامت ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ تصوف کی رو سے نفسانی خواہشات برائی کا مفہوم لئے ہوتی ہیں لیکن میرے خیال میں اس وضاحت سے اس کافی کے پہلے حصے اور اس مصرع میں تضاد آ جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ ترجمہ کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے علامت کی بجائے خود شاہ حسین کو مدنظر رکھا ہو۔ اس کافی میں ہیر اور رانجھے کی علامت سے بات شروع ہوتی ہے۔ مذکورہ مصرع تک اتنی بات ہو چکی ہے کہ لمحہ لمحہ رانجھے کی خواہش کرنے کے باوجود والدین نے زبردستی ہیر کو کھیڑوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ اب وہ کھیڑوں کی قید میں ہے اور کہہ رہی ہے ؎

راتیں بھی کالی تے میں بھی کالی چریا لوڑن بیلے

ہیر کی سابقہ زندگی یہ تھی کہ چراگاہ میں بھینسوں کو چرانے کے بہانے رانجھا اور رانجھے کا کھانا لے جانے کے بہانے ہیر چراگاہ میں جاتی۔ اور اس طرح ان کا ملاپ ہوتا۔ آج ہیر کے لئے جدائی کا زمانہ ہے اس لئے بھینسیں اور چراگاہ (بیلا) ہیر کے نزدیک رانجھے کی ملاقات یعنی وصل کی علامت ہیں۔ فراق کی شب ہائے سیاہ سے ہیر کا ذہن سیاہ رنگ کی بھینسوں کی طرف جاتا ہے جو اگر بیلے میں چرتی ہوں تو پیارے وصال کا سبب بن سکتی ہیں۔ یوں تو بھینسیں کھیڑوں کے گھر میں بھی یقیناً موجود ہوں گی لیکن جب تک وہ بیلے میں چرنے نہ جائیں وصل کی علامت نہیں بن سکتیں۔ اس لئے ہیر کے من میں امنگ پیدا ہوتی ہے کہ کالی بھینسیں بیلے میں چرنے جائیں کیوں؛ اگلے مصرع میں اس کا فیصلہ کر دیا گیا ہے:

کہے حسین فقیر نمانا وچھڑیاں رب میلے

رب بچھڑے ہوؤں کو کیسے ملائے؟ بھینسیں ہوں اور بیلا ہو لہٰذا بھینسیں نفسانی خواہشات کی علامت نہیں بلکہ ہیر رانجھے کے وصل کی علامت ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تصوف میں ہیر رانجھے کا وصال نفسانی خواہشات کی حیوانی سطح پر تسکین کی علامت نہیں ہے، یہ جزو کے کل میں مل جانے کی علامت ہے۔

کافی نمبر ۸۳ کا ایک مصرع ہے :۔ نال صرافاں جھیڑا تیرا لیکھا دیندی توں رو دیں کیوں

میرے خیال میں یہ مصرع قرآن مجید کی اس آیت کی براہ راست تفسیر ہے۔ "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" جو کچھ کسی نے (اچھا) ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ بھی دیکھی جائے گی اور جو کچھ کسی نے (برا) ذرہ بھر بدی کی ہو گی وہ بھی دیکھی جائے گی۔ خدا کا قانون مکافاتِ عمل یہ کہتا ہے کہ اعمال کا حساب کرتے ہوئے کسی کا کوئی عملِ خیر یا عملِ شر نظر انداز نہیں کیا جائے گا چاہے وہ عمل بظاہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ جس کافی سے یہ مصرع لیا گیا ہے اس میں داج (جہیز) کے بارے میں بات چیت ہو رہی ہے جو اعمال کی علامت ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ تو کہیں سے خریدی جا سکتی ہے نہ مانگے سے ملتی ہے اور نہ ادھار۔ اسے تو خود کات کر بنانا ہوتا ہے۔ جو لڑکی داج کے بغیر سسرال آ گئی ہے اس کے بارے میں حسین کہتا ہے کہ تم نے فرض تو کوئی ادا نہیں کیا لیکن حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے بے چین ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اعمال کا حساب سبزی فروش کی ترازو پر نہیں ہوا کرتا جہاں تھوڑی بہت کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تجھے صراف سے معاملہ درپیش ہے۔ گویا صراف قانون مکافاتِ عمل کی علامت ہے۔ اس علامت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہاں کسی بھی دکاندار کا ذکر کیا جا سکتا تھا لیکن صراف کے ذریعے بات تو اس لئے کی گئی ہے کہ زیور جہیز کا ایک لازمی حصہ ہوتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ جو عدل صراف کی ترازو میں ممکن ہے وہ کسی اور ترازو سے حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ لڑکی "داج" کے معاملے میں باقی دکانداروں کو تو ممکن ہے جھانسا دے آئی ہو لیکن صراف کے پاس آ کر اٹکنے لگ گئی ہے۔ صراف کی علامت کو دنیا کے لئے قیاس کر لیں یا آخرت کے لئے، بات ایک ہی ہے۔ خدا کا قانون مکافاتِ عمل یہاں بھی جاری و ساری ہے اور وہاں بھی اور اس قانون کو پیکرِ محسوس میں اتارنے کے لئے پنجاب کی روایت میں صراف سے بہتر شاید ہی کوئی علامت ہو۔

ایک اور علامت کافی نمبر ۷۵ کے اس مصرع میں ملتی ہے:

سارے ورہے وچ چھلی اک کتی کاگ مریندا اچھتی

یہاں جناب افضل خاں نے کاگ کو نفس کی علامت کہا ہے۔ اگر اس مصرع کو کافی سے الگ کر کے پڑھیں تو یہ مطلب قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے لیکن کافی کے سیاق و سباق کے مطابق یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ انسان کا نفس چاہے کتنا ہی منہ زور کیوں نہ ہو، اگر وہ چاہے تو بمشکل ہی سہی، نفس پر قابو ضرور پا سکتا ہے۔ مثلاً جنس کے جذبے ہی کو لے لیجئے۔ کہنے کو یہ جذبہ کتنا شدید اور بے قابو ہوتا ہے لیکن محض ایک سوچ اسے لگام ڈال دیتی ہے وہ ہوس پرست

انسان جو اس جذبے کی تسکین میں رکاوٹ بننے والوں کو قتل تک کر دیتے ہیں۔ اپنی ماؤں بہنوں کے درمیان کتنے آرام سے سوئے رہتے ہیں حالانکہ وہ بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ گویا مسئلہ یہ نہیں رہتا کہ جنسی جذبہ قابو میں آنے والا جذبہ ہے یا نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ دماغ سے کتنے علاقے کو ممنوعہ اور کتنے کو غیر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ یعنی عقلی اور فکری طاقت سب سے بڑی طاقت ہے جو نفس کے زخش تند و تیز کو بھی قابو میں رکھ سکتی ہے لیکن کوے کی جھپٹ پر تو دنیا کی کوئی طاقت قابو نہیں پا سکتی۔ میں کسی اور علاقے کے کوؤں کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتا لیکن پنجاب میں تو ہر ذی نفس کو تمام عمر کوے سے معاملہ رہتا ہے۔ بچپن میں وہ ہمارے ہاتھ سے روٹی چھینتا ہے۔ درخت کے نیچے سے گزریں تو تاک کر سر کے اوپر بیٹ کر دیتا ہے۔ کوا ہمارے ساتھ جس قدر زیادتیاں کرتا ہے ہم اتنے ترقی یافتہ ہونے کے باوجود ان کا کوئی تدارک نہیں کر سکے۔ ایک غلہ ہی کوے کا علاج ہوتا ہے لیکن اسے تو ابھی ہم تھامنے بھی نہیں پاتے کہ کوا نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہاں کوا نفس کی نہیں ان ابلیسی طاقتوں کی علامت ہے جن پر انسان آج تک قابو نہیں پا سکا۔ یہ وہ طاقتیں ہیں جو انسان کو صراطِ مستقیم پر چلنے کے عبرتناک انجام سے ڈراتی رہتی ہیں اور جنھیں ہم چاہنے کے باوجود ختم نہیں کر سکتے۔ اجتماعی طور پر دنیا ان کے ہاتھوں دوزخ بنی ہوئی ہے اور انفرادی طور پر شیکسپیئر کے نیک کرداروں کی طرح اکثر اوقات ان طاقتوں کے ہاتھوں ہماری زندگی صرف اس لئے المناک بن جاتی ہے کہ ہم نیک ہونا چاہتے ہیں۔ کوے کو نفس کی علامت سمجھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام ابلیسی اور شر پسند طاقتیں انسان کے اندر موجود ہیں اور وہ ان پر کسی صورت قابو نہیں پا سکتا۔ اگر کوئی اس نظریے کا حامل ہو تو وہ بڑی خوشی سے کوے کو نفس کی علامت سمجھ سکتا ہے۔ ایک عبرتناک اطلاع یہ بھی ہے کہ میراجی کی ایک نظم میں کوا عضوِ تولد کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ آخر کوئی کسی کے شوق کو کیسے پابند کر سکتا ہے۔

بات لمبی ہو گئی ہے۔ میرا مقصد شاہ حسین کے علامتی ذخیرے کا نمونہ پیش کرنا ہے، تمام علامتوں کا ذکر کرنا نہیں۔ ایسا کرنا ایک مضمون میں ممکن بھی نہیں۔ حسین کے کلام میں تو قدم قدم پر علامتوں سے ملاقات ہوتی ہے اور ہر علامت اپنی جگہ ایک مفصل مضمون کی متقاضی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے مصرعوں میں آنے والی علامتیں کیا آسانی سے یا مختصر طور پر واضح ہو سکتی ہیں۔

کافی نمبر ۲۵ ۔ ہاتھی عشق مہاوت رانجھا انکس دے دے موڑیے

کافی نمبر ۱۰ ۔ بھٹھیں جھیڑے پانی وہندا اج کل بھجے تیری گنڈھڑی

کافی نمبر ۹ ۔ اندر ریوڑن مرغیاں باہر لڑن مور.........

لیکن مضمون ختم کرنے سے پہلے میں ایک علامت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ علامت سالو[1] کی ہے۔ سالو کی علامت کافیوں میں اور بھی کئی جگہوں پر آتی ہے لیکن کافی نمبر ۹ پوری کی پوری سالو کی علامت کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ افضل خاں صاحب نے یہاں لکھا ہے: "سالو۔ دلہن کے سر کا کپڑا مراد جسم" معلوم نہیں جناب افضل خان یہاں پہنچ کر شرما گئے ہیں یا انھیں واقعی معلوم نہیں کہ بنیادی طور پر سالو سر کا نہیں دھڑ کے نیچے کا لباس ہے۔ یہ لال رنگ کا ایک تہبند ہوتا ہے جو دلہن کی سہاگ رات کو اس کا شب خوابی کا لباس ہوتا ہے۔ اس کے رنگ کو خاص طور پر سرخ رکھنے کی وجہ ظاہر ہے۔ آہستہ آہستہ سالو ایک ایسی نشانی بن گیا جو سہاگ رات کی واردات کو چھپا تو ضرور دیتا تھا لیکن اس کا وجود ہی اس کے راز کا انکشاف تھا۔ ممکن ہے اسی لئے اس کا رواج ختم ہو گیا ہو۔ جب اس کا رواج تھا تو شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے جب لڑکی کے سسرال والوں کو آنا ہوتا تو وہ اپنے ساتھ سالو اور چھیں (دوپٹہ) لے کر آتے تھے اور اس رسم پر بڑی سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ شادی کے روز جب لڑکی کو نہلایا جاتا تو علاوہ بھی کپڑا پہنایا جاتا تھا۔ لڑکیاں اپنے سہاگ کا سالو تمام عمر سنبھال کر رکھتی تھیں دوسری عورت کو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتی تھیں۔ جب وہ مائیں بن جاتیں اور ان کی لڑکیاں شادی کے قابل ہوتیں تو مایوں بٹھانے کے دن مائیں اپنا

---

[1] شمال مغربی پنجاب میں سالو سر کا لباس ہے جسے دولہا اوڑھتا ہے ــــ ادارہ

سہاگ کا سالو نکال کر بیٹیوں کے سر پہ اوڑھا دیتیں ۔ یہ بات ماں کی طرف سے بیٹی کو سہاگ قائم رہنے کی دعا دینے کی علامت ہوتی تھی لیکن بیٹی کی ملکیت وہی سالو ہوتا تھا جو اس کی سسرال کے ہاں سے آتا ۔ جب کوئی عورت مستقل طور پر سالو کو استعمال میں لے آتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب وہ دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہو کر سادہ زندگی بسر کرنے کا اعلان کر رہی ہے ۔ گویا سالو کو سر پر لینے والی بات چاہے عملاً غلط نہ ہو لیکن یہ لباس بنیادی طور پر سر کا نہیں ہے ۔

سالو کی اس علامت کو پیش نظر رکھیں تو اس کا علامتی مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ۔ سالو ہماری خواہشات دنیوی کی علامت ہے کا نشہ ، چمک دمک ، چاٹ ، ان پر قابو پانے کی کوشش میں پیش آنے والی تکلیف اور لذت ، ان کو اپنا معبود بنا لینے کی صورت میں ہونے والی بربادی ، ان کو جائز حد تک پورا کرنے کی ترنگ ، کسی کے لئے ان کو قربان کر دینے کا سرور ، ان کے ہاتھوں خود غرض ہو جانے کا خطرہ یہ سب اس علامت کے معنوی رنگ ہیں ۔ آپ ان رنگوں کو اور سالو کی اوپر بیان کی گئی روایت کو سامنے رکھ کر یہ کافی پڑھیں ؛

سالو سچ ہنڈھائے نی سالو سچ ہنڈھائے نی
سالو میرا قیمتی کوئی دیکھن آئیاں ترنجنیں گیاں سب سلاہے
سالو پایا ٹنگنے گوا ندھن آئی منگنے دتا کہیں نہ جائے
سالو ڈھر کشمیر دا کوئی آیا بزاں چیر دا جانا کوکے رلائے
سالو دھر گجرات دا کوئی میں بھو پہلی رات دا سُتی شوہ گل لائے
سالو دھر ملتان دا کوئی رب ملاں دیاں جاندا کتے ڈھنگ بنائے
سالو میرا آل دا کوئی محرم نہیں حال دا کس پہ آکھاں جائے
سالو بیچ جن جوڑیا کوئی تھیسی رب دا جوڑیا ہو رنہ کیتا جائے
سبھے سالو والیاں کوئی اک بر چھ دیاں ٹولیاں تیرے تل نہ گائے
سالو دا رنگ چاو ناکوئی پھیر نہ اس جگ آونا بچے گھم گھمائے
سالو میرا انیدا کوئی شام بندرا بن سنیدا جانا بچھڑے رلائے
کہے حسین گدا نما کوئی رات جنگل وچ آیا رب ڈاڈھا بے پروائے

(پنجابی سے)

اختر وقار عظیم

شبلی — بحیثیت شاعر مؤرّخ

شبلی کو اردو والوں نے بجا طور پر اردو کا مورخ اول کہا اور مانا ہے۔ بلا شبہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں با اصول تاریخ نویسی کی بنیاد رکھی، کچھ قاعدے تشکیل دیے اور پھر تاریخ لکھتے وقت انھیں اپنا رہنما بنایا لیکن یہ سب باتیں مؤرخ شبلی کے بارے میں کہی جاتی ہیں حالانکہ دیکھا جائے تو شاعر شبلی بھی کسی مورخ سے کم نہیں۔

شبلی کو قدرت نے مورخ کا ذہن اور شاعر کا دل عطا کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو مورخ کی باریک بین نظر سے دیکھتے اور شاعر کے حساس دل سے محسوس کرتے تھے۔ یوں تو مورخ شبلی کی نثر کے مرقعوں میں بھی کہیں کہیں شاعر شبلی کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن شاعر شبلی کی شاعری میں ہر وقت مورخ شبلی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ تاریخ نویس شبلی کی نگاہ کسی چیز کو دیکھتی ہے تو اس کی کسک شاعر شبلی کو محسوس ہوتی ہے۔ وہ اس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس اثر کے بغیر ان کی شاعری، شاعری نہیں رہتی، اس بات کا احساس خود انھیں بھی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ”میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں، یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا۔“[۱]

شبلی کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ بیک وقت متکلم بھی تھے، سوانح نگار بھی۔ ادیب بھی تھے، انشا پرداز بھی۔ شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان حیثیتوں میں سے ان کی شخصیت کا کوئی بھی پہلو مورخ شبلی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ شبلی اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے، چنانچہ خود ان کا کہنا ہے کہ:

”تاریخ آج ہمارے دسترخوان کی چٹنی ہے۔ دوسری چیزوں کو مرغوب بنانے کے لئے ہم اسے استعمال کرتے ہیں۔“[۲]

شاعر شبلی کے حساس دل اور مورخ شبلی کی باریک بیں نظر کے امتزاج نے شبلی کی نظموں کو شعریت اور واقعیت کا حسین مرقع بنا دیا ہے۔ شبلی نے جن نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کا موضوع بنایا ہے ان میں تاریخ کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی شعر کے نازک آبگینے کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ تاریخ کی اصلیت اپنی جگہ قائم ہے اور شعر کی شعریت اپنی جگہ۔

شبلی سرسید تحریک کے ایک مخلص علمبردار تھے۔ سرسید اور ان کے پیش نظر ایک ہی مقاصد تھے۔ دونوں مسلمانوں کو پستی کی انتہائی گہرائیوں سے نکالنے کے خواہشمند تھے لیکن اس سلسلے میں دونوں کا انداز فکر بھی جدا تھا اور طریق عمل بھی۔

سرسید اس بات کے حق میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لاکر ان کی ترقی کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ اس کے برعکس شبلی انگریزوں سے راہ و رسم بڑھانے کے حق میں نہ تھے۔ سرسید مصلحت اندیش تھے۔ انھیں اس مصلحت کی خاطر انگریز کی تقلید بھی گوارا تھی لیکن شبلی کے سوچنے کا انداز سرسید سے بہت حد تک جدا تھا۔ انھیں مصلحت سے سروکار نہ تھا، اسلام سے محبت اور سچائی سے پیار تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے بھی غدر کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے انگریزوں کو کھلم کھلا برا کہا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے۔ موقع محل کا خیال ضرور رکھا تھا۔ شبلی اس قسم کی مصلحت بینی کے قطعاً خلاف تھے۔

۱؎ مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۳۰۸، خط نمبر ۲ بنام عبدالحکیم دسنوی

۲؎ بحوالہ غلام احمد ادیب علی گڑھ، شبلی نمبر صفحہ ۴۳۳

ان کے مذہبی جذبات انہیں مصلحت سے ہمیشہ دور رکھتے تھے۔ وہ مصلحتاً بھی مذہب پر سیاست کو ترجیح دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

انگریزوں نے مسلمانوں کی نظر میں ان کے آباء و اجداد کو گرانے کی کوشش کی تو شبلی نے "سلسلہ نامورانِ اسلام" کے نام سے عظیم مسلم رہنماؤں پر کتابیں لکھ کر مسلمانوں کو ان کے آباؤ اجداد کی عظمت کے گیت سنائے۔ شاعری میں بھی جب شبلی نے تاریخی واقعات پر قلم اٹھایا تو ان کے پیشِ نظر اپنی تاریخ نویسی کا یہی مقصد تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری میں کئی ایسے واقعات نظم کئے ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں ان کے آباؤ اجداد کی یاد تازہ ہو جائے۔ یقیناً اس مقصد کی تکمیل میں شبلی کی نثری تصانیف نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے لیکن شبلی سمجھتے تھے کہ دیرپا اور فوری اثر انگیزی کی صلاحیت نثر سے زیادہ نظم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے نظم کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور زیادہ تر ایسے ہی تاریخی واقعات کو نظم کیا جن میں مسلمانوں کی عظمت جھلک رہی ہو۔ مثال کے طور پر دو ایک قصے ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت زبیرؓ کی شہادت کا واقعہ شبلی نے اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ سچائی بھی اپنی جگہ قائم ہے اور شاعرانہ تاثیر بھی اپنا کام کر رہی ہے اس قصے سے مسلم مردوں کو تو خیر چھوڑیئے، عورتوں ہی کی بہادری کی ایسی مثال سامنے آتی ہے جس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابنِ زبیرؓ　　سب نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھائے یکبار
ابن مروانؒ نے حجاج کو بھیجا پئے جنگ　　جس کی تقدیر میں عرفانِ حرم کا تھا انکار
حرمِ کعبہ میں محصور ہوئے ابنِ زبیرؓ　　ذبحِ بے دیں نے کیا کعبۂ ملت کا حصار
دامنِ عرشِ ہوا جاتا تھا آلودۂ گرد　　بارشِ سنگ سے اٹھتا تھا جو رہ رہ کے غبار
تھا جو سامانِ رسد چار طرف سے مسدود　　ہر گلی کوچہ بنا جاتا تھا اک کنجِ مزار
جب یہ دیکھا کہ کوئی ناصر و یاور نہ رہا　　ماں کی خدمت میں گئے ابنِ زبیرؓ آخرکار
جا کے کی عرض کہ اے اختِ حریمِ نبویؐ　　نظر آتے نہیں اب حرمتِ دیں کے آثار
آپ فرمایئے اب آپ کا ارشاد ہے کیا　　کہ میں ہوں آپ کا اک بندۂ فرمانبردار
صلح کر لوں کہ چلا جاؤں حرم سے باہر　　یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار
بولی وہ پردہ نشینِ حرمِ سرِ عفاف　　حق پہ گر تو ہے تو پھر صلح ہے مستوجبِ عار
یہ زمیں ہے وہی قربان گہ اسماعیلؑ　　فدیۂ نفس ہے خود دینِ خلیلی کا شعار
ماں سے رخصت ہوئے یہ کہہ کے بہ آدابِ نیاز　　آپ کے دودھ سے شرمندہ نہ ہوں گا زنہار
پہلے ہی حملے میں دشمن کی الٹ دیں فوجیں　　جس طرف جاتے تھے یہ ڈھتی جاتی تھی قطار
منجنیقوں سے برستے تھے جو پتھر پیہم　　ایک پتھر نے کیا آ کے سر و رُخ کو فگار
خون ٹپکا جو قدم پر تو کہا از رہِ فخر　　یہ ادا وہ ہے جو ہم ہاشمیوں کا ہے شعار
اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم　　خون ٹپکے گا تو ٹپکے گا قدم پر ہر بار
زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک　　آخر الامر گرے خاک پہ مجروح و نزار
لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا　　اس کو سولی پہ چڑھاؤ کہ یہ تھا قابلِ دار
لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن لیکن　　ان کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار

اتفاقات سے اِک دن جو اُدھر جا نکلیں دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں یکبار
ہو چکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب
اپنے مرکب سے اُترتا نہیں اب بھی یہ سوار

یہی واقعہ یوں بھی نظم کیا ہے۔ اختصار میں بھی ابلاغ کا پہلو نمایاں ہے:۔

حضرت ابن زبیر ابن عوام جب ہوا ان پہ خلافت کا مدار
کی مخالف نے چڑھائی ان پر گرم تھا موت کا ہر سو بازار
ہو گئے لڑکے بالآخر کو شہید لاش کو ان کی چڑھایا سر دار
ان کی ماں نے جو سنی ان کی خبر دل ہوا ان کا محبت سے فگار
لیکن از بسکہ طبیعت تھی غیور نہ کیا رنج و الم کا اظہار
اتفاقاً جو اُدھر جا نکلیں کہ وہ موقع تھا سرِ راہ گزار
لاش بیٹے کی جو لٹکی دیکھی منہ سے بے ساختہ نکلا یکبار
اب بھی منبر سے نہ اترا یہ خطیب
اب بھی گھوڑے سے نہ اترا یہ سوار

شبلی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے قصیدہ گو ہیں۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کے زیرِ اثر زیادہ تر ایسے واقعات پر قلم اٹھایا ہے جن کا تعلق اسلام اور اس کی حیات افروز داستانوں سے ہے لیکن وہ ہر وقت اور ہر دم مسلمانوں کی عظمت کی داستانوں میں ہی نہیں کھوئے رہتے، بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، شبلی کے تخلیقی کاموں کی محرک ان کی نزاکتِ احساس ہے۔ تاریخ کا کوئی واقعہ جس میں جذبے کی تڑپ کا کوئی پہلو ہے ان کے لئے قابلِ توجہ ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ واقعہ کب کا ہے اور کن سے متعلق ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق واقعہ ان کے دل پر زیادہ گہرا اثر چھوڑتا ہے۔

شبلی کا زمانہ، ہندوستان کیا، ساری دنیا کے مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے لئے ایک نازک زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ استعماری قوتیں ہر طرف مسلمانوں کو اپنے آہنی شکنجے میں کس رہی تھیں اور دنیا کے ہر حصے میں اسلامی حکومتیں رو بہ انحطاط تھیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑی بے بسی کا زمانہ تھا، اقتدار ان کے ہاتھ میں نہ تھا۔ ان کے بازو شل تھے اور زبانیں گنگ۔ شبلی کے حساس دل نے ان حالات سے اثر قبول کیا اور انھوں نے اس دوران میں ہندوستان اور دنیائے اسلام کے مسائل پر کئی نظمیں لکھیں جو اس عہد کے خارجی واقعات اور داخلی کیفیات کی صحیح ترجمان ہیں۔ اقتدار کی کنجی انگریز کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ہر بات کو اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا تھا۔ حساس شبلی کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ متعصب انگریزوں نے ہر بات کو اپنے رنگ میں پیش کر کے اسلام اور دنیائے اسلام کے خلاف نعرے بلند کئے تو شبلی ڈھال بن کر سامنے آ گئے اور انھوں نے ان الزامات کو اسلامی نقطۂ نظر سے واضح کر کے سچ اور جھوٹ میں تمیز پیدا کر دی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں کانپور کی مسجد کا واقعہ بڑا سخت اور بے حد نازک واقعہ تھا۔ انگریزی اقتدار کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے لیکن ملک گیری کی ہوس نے طرح طرح کے جال پھیلائے اور بالآخر وہ سارے ہندوستان کے مقتدرِ اعلیٰ بن بیٹھے۔

عیسائیت کا پرچار اس سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اب اس میں اور شدت آ گئی۔ جگہ جگہ عیسائی مشن قائم ہوئے اور نہایت تیزی سے ہندوستانی عوام کو

عیسائی بنایا جانے لگا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی انگریزوں کی اس روش سے ناخوش تھے۔ یہ ناخوشی بڑھتی رہی اور نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں یہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔ انگریزوں نے مقامی فوجیوں کو لڑنے کے لئے ایسے کارتوس دیئے جن کا خول بعض روایتوں کے مطابق گائے اور سؤر کی چربی سے بنایا جاتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اسے اپنے مذاہب پر حملہ تصور کیا اور انھوں نے دوسری وجوہ کے ساتھ ساتھ اس واقعہ سے بھی اثر قبول کر کے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اب انگریز بلا شرکتِ غیرے ہندوستان کے مالک تھے۔ قوانین اُن کی مرضی اور مصلحت کے مطابق بننے لگے۔ وہ جو چاہتے کرتے تھے۔ نہ کوئی روکنے والا تھا، نہ ٹوکنے والا۔

۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ کانپور کے محلے مچھلی بازار میں ایک مسجد کے قریب سے ایک نئی سڑک نکالنے کے لئے حکام نے مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں جوشِ اسلامی کا شعلہ بھڑک اُٹھا۔ انھوں نے ۳ مئی کو مل کر شہر میں ایک جلسہ منعقد کیا اور جلسہ کے بعد شرکائے جلسہ نے مسجد کی راہ لی۔ اور اس کی منہدم دیوار کو چننا شروع کر دیا۔ حکام نے نہایت بے رحمی سے ان نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلائیں جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے۔ اس خونیں حادثے کی وجہ سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ اور تیزی سے پھیل گئی۔ شبلی پر بھی اس واقعہ کا گہرا اثر ہوا۔ یہ اثر شبلی کی زبان سے اشعار کے سانچے میں ڈھل کر یوں سامنے آیا۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے ۔۔۔ دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر ۔۔۔ بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر ۔۔۔ نیند آ گئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب ۔۔۔ ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا ۔۔۔ جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

ایک اور جگہ اس دل سوز واقعے کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار ۔۔۔ کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو ۔۔۔ فیر کا حکم دیا آپ نے جب بھیڑ ہجوم
یہ حقیقت بھی مگر قابلِ انکار نہیں ۔۔۔ کہ بیک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم
پابہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی ۔۔۔ اور پولیس کو تھا عذر کہ ہم ہیں محکوم

ہندوستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے گئے، وہ تاریخی حقیقت ہیں۔ شبلی نے ان میں سے بعض کو کانپور کے خونیں حادثے کا مماثل قرار دے کر بڑے درد بھرے انداز میں ان کا ذکر ایک ہی سانس میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسولِ عرب کی قوم ۔۔۔ کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو، وہ گنجہائے گرانمایہ دفن ہیں ۔۔۔ کچھ بلقان کی خاک میں کچھ کانپور میں

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی | اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خوں | کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

شبلیؔ کے اِن اشعار سے اُس ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے، جو اُنھیں شہیدانِ کانپور سے ہے۔ ان میں دردمندی اور گداز بھی ہے اور تندی و تلخی بھی لیکن شبلیؔ نے کہیں شاعری کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے حق کی راہ سے ہٹنا گوارا نہیں کیا۔

ایک طرف ہندوستان میں کانپور کی زمین پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی اور دوسری طرف جنگ بلقان میں مسلمان مظالم کا نشانہ بن رہے تھے شبلیؔ کا خلوص اور ان کی محبت و دردمندی صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ وہ اس وقت بھی تڑپ اُٹھتے تھے جب ان کے ہم وطنوں کے خون سے ہاتھ دھوئے جا رہے ہوں اور اُس وقت بھی جب دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہوں شبلیؔ مورخ ہیں اُن کی نظر بلقان پر بھی اسی طرح پڑتی ہے جیسے کانپور پر۔ چنانچہ بلقان کے تاریخی واقعات کا جو اثر شبلیؔ کے دردمند دل نے قبول کیا، اس کی منہ بولتی تصویر شبلیؔ کی وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے جنگ بلقان سے متاثر ہو کر کہیں۔ ان نظموں میں شبلیؔ نے اس جنگ کے مختلف پہلوؤں کو ایک مورخ، ایک صاحب بصیرت سیاستدان اور ایک دردمند مسلمان کی نظر سے دیکھا اور انھیں ایک شاعر کی طرح لفظوں کا لباس پہنایا۔[1] وہ انگریزوں سے خفا ہیں۔ انھیں ترکوں سے محبت ہے، کیونکہ اسلام کے رشتے سے ترک ان کے بھائی ہیں۔ ان نظموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شبلیؔ کا بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح یہی خیال تھا کہ ترکی کی فتح عالمِ اسلام کی فتح ہے۔ چنانچہ وہ انگریزوں کو مخاطب کر کے بڑے طنزیہ انداز میں کہتے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے اُستادو | یہ ظلم آرائیاں تاکے، یہ حشر انگیزیاں کب تک؟
یہ جوشِ انگیزیِ طوفانِ بیدادو بلا تاکے؟ | یہ لطف اندوزیِ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک؟
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا | ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک؟
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے | ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک؟
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی | دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک؟

آخری شعر میں مورخ شبلیؔ نے ماضی کے آئینے میں حال کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے شبلیؔ کو ترکوں سے ہمدردی بلکہ محبت ہے اس لئے وہ کسی کو ان کی مدد کرتا دیکھ کر جھوم اٹھتے ہیں۔ ہندوستانی طبی وفد زخمی ترکوں کی امداد کے لئے بلقان گیا تو شبلیؔ اس کے اراکین سے یوں مخاطب ہوئے۔

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی | یہی تھا دردِ اسلامی یہی تھی رسمِ غم خواری
جو سچ پوچھو تو تم انصار بھی ہو اور مہاجر بھی | کہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

اور پھر جب ترکوں نے ایڈریانوپل کے مقام پر فتح پائی تو شبلیؔ کا دل کھل اٹھا:

اے ترک! اے مجسمۂ کبریائے حق | اے وہ کہ جس پہ عالمِ ہستی کو ناز ہے
پشت و پناہِ ملّتِ ختم الامم ہے تو | تو آج زورِ بازوئے شاہِ حجاز ہے
رنگیں ہے تیری تیغ سے ہر صفحۂ وجود | مغرب ترا ہی عرصہ گہِ ترک تاز ہے
تو نے دکھا دیا کہ تری تیغِ جاں ستاں | اب بھی فنائے ہستیٔ دشمن کا راز ہے
رنگیں جو ہے مرقعِ عالم کا ہر ورق | شمشیر تیری خامۂ رنگیں طراز ہے

ایک مدت سے ہندوستانی مسلمان یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک سیاسی جماعت کے بغیر ہندوؤں اور انگریزوں میں اپنی انفرادیت قائم رکھنا ممکن نہیں۔ چنانچہ

---

[1] شبلیؔ کی سیاسی شاعری از سید وقار عظیم "مقالات یومِ شبلی" صفحہ ۲۸

دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے خواجہ سلیم اللہ نے ایک گشتی مراسلے کے ذریعے "آل انڈیا مسلم کنفیڈریسی" کے نام سے ہندوستان میں ایک سیاسی جماعت کے قیام کی تجویز پیش کی تاکہ وہ مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت اور وسیع کے ساتھ ساتھ کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرے اور تعلیم یافتہ اور ہنرمند مسلمان جوانوں کے لئے عوامی زندگی میں جگہ پیدا کرے۔ اپنے مراسلے میں خواجہ سلیم اللہ نے مزید لکھا کہ آج تک مسلمان سیاست سے بے اعتنائی برتتے رہے ہیں۔ ان کی حیثیت محض سیاسی ڈرامے کے تماش بینوں کی سی تھی لیکن اب ان معاملات میں نرمی برتنا ٹھیک نہیں۔ اس مراسلے کا اختتام اس خواہش پر ہوا تھا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد میں اس مسئلے پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اگلے اجلاس میں غور کریں۔

اس کانفرنس کا اگلا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۶ء کے آخری ہفتے میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا جس میں تقریباً تین ہزار لوگ شریک ہوئے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اس سے زیادہ نمائندہ اجلاس اس سے پیشتر کبھی نہ ہوا تھا۔ اپنی زندگی کے بیس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا جب کانفرنس نے سیاسی بحثوں پر سے اپنی روایتی پابندی اٹھائی اور نواب سلیم اللہ کی تجویز پر غور کرنے کے لئے دسمبر کی تیرہ تاریخ مقرر کی۔ آخر کچھ بحث و مباحثے کے بعد ایک سیاسی جماعت کے قیام سے متعلق یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کرلی گئی لیکن اس تنظیم کا نام جیسا کہ پہلے تجویز ہوا تھا "کنفیڈریسی" کے بجائے "آل انڈیا مسلم لیگ" رکھ دیا گیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے وقت اس کے مندرجہ ذیل مقاصد قرار دیئے گئے تھے۔

(الف) مسلمانان ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو اسے دور کرنا۔

(ب) مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا اور ان کی ضروریات و خواہشات کو مودبانہ طریقہ سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

(ج) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانان ہند میں ایسے خیالات نہ پیدا ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں[1]۔

ان میں پہلی اور دوسری شق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شروع شروع میں حکومت کے بارے میں مسلم لیگ کا رویہ خاصا نرم تھا اور مسلم لیگ اپنی ضروریات و خواہشات کو مودبانہ طریقے سے حکومت کے سامنے پیش کرنے کو اپنے مقاصد میں شامل سمجھتے تھے۔ چنانچہ عوام کی خواہش اور بقول سید سلیمان ندوی "عام لوگوں کے رجحان کو دیکھ کر لیگ نے ہندوستان کے لئے خود مختار حکومت کا مطالبہ کیا تو اس مطالبہ میں سوٹ ایبل (SUITABLE) کا اضافہ کر دیا۔ یعنی ان کا مقصد ہندوستان کے حالات کے موافق خود مختار حکومت بنانا تھا۔ اس مبہم اور غیر واضح لفظ نے کئی غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ جماعت احرار نے اس کی مخالفت کی شبلی نے بھی جماعت احرار کی رہنمائی میں اس طرز عمل کے خلاف آواز بلند کی[2]۔ مسلم لیگ سے متعلق شبلی کی نظمیں خاص طور پر اہم ہیں کیونکہ یہ لیگ کی داستان حیات ہیں اور انہیں پڑھ کر لیگ کی عمر کے ایک اہم حصے کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس زمانے کی مسلم لیگ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہی جماعت آگے چل کر مسلمانوں کو آزادی جیسی نعمت اور ایک آزاد ملک دلانے کی خدمت انجام دے گی۔ ہم اس بات سے انکار کیوں کریں کہ جہاں اور بہت سے دانشوں نے لیگ کو صحیح راہ دکھانے کا کام کیا وہاں شبلی کے اشعار بھی اس کام میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ابتدائی ایام کی مسلم لیگ کا حال شبلی کے اشعار کی زبانی سنیئے:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے، کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ نظر لطف رئیسان خوش انجام بھی ہے
رہنمایان نو آموز کا ہے مکتب درس زینۂ فخر و نمائش گری عام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں محسن قوم بھی ہے، خادم حکام بھی ہے

جناب لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیئے

[1] DR. ABDUL HAMID, A BRIEF SURVEY OF MUSLIM SEPARATION IN INDIA. LAHORE 1967 PAGE 79.
[2] کلیات شبلی صفحہ ۹۶

کلیم طور پہ کرتے تھے عرض قوم کا حال • تو آپ شملہ پہ کچھ حال قوم کا کہیئے
سنایئے انھیں کچھ بحر تیر و جبر کا حال پھر اس کے بعد تمہارے ناخدا کہیئے
کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجیے جرأت جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہیئے
جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے

حضرت لیگ نے اب کی سرِ منبر یہ کہا کہ بس اب سلف گورنمنٹ کی تیاری ہے
میں نے یہ "سوٹ ایبل" کی جو لگائی ہے قید یہ عجب نکتۂ آئینِ جہانداری ہے
فن انشا و بلاغت کا بھی رکھا ہے لحاظ کوئی کیا جانے کہ کیا اس میں فسوں کاری ہے
میں نے اس لفظ میں رکھے ہیں ہزاروں پہلو ایک جملہ ہے مگر لاکھ پہ بھی بھاری ہے
آپ جتنا اسے کھینچیں گے لچک جائے گا سادگی میں بھی وہی شیوۂ عیاری ہے

اور پھر جب لیگ کے طرزِ عمل میں تھوڑی سی تبدیلی ہوتی محسوس ہوئی تو شبلی کہہ اٹھے:

لوگ کہتے ہیں کہ آمادۂ اصلاح ہے لیگ یہ اگر سچ ہے تو ہم کو بھی کوئی جنگ نہیں
فرق اتنا تو بظاہر نظر آتا ہے ضرور اب خوشامد کا ہر اک بات میں وہ رنگ نہیں
آگے تھے حلقۂ تقلید میں جو لوگ اسیر سستِ رفتار تو اب بھی ہیں مگر لنگ نہیں

تاریخ نویسی کا ایک اہم اصول ہے کہ ہر بات سیدھے سادے انداز میں بلا کسی لگی لپٹی کے کہہ دی جائے۔ شاعر کو اس کی شاعرانہ تعلیاں مورخ کے منصب سے دور لے جاتی ہیں لیکن شبلی کے یہاں ایسا نہیں ہوتا جیسے وہ ایک واقعہ کو نثر میں بیان کرتے ہیں ویسے ہی پوری دیانت داری سے اسے نظم بھی کر لیتے ہیں۔ نہ کہیں بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہیں، نہ کہیں شاعرانہ تخیلات میں۔ مثال کے طور پر دو ایسے واقعات دیکھیے جنھیں اتفاق سے شبلی نے نثر میں بھی لکھا ہے اور نظم بھی کیا ہے۔

الفاروق میں لکھتے ہیں

"ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کے لیے نکلے، مدینہ سے تین میل پر صرار ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی، اس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے۔ ان کے بہلانے کے لئے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دی ہے۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اٹھے اور مدینہ میں آ کر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کچھ کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا "میں لے چلتا ہوں"۔ فرمایا "قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے"۔ غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولہا پھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا خدا تم کو جزائے خیر دے۔ سچ یہ ہے امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ[1]

اسی واقعہ کو یوں نظم کیا ہے:۔

معمول تھا جناب عمرؓ کا کہ متصل کرتے تھے گشت رات کو سونا محال تھا
اک دن کا واقعہ ہے کہ پہنچے جو دشت میں کوسوں تلک زمین پہ خیموں کا جال تھا

---

[1] الفاروق، شبلی، صفحہ ۲۳۶

بچے کئی تھے ایک ضعیفہ کی گود میں — جن میں کوئی بڑا تھا کوئی خورد سال تھا
دیکھا جو اس کو یہ کہ پکاتی ہے کوئی چیز — جاتا رہا جو طبعِ حزیں میں ملال تھا
سمجھے کہ اب وہ ملک کی حالت نہیں رہی — کم ہو چلا ہے قحط کا جو اشتعال تھا
پوچھا جو اس سے جاکے تو رونے لگی کہ آہ — کیا آپ کو غذا کا بھی یاں احتمال تھا
بچے یہ تین دن سے تڑپتے ہیں خاک پر — میں کیا کہوں زبان سے ان کا جو حال تھا
مجبور ہو کے ان کے بہلنے کے واسطے — پانی چڑھا دیا ہے یہ اس کا ابال تھا
ان سے یہ کہہ دیا ہے کہ اب مطمئن رہو — کھانا یہ پک رہا ہے اسی کا خیال تھا
بے اختیار رونے لگے حضرتِ عمرؓ — بولے کہ یہ مرے ہی کئے کا وبال تھا
جو کچھ کہ ہے یہ سب ہے مری شامتِ عمل — از بس گناہگار مرا بال بال تھا
بازار جا کے لائے سب اسباب آب و ناں — جو زخمِ قحط کا سببِ اندمال تھا
چولھے کے پاس بیٹھ کے خود پھونکتے تھے آگ — چہرہ تمام آگ کی گرمی سے لال تھا
بچوں نے پیٹ بھر کے جو کھایا تو کھل اٹھے — ایک ایک اب تو فرطِ خوشی سے نہال تھا
تھی وہ زنِ ضعیف سراپا زبانِ شکر — یاں حضرتِ عمرؓ کو وہی انفعال تھا

عہدہ عمرؓ کو یہ جو ملا تجھ سے چھین کر
جو کچھ گزر رہا ہے، یہ اس کا وبال تھا

اس واقعہ کو نثر اور نظم دونوں میں پڑھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شبلی نے شاعری میں بھی کہیں حقیقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جو کچھ نثر میں کہا وہی شعر میں بیان کیا۔ تاریخی واقعات کو نظم کرتے وقت نہ تعلیاں اُن کا جزوِ ایمان ہیں نہ مبالغہ آرائیاں۔

ایک اور واقعہ جو شبلی نے نظم و نثر دونوں میں لکھا ہے "عدلِ جہانگیری" سے متعلق ہے۔ نثر میں لکھتے ہیں:۔

"ایک دفعہ نور جہاں بیگم مہتابی پر ٹہل رہی تھی۔ اتفاق سے کوئی راہرو ادھر سے گزرا اور اس نے نظر اٹھا کر نور جہاں کی طرف دیکھا۔ نور جہاں نے اس کو گولی ماردی۔ جہانگیر کو خبر پہنچی۔ فوراً حکم دیا کہ تحقیقات کی جائے۔ جرم ثابت ہوا اور قاضی نے قصاص کا فتویٰ دیا تلماقنوں کو حکم ہوا کہ محل میں جاکر نور جہاں کو پکڑ لائیں اور جلاد کے حوالے کردیں۔ نور جہاں نے بہت کچھ روپیہ کا لالچ دیا لیکن سب جہانگیر کی انصاف پرستی سے واقف تھے، کسی نے کچھ نہ سنی۔ بالآخر نور جہاں نے مقتول کے ورثا کو راضی کیا کہ خوں بہا لے لیں چنانچہ دو لاکھ روپیہ خوں بہا لے کر ان لوگوں نے دست برداری کی اور جہانگیر سے کہہ دیا کہ ہم کو کچھ دعویٰ نہیں۔ جہانگیر نے کہا "شاید تم لوگوں پر بیگم کی طرف سے کچھ دباؤ پڑا۔" ان لوگوں نے یقین دلایا کہ نہیں، ہم نے بخوشی ایسا کیا ہے۔ جہانگیر نے رہائی کا حکم دیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا تو محل میں گیا اور نور جہاں کے پاؤں پر گر کر کہا "ہائے بیگم اگر تراحی کشتہ من چہ می کردم"[1]

اسی قصے کو شبلی نے شعروں کے سانچے میں یوں ڈھالا ہے:۔

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر — ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

[1] مقالاتِ شبلی جلد چہارم صفحہ ۱۰۹-۱۰۸

کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا　　گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا　　خاک پہ ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن
ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر　　غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی　　جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن
نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا　　میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں　　مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک　　کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن
مفتیٔ دین سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا　　کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیٔ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا　　شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے　　پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر　　پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں　　اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام　　خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا　　بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دیئے لاکھ درم بیگم نے　　سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص　　قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن
ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں　　کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلہ و فن
اُٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم　　تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیتِ حزن
دفعتہً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی، آہ چہ می کردم من

اس واقعہ کے نثری بیان اور منظوم پیرایۂ اظہار سے واضح طور پر ایک بات جو سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ شبلی نے شاعری کے تقاضے (حسن بیان) کی پابندی کرتے ہوئے بھی تاریخ نویسی کے اہم ترین اصول — سچائی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نثر میں یہ واقعہ نہایت اختصار اور ایجاز سے لکھا ہے جب کہ شاعری میں، بھی آب جو کسی حد تک بحر بے کراں ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ یہاں حقیقت میں شاعرانہ احساس اور جذباتی گداز کی آمیزش اور اسیخ ضروری تھی۔

شبلی شاعر اور مورخ ہونے کے علاوہ متکلم بھی ہیں۔ کبھی کبھی ان میں متکلمین کا جوش عود کر آتا ہے اور یہ چیز جذبۂ غضب کو پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے وہ خود بھی معترف ہیں۔ لیکن شبلی کا یہ غصہ انھیں تاریخ اور شاعری کی دنیا سے زیادہ دور نہیں لے جاتا بلکہ وہ طنز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے موقعوں پہ ذہن ظفر علی خاں اور اکبر کی سیاسی شاعری کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ جنگ بلقان کے زمانے میں سر آغا خان نے ایک مضمون میں ترکوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سرزمین یورپ

کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں۔ اس مشورے پر شبلی کا طنز ملاحظہ فرمائیے:

ترک سے حضرتِ آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتارِ الم؟
ایشیا میں اگر آ جاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے پڑے چین سے سوؤ گے بہ غم؟
فائدہ کیا ہے کہ تم ریل کا احسان اٹھاؤ — آپ کا اسپِ سبک سیر ہے کس بات میں کم؟
آپ صحرا میں چلائیں گے جو خشکی کا جہاز — پھر نہ کچھ بھاپ کی حاجت ہے نہ طوفان کا غم
لمپ کی شعلہ فشانی میں کہاں وہ انداز؟ — شمع کی بزم طرازی کا جو کچھ ہے عالم

پروفیسر سید وقار عظیم نے ایک جگہ مورخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مورخ کو جب حال میں کچھ نظر آتا ہے تو وہ اُسے ماضی کا عکس سمجھتا اور پھر ماضی اور حال کے اس تصور سے مستقبل کا نقش بناتا ہے اور پھر مستقبل کی یہ جھلک دکھا کر اپنے مخاطب کو ایسے راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نزدیک سیدھا اور سچا ہے اور جس پر چلے بغیر آدمی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔"[1]

یہ بیان شبلی کی تاریخ نویسی پر خواہ وہ شعر کی شکل میں ہو یا نثر کی صورت میں، پوری طرح صادق آتا ہے۔ کیونکہ شبلی مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دردمند شاعر اور صاحبِ بصیرت سیاست داں بھی ہیں۔ وہ صرف گزرے ہوئے واقعات سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ آئندہ کے لئے بھی ہدایات جاری کرتے رہتے ہیں۔ نیک و بد بھی سمجھاتے جاتے ہیں۔ مثلاً مسلم لیگ نے انگریزوں سے "سلف گورنمنٹ" کا مطالبہ کیا اور اس کے ساتھ "سوٹ ایبل" کی شرط لگائی تو شبلی نے بھی اور صاحبِ بصیرت لوگوں کی طرح "سوٹ ایبل" کی شرط کو لعنت قرار دیا اور کہا:

لیگ کو جب نظر آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم — اک نیا روپ بھرا اس نے بہ اندازِ دگر
منظرِ عام پہ لوگوں سے کیا اس نے خطاب — کہ نہیں سلف گورنمنٹ سے اب ہم کو مفر
اک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے — جس سے ہیں متفق اللفظ سب اربابِ نظر
یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو "سوٹ ایبل" — یا کہ موزوں و مناسب ہو بالفاظِ دگر
جب کبھی کوئی بھی تحریک سیاسی ہوگی — آپ اس قیدِ مناسب کو بنائیں گے سپر
یہ وہی لفظ ہے مجموعۂ صد گونہ فریب — یہ وہی لفظ ہے سرمایۂ صد گونہ مفر
ایک ان میں سے ہے یہ بھی کہ "ابھی وقت نہیں" — ہے اسی لفظ کی تشریح بہ الفاظِ دگر
آج یہ لفظِ "مناسب" جو نیا وضع ہوا — آپ اسی لفظ کو ہر بار بنائیں گے سپر
آپ اس دام سے برسوں بھی نہ چھوٹیں گے کبھی — آپ اس کوچۂ پرخم سے نہ ہوں گے سرور
آپ اس بھول بھلیاں سے نہ نکلیں گے کبھی
دل سے جائے گا نہ تعلیمِ غلامی کا اثر

شاعری اور تاریخ نویسی کے میدان الگ الگ ہیں۔ نہ شاعری تاریخ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر زیادہ دور چل سکتی ہے اور نہ تاریخ دور تک شاعری کا

---

[1] مقالات یوم شبلی (مرتبہ: خان عبید اللہ خان)، اردو مرکز لاہور (۱۹۶۱ء) صفحہ ۳۳

ساتھ دے سکتی ہے۔ اعلیٰ قسم کی تاریخ صرف وہی ہوتی ہے جس کا تعلق حقائق اور صرف حقائق سے ہو لیکن شاعری کے لئے حقائق میں تخیل کا شامل کرنا ضروری ہے۔

تاریخ نویسی میں اگر تاویلیں آجائیں تو وہ تاریخ نہیں رہتی لیکن شاعری میں تاویل اپنی جگہ خود بنا لیتی ہے۔ تاویلیں شاعری کو مبالغہ کی سرحد میں لے جاتی ہیں اور اس مبالغے سے شاعری کے حُسن میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اگر تاریخ میں مبالغہ آجائے تو وہ تاریخ نہیں رہتی، افسانہ بن جاتی ہے۔ مبالغہ آرائی ممکن ہے شاعری کے لئے حیاتِ جاوداں کا درجہ رکھتی ہو لیکن تاریخ کے لئے یہ بہر طور سمِ قاتل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔
تاریخ کے لئے واقعات کا تواتر نہایت ضروری ہے جب کہ شاعری میں تواتر کی کوئی قید نہیں۔ اچھی تاریخ نویسی کے لئے تحقیق و تدقیق نہایت ضروری ہے تحقیق و تدقیق نثر کے سانچے میں تو ڈھل سکتی ہے لیکن شاعری میں اس کا گزر مشکل ہے۔ تاریخ نویسی کے فن کے لئے ضروری ہے کہ مورخ ہر واقعے کو عام نقطۂ نظر کے مطابق بے کم و کاست بیان کر دے۔ تاریخ اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی۔ دوسری طرف شاعری کو جذبے کی زبان کہا گیا ہے۔ یہاں تاریخ کی طرح اہمیت صرف امرِ واقعہ کے بے کم و کاست اظہار کی نہیں، اس واقعہ کے احساس اور احساس کے جوش میں ڈھلنے کا سوال بھی ہے۔ یہ فرق بھی تاریخ نویسی اور شاعری کو ایک دوسرے سے الگ لے جاتا ہے۔

تاریخ نویسی اور شاعری کے فن کے بنیادی فرق کے پیشِ نظر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا گویا ممکن نہیں لیکن شبلی کے یہاں یہ دونوں آمادۂ فساد ہوئے بغیر ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتی ہیں۔ کہیں کہیں البتہ دونوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش ضرور ہوتی ہے۔ جہاں کہیں ایسا ہوتا ہے شبلی اپنے مورخانہ اور شاعرانہ مناصب سے ہٹ جاتے ہیں۔ مثلاً کہیں کہیں شاعری میں کوئی تاریخی واقعہ بیان کرتے ہوئے شبلی قافیہ ردیف کے قید و بند میں پڑ کر اپنے بیان کو خاصا طویل کر دیتے ہیں جب کہ نثر میں وہی واقعہ نہایت اختصار سے بیان ہو جاتا ہے۔

کہیں کہیں شبلی جذبات کی دنیا میں بھی کھو جاتے ہیں (میری مراد یہاں صرف شاعری میں بیان کئے جانے والے تاریخی واقعات سے ہے) نثر انہیں جذبات کی دنیا میں داخل ہونے سے روکتی اور احتیاط کا سبق سکھاتی ہے لیکن شاعری خود بخود اس دنیا میں جانے کے سامان مہیا کر دیتی ہے۔
نثر میں تو شبلی عام نقطۂ ہائے نظر اور دوسرے مورخین کے بیان کو اہمیت دیتے ہیں لیکن شاعری میں وہ کسی کی دخل اندازی گوارا نہیں کرتے اور محض اپنے احساس اور جذبے کی رہنمائی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اگر شاعری میں تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے شبلی ان خامیوں سے دامن بچا لیتے تو ان کی شاعرانہ تاریخ نویسی بھی نثری تاریخوں کی ہم پلہ بن سکتی تھی۔

عبد الاحد شاد

تجرید نگاری کی اہمیت

دسمبر ۱۹۶۲ء کے "فنون" (۲) میں تجریدی مصوری پر ایک باقاعدہ مذاکرہ شروع ہوا۔ اس میں جناب احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے حصہ لیا۔ بنیادی طور پر دونوں نے تجریدی مصوری کی مخالفت کی۔

صرف یہی ایک فن ہے جس کے متعلق میں پہلے پہل تذبذب سے دوچار ہوا۔ ایم اے کے دوران میرے اساتذہ میرے بارے میں کافی عرصے تک یہی سمجھتے رہے کہ یہ تو صرف لغات کے پیچھے لگا رہتا ہے اور میں یہی کہتا رہا کہ ادب و تنقید کے نظریات سے متعلق مجھے کوئی الجھن نہیں۔ اس لئے میں ان کے بارے میں بہت کم پوچھتا ہوں مگر تجریدی مصوری نے مجھے کافی الجھایا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ نہ تو مجھے اس کے مخالفین سے اتفاق ہے اور نہ میں اس کے حامیوں کا ہم خیال ہوں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر میں نے تجریدی مصوری کے بارے میں غیر جانبدارانہ طریقے پر سوچا۔ اور "مخالف اور موافق" سب دلیلوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے طور پر اس فن کی اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔

کسی فن کی اصلیت اس کے منصب سے پہچانی جاسکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی فن کا کوئی حامی و مبلغ اس کا منصب صحیح طور پر نہ پہچان سکے اور کسی غیر اہم بات یا غلط کام کو اس کا منصب بتائے۔ غزل کو لے لیجئے۔ صدیوں سے بعض لوگ ایک بات کو غزل کی بنیادی صفت قرار دیتے ہیں اور بعض دوسرے لوگ دوسری بات کو غزل کا منصب قرار دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تجریدی مصوری کے بعض مبلغین بھی آپس میں یک زبان و ہم خیال نہیں ہیں۔ یہی حال اس کے مخالفین کا بھی ہے۔

قاضی عبدالقادر پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فنون لطیفہ میں بھی استاد رہ چکے ہیں اور شعبۂ فلسفہ میں بھی۔ تجریدی مصوری کے اچھے ماہر ہیں۔ جبھی تو انھوں نے اس بات کی شکایت اپنے مضمون "تجریدی مصوری اور تفہیم کا مسئلہ" میں کی ہے کہ مصوری اور سنگ تراشی پر تنقید مصوروں اور مجسمہ سازوں کی بجائے شاعروں اور ادیبوں نے کی ہے۔ انھوں نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ ہمارے ملک میں جن لوگوں نے اس بحث کا آغاز کیا ہے، (معلوم نہیں آغاز سے ان کی مراد کیا ہے۔ "فنون" میں بحث کا آغاز یا اور کہیں) وہ خود مصور نہیں۔ لہٰذا انھوں نے بحث عدم واقفیت کے عالم میں کر ڈالی ہے۔ قاضی صاحب نے یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ تصویر میں چاہے حقیقی ہو چاہے تجریدی مفہوم کو تلاش نہیں کرنا چاہیئے جس طرح بعض لوگ ادب برائے ادب کے نظریے کے قائل تھے اور ہیں۔ اسی طرح وہ مصوری برائے مصوری کے قائل ہیں۔ مصوری کے استاد کی حیثیت سے انھوں نے مصوری کی ایک تعریف بھی پیش کی ہے۔ ان کے مطابق مصوری رنگ، خطوط اور بناوٹ کے تفاعل کا نام ہے۔ رنگ، خطوط اور بناوٹ کے تفاعل کا نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ کوئی جانی پہچانی صورت ہو یا کوئی ایسی چیز ہو کہ کوئی چیز ہی نہ ہو، مگر وہ مصوری کا ایک نمونہ ہوگا۔ انھوں نے خطاطی کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ خطاطی میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ تحریر میں کیا کہا گیا ہے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کیسی نظر آتی ہے۔ جس طرح خطاطی میں ہم مفہوم پر نظر نہیں رکھتے، اسی طرح مصوری میں بھی ہمیں مفہوم کو مدنظر نہیں

دیکھنا چاہیے، بلکہ قاضی صاحب کی دلائل کے نتیجے کے طور پر ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ تصویر کیسی نظر آتی ہے۔ ان کے الفاظ میں مصوری کی کل کائنات خطوط، رنگ اور نظری عمق میں میزان کی ترتیب و امتزاج ہے۔ اس میں خیالات و تصورات کا کوئی گذر نہیں ہے ——— اگر مصوری کی کل کائنات، صرف رنگ، خطوط اور بناوٹ ہے تو پھر تو یہ کل کائنات چند ہی لمحوں میں سمیٹی جا سکتی ہے۔ میں دوسرے سے مصور ہی نہیں، مگر ان کے اس معیار کی مصوری کے نمونے نہایت خود اعتمادی کے ساتھ ابھی چٹکیوں میں پیش کر سکتا ہوں کیونکہ وہ مجھ سے خیالات و تصورات کا تقاضا نہیں کریں گے، حالانکہ اچھی مصوری خیالات و تصورات کے علاوہ دیگر مسحور کن عناصر بھی رکھتی ہے۔

شعری تجربے عنوان سے انھوں نے جو مضمون لکھا ہے، اس میں انھوں نے شعری کارناموں کو پرکھنے کے لیے ایک معیار ڈھونڈنے کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اس بات کے لیے کافی پریشانی کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے پاس یعنی اردو تنقید میں کوئی ایسا معیار نہیں جس کے ذریعے ہم اچھی اور بری نظم میں تمیز کر سکیں (یہ الگ بات ہے کہ ایک محفل میں میرے پوچھنے پر وہ یہ نہ بتا سکے کہ دنیا کی کسی اور زبان میں ایسی اصطلاح موجود ہے یا نہیں جس سے اتنا اہم کام لیا جا سکتا ہے)۔ اگر قاضی صاحب کو مصوری کے بارے میں بھی اتنی پریشانی لاحق ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اگر وہ اس بات پر مصر ہیں کہ تصویر میں معنی و مفہوم کو نہ ڈھونڈا جائے تو ہم بالکل نہیں ڈھونڈیں گے مگر اس بات کا فیصلہ کیسے کریں گے کہ ایک تصویر کیوں بڑھیا ہے اور دوسری کیوں گھٹیا ہے۔ یہ جو تین عناصر ہیں یعنی رنگ، خطوط اور بناوٹ ——— یہ تو ہر تصویر میں ملتے ہیں ——— بڑھیا سے بڑھیا تصویر میں بھی اور گھٹیا سے گھٹیا تصویر میں بھی۔ رنگ، خطوط اور بناوٹ کے علاوہ ضرور کچھ ایسی چیزیں اور بھی ہیں جو اعلیٰ تصویروں میں ہوتی ہیں مگر ادنیٰ تصویروں میں نہیں ہوتیں یا کم اور ادنیٰ درجے کی ہوتی ہیں۔

چونکہ قاضی صاحب رنگ، خطوط اور بناوٹ کو مصوری کی کل کائنات تصور کرتے ہیں، اس لئے انھوں نے حقیقی مصوری اور تجریدی مصوری کے فرق کو بھی نظرانداز کر دیا ہے۔ لوگ تجریدی مصوری کی یہ شکایت کرتے ہیں کہ حقیقی مصوری تو سمجھ میں آتی ہے مگر یہ مصوری سمجھ میں نہیں آتی۔ قاضی صاحب کے مضمون سے ان کے لئے صرف یہ بات نکلتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی تو گویا نہ ابھی نہیں آتی؟ حالانکہ قاضی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ ایک تجزیہ نگار کی حیثیت سے حقیقی مصوری اور تجریدی مصوری کے اس فرق پر بحث کرتے خاص طور سے اس بات پر کہ یہ مصوری سمجھ میں کیوں نہیں آتی، کن لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے اور کن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، اور یہ کہ آیا یہ خوبی ہے یا خامی۔ بلکہ انھوں نے اس طرح ختم کیا کہ مصوری میں معنی و مفہوم کو ڈھونڈنا ہی فضول ہے۔ میرے خیال میں انھوں نے بعض مسائل اور بعض دلائل کو یا تو غلط رنگ میں اخذ کیا ہے اور یا غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ مجھے اس تصور کے قبول کرنے میں تامل ہے کہ مصوری ایک زبان ہے۔

یہ صرف قاضی صاحب کے کچھ خیالی کردار ہوں گے، جو ایسی باتیں کرتے ہیں (شعری تجربہ میں بھی وہ اپنے خیالی اردو نقادوں سے برسر پیکار نظر آتے ہیں) البتہ یہ بات ہر سوچنے سمجھنے والا کہتا ہے کہ زندگی اور فطرت بنیادی حیثیت سے مختلف فنون میں مختلف انداز سے عکس فگن ہیں۔ ادب میں زندگی کا اظہار زبان کے ذریعے ہوتا ہے اور مصوری میں اشکال و صور کے ذریعے سے۔ جس طرح نظم یا نثر کے کسی ٹکڑے کو تصویر نہیں کہا جا سکتا چاہے وہ درجہ محاکاتی ہو، اسی طرح کسی تصویر کو بھی زبان نہیں کہا جا سکتا ہر چند کہ کسی کی شوخیٔ تحریر کی فریادی ہو ——— ابھی ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ وہ بعض باتوں کو یا تو غلط رنگ میں لے لیتے ہیں یا غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصوری کے بارے میں اکثریت کا تقاضا ہے کہ وہ تصویر بلند مرتبہ سمجھی جا سکتی ہے جس کے دیکھنے سے انسان کے دل میں انسانی عظمت کا خیال پیدا ہو، انسان کے شعور کا دائرہ وسیع تر ہو، اس کے جذبات و احساسات میں تہذیب آ جائے اور نتیجۃً وہ عملی دنیا میں بہتر اور بلند تر کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس قسم کے تقاضوں کو وہ زندگی کے مسئلے حل کرنا کہتے ہیں۔ اور یہ کہ ایسی تصویر اپنے سوا کسی اور چیز کی طرف اشارہ کرتی ہو گی اس طرح اس کی حیثیت لسانی اور اشاری ہو جائے گی۔ وہ جائز تقاضوں کو اس طرح کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں۔ تصویر سے زندگی کا مسئلہ حل کرنے کا تقاضا کوئی بھی معقول آدمی نہیں کر سکتا۔ قاضی صاحب کو چاہیے جب بھی کسی نظریہ کی مخالفت کریں تو اس سلسلے میں معقول اور سمجھ دار لوگوں کی آراء پر تنقید

کرکے اپنا رویہ ظاہر کیا کریں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر سخن ان کا اک مقام سے ہوگا۔

فنونِ لطیفہ کی دنیا میں ہر فنِ لطیف کے دائرے میں صورت و معنی کا مسئلہ زیرِ بحث رہا ہے اور ہر فن میں معقول لوگوں نے صورت و معنی دونوں کو اہم سمجھا ہے۔ نہ زیادہ، نہ زیادہ نامعقولیت کا ثبوت اگر کسی نے بہم پہنچایا بھی ہے تو وہ بھی اس قدر کہ ایک حقیقت کو دوسری حقیقت پر فوقیت دی ہے، نہ یہ کہ دوسری کو غیر ضروری گردانا ہے۔ مگر دنیا نے معقولیت کے دامن کو تھامے ہی رکھا اور رابطہ ٔ حرف و معنی کو اختلاطِ جان و تن ہی جانا۔ اگر صورت و معنی جیسی اصطلاحات سے کوئی الجھاؤ پیدا ہوتا ہو تو میں اس کو بھی ہٹائے دیتا ہوں ــــ ظاہر ہے کہ میرا منشا یہ ہے کہ اگر کسی تصویر کو با معنی یا پُر معنی سمجھا جائے یا اگر ایسی تصویر کھینچی جائے تو اس سے وہ تصویر اشاری نہیں بن جاتی جس طرح کہ قاضی صاحب کہتے ہیں: "تصویر زبان یا اشارہ نہیں، لہٰذا اس کی حیثیت نہ علمی ہے نہ وظائفی۔ تصویر کا اساسی طور پر کوئی وظیفہ نہیں"۔ مگر مصوری کی تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے مصوروں نے جب بھی اچھی تصویر بنائی ہے، کسی خیال یا کسی جذبے کے تحت بنائی ہے اور اُنھوں نے اس وقت دم لیا جب انھیں یقین ہوا کہ وہ خیال یا جذبہ ان کی تصویر سے عیاں ہو کر رہا۔ تصویر کے عنوان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ تصویر کا موضوع یا مفہوم کیا ہے۔ قاضی صاحب کو چاہیئے تھا کہ وہ کسی مشہور یا موضوع تصویر کو اشاری ثابت کرکے اس کو تصویر کے درجے سے گرا دیتے۔ مثلاً مائیکل انجلو کی ایک مشہور تصویر جس کا عنوان ہے "طوفانِ نوح"، پر غور کرکے بتاتے کہ اس تصویر کی اپنی بھی کوئی حیثیت ہے یا محض ایک اشارہ ہے۔ کیا تصویر کا با معنی ہونا اور اشاری ہونا ایک ہی بات ہے؟ جہاں تک حقیقی مصوری کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ایک اعلیٰ تصویر با معنی ہونے کے باوجود محض اشاری نہیں ہو سکتی۔ ایک حقیقی تصویر کسی خیال یا تصور کی طرف اشارہ کرکے غائب تو نہیں ہو جاتی۔ وہ کسی خیال کی طرف اشارہ کرتی ہی نہیں بلکہ وہ تو خیال لئے ہوئے ہوتی ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ خیال کو تمام دوسری تفصیلات کے ساتھ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ ایک تجریدی تصویر سے اس کا موازنہ کرکے دیکھا جائے تو صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ صرف خیال ہی اہم نہیں بلکہ دوسری تفصیلات کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

تصویر کسی حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ وہ حقیقتوں کو پیش کرتی ہے۔ اشارہ کرنا اور بات ہے اور پیش کرنا اور بات ہے۔ تصویر کو تو چھوڑیئے زبان کے ذریعے بھی جب ہم مختصراً کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم اُس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جوں جوں ہم اُس چیز کے بارے میں تفصیلات پیش کرنے لگتے ہیں توں توں اُس چیز کی اشاری حیثیت ختم ہوتی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ چیز اپنی پوری حیثیت سے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ ہمارے ذہن میں اُس وقت آ سکتی ہے جب ہم ادب میں کردار نگاری اور ماحول سازی پر غور کر رہے ہوں۔ مثال کے طور پر ایک لفظ "بوڑھا" لے لیجئے۔ جب آپ کہتے ہیں "بوڑھا" تو اگر ایک ہزار اشخاص سُن رہے ہوں تو ان کے ذہنوں میں ایک ہزار بوڑھے آ جائیں گے۔ ہر ذہن میں ایک الگ بوڑھا ہوگا، یا ممکن ہے ایک ایک ذہن میں کئی کئی بوڑھے آنے جانے لگیں۔ اس کے بعد جب آپ کہتے ہیں: اس کی داڑھی سفید تھی۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی تھی ...... اور اس کے بعد اس کے متعلق دیگر تفصیلات پیش کرتے ہیں تو سامعین کے ذہنوں میں بوڑھوں کی تعداد حیرت انگیز حد تک کم ہو جاتی ہے۔ اب بوڑھا اشارہ نہیں رہا بلکہ وہ اپنے خاص انداز کے بڑھاپے کے ساتھ آ موجود ہوا ــــ اگر آپ بالزاک جتنی قوتِ بیان رکھتے ہیں تو پھر تو آپ کروڑوں ذہنوں میں صرف ایک بوڑھے کو بٹھا سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ قصہ کہانی کا کامیاب کردار دنیا میں ہم سے کہیں بھی دوچار نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کی حیثیت اشاری نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک شخص بن جاتا ہے۔ اس کا ذکر اسی کے لئے کیا جاتا ہے۔

ادیب کی بہ نسبت مصور کو یہ چیز بہ آسانی ہاتھ آتی ہے۔ یہ مصوری کی اپنی انفرادی خوبی ہے۔ ادیب کے کردار میں ہمارے تخیل کا رنگ بھی کسی نہ کسی طرح شامل ہو ہی جاتا ہے مگر مصور کا کردار پورے کا پورا ہمارے سامنے موجود رہتا ہے۔ جتنا کچھ اُس نے پیش کیا ہے اُتنا ہی سامنے رہتا ہے۔ تصویر میں اگر ہم کسی خیال کو پیش کریں یا اس کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کریں تب بھی وہ اشاری نہیں ہو جاتی۔ بڑے بڑے مصوروں کی تصویریں

موجود ہیں اور ان کے مصدقہ بیانات بھی جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان تصویروں میں انھوں نے خاص خیالات پیش کئے ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد جب بھی ہمیں وہ خیالات یاد آتے ہیں تو ان تصویروں کی صورت میں یاد آتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہمیں وہ خیالات تو یاد آئیں مگر وہ تصویریں یاد نہ آئیں۔ لہٰذا تصویر چاہے کتنی بامعنی اور مقصدی کیوں نہ ہو اشاری نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تصویر میں دوسری فنی خوبیاں موجود ہوں۔

تجریدی مصوری اور حقیقی مصوری میں نمایاں فرق ہے۔ اس فرق کو سمجھنا ازحد ضروری ہے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ تجریدنگاری اور فن کے بارے میں لوگوں کے خیالات میں وضاحت اور نظم و ضبط موجود نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں بعض ایسے حضرات کے بیانات دیکھے ہیں جو بے حد سمجھدار اور پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ مخلص بھی ہیں۔ وہ جو بات کرتے ہیں پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے خیالات میں اور ان خیالات میں کافی فرق ہے۔ میں اس فرق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ہربرٹ ریڈ کافی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے THE MEANING OF ART میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمیں تجریدی آرٹ جیسے الفاظ سے نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ بنیادی طور پر ہر فن تجریدی ہوتا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ کوئی بھی فن تجریدی نہیں ہو سکتا بلکہ فن سراسر غیر تجریدی ہوتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ فن سے اور تجریدنگاری سے کیا مراد لیتے ہیں۔

فن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک کوشش ہے دل خوش کن صورتیں تخلیق کرنے کی AN ATTEMPT TO CREATE PLEASING FORMS معمولی غور و فکر کے بعد بھی فن کی اس تعریف کی کمزوریاں سامنے آنے لگتی ہیں۔ اس تعریف پر سوچنے سے پہلے دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ تجریدنگاری کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ موسیقی کے بارے میں کہتے ہیں کہ موسیقی کی ایک تجریدی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دوسرے فنون لطیفہ کی طرح مستعار وسیلوں سے کام نہیں لیتی بلکہ بلاواسطہ طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت انھوں نے اس طرح کی ہے کہ شاعر جن الفاظ کو استعمال کرتا ہے، وہ دراصل بات چیت اور دیگر اظہارات کے لئے ہوتے ہیں مگر موسیقی کا وسیلہ موسیقی کے لئے مخصوص ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہربرٹ ریڈ کے خیال میں تجریدنگاری کی ایک صفت یہ ہے کہ اس میں غیر ضروری اور مستعار وسیلے ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ فن پارے اور سامع یا ناظر کے درمیان کم سے کم پردے رہتے ہیں جبکہ غیر تجریدی یا حقیقی فن میں پردے زیادہ سے زیادہ رہتے ہیں۔ تجریدنگاری کے بارے میں ان کے خیالات کی کچھ اور وضاحت بھی ہمیں ملتی ہے۔ تجریدی آرٹ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ فطرت سے منقطع DISENGAGED کیا ہوا آرٹ ہے۔ یہ خالص یا بنیادی صورت (PURE OR ESSENTIAL FORM) ہے جو ٹھوس (CONCRETE) قسم کی تفصیلات سے مجرد (ABSTRACTED) کی گئی ہے۔

اب جو ہم غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہربرٹ ریڈ کے تصور فن اور تصور تجریدنگاری میں نہ صرف فرق ہے بلکہ تضاد بھی ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے کہ ہر فن کیونکر بنیادی طور پر تجریدی ہوتا ہے۔ اور کیا ہر مجرد کی ہوئی صورت دل خوش کن ہوتی ہے۔ اگر فن کا بنیادی منصب دل خوش کن صورتیں تخلیق کرنا ہے تو کیا وہ فطرت سے منقطع ہو کر یہ کام انجام دے سکتا ہے؟ یہاں پر ڈاکٹر سید عبداللہ کا حوالہ یاد آتا ہے کہ تجریدنگار دعویٰ رکھتے ہیں کہ حسن صرف فطرت کے مظاہر میں مقید نہیں بلکہ انسانی ذہن کی ایجاد کردہ شکلوں میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر تجریدنگاروں کے رجحان سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حسن صرف ان صورتوں میں ہے جو فطرت سے منقطع کی گئی ہوں اور جو تفصیلات سے بے نیاز ہوں کیونکہ تجریدی مصوری میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی بھی چیز نمایاں و واضح اور تفصیلی نہیں ہوتی۔ یہاں ہمارے دل میں ایک شک پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آیا سارے تجریدنگار صرف حسن آفرینی کو سب کچھ سمجھتے ہیں؟ کیا وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے صرف دل خوش کن صورتیں پیش کرنا اپنا مقصد سمجھتے ہیں؟

دلیل سازی اور بحث بازی کے جوش میں چند ایک نے ضرور حسن آفرینی کی اس قسم کی کوشش پر زور دیا ہوگا جبھی تو ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کے

دعویٰ کا ذکر کیا ہے مگر چند ایک ایسے بھی ہیں جو حسن آفرینی کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ معنی و مفہوم کی باتوں پر زور دیتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہربرٹ ریڈ کے دل خوش کن صورتوں والے فن کو وقعت نہیں دیتے۔ البتہ ان کے تجریدی آرٹ کے تصور کو صحیح مانتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ چند اور باتوں کو بھی تجریدنگاری کے تصور میں شامل سمجھتے ہیں۔ یوں تو ہربرٹ ریڈ تجریدنگاروں کو حقیقت پسندی اور حقیقت پسندوں کو تجریدنگاری سے کام لینے کا مشورہ دیتے ہیں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ تجریدنگار دل خوش کن کی بجائے حیران کن صورتیں تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے پیش امام پکاسو کی اب تک سب سے بڑی تعریف یہی کی گئی ہے کہ ہمیں حیرت میں ڈالنے کی اس میں زبردست قابلیت ہے ___ حیرت کا تعلق عقل سے ہے۔ دوسرے تجریدنگاروں کی باتوں سے معلوم ہوگا کہ تجریدی مصوری کی بنیاد فکر پر ہے نہ کہ جذبہ و وجدان پر۔

آیئے ان دوسرے لوگوں کی باتوں پر غور کریں، ان کی صحیح باتوں سے فائدہ اٹھائیں اور غلط باتوں سے صحیح قسم کے نتائج برآمد کریں ___

ایک مرتبہ بی بی سی سے ایک پاکستانی تجریدی مصور کا انٹرویو اردو میں نشر ہوا تھا۔ نام تو اس وقت یاد نہیں۔ البتہ ان کی سیدھی سادی مگر پُرمغز باتوں میں ایک ضروری بات یاد ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تجریدنگار کیوں ایسی عجیب و غریب شکلیں بنا کر پیش کرتے ہیں؟ تو اس کا جواب انھوں نے کچھ یوں دیا تھا کہ مصوری ایک الگ فن ہے۔ اظہار کے لئے اس کے اپنے الگ وسائل ہونے چاہئیں۔ دنیا میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ مصوری میں بھی ہم وہی کچھ اسی انداز سے پیش کریں۔ مصوری کا درخت دنیا کے درخت سے الگ ہو سکتا ہے۔ دنیا کے انسان سے مصوری کا انسان جدا ہو سکتا ہے۔ ہمیں تو ایک خیال پیش کرنا ہے اور اس خیال کو ہم مصوری کی اشیا کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں۔ دنیا کی اشیا کے ذریعے سے پیش نہیں کرتے ___ یہ بیان اگرچہ سادہ سا ہے مگر تجریدی مصوری اور تجریدنگاروں کے منشا کو سمجھنے کے لئے بہت مفید ہے۔ ہربرٹ ریڈ کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ تجریدی مصوری کی کیا کیفیت ہے، مگر اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کیفیت کیوں ایسی ہے ___ اس کے علاوہ یہ پاکستانی مصور (نام اب بھی یاد نہیں آیا) خیالات کی پیش کش کو اولیت دے رہے ہیں۔ صورت و معنی میں یہ معنی کو اہم سمجھتے ہیں اور صورت کے معاملے میں کسی کی مقرر کردہ صورت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ صاحب نہ تو دل خوش کن صورتوں کی تخلیق کے قائل ہیں اور نہ رنگ، خطوط اور بناوٹ کے کھیل پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ تجریدنگار مصوری کو خیالات پیش کرنے کا ایک منفرد ذریعہ یا فن تسلیم کرتے ہیں۔ مگر کیا فن لطیف کا انتہائی مقصد صرف خیالات کا ابلاغ ہے؟ پھر علم اور فن لطیف میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟

ریڈیو سے سنے ہوئے چند فقروں پر تنقید کرنا یا ان سے تنقیدی نتائج برآمد کرنا زیادہ سودمند نہیں خصوصاً اس صورت میں کہ مصور کا نام بھی حافظے سے اتر چکا ہو۔ ہمیں بہرحال ذمے داری کی باتیں کرنی ہیں۔ میرے پاس فروری ۱۹۵۸ء کا "لیل و نہار" ہے۔ جس میں شاکر علی کا انٹرویو چھپا ہے۔ تجریدی مصوری کے بارے میں انھوں نے جو خیالات بیان کئے ہیں۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ گہرائی کے حامل ہیں۔ ان کے الفاظ میں:

"دراصل یہ ایک نظری ذائچہ ہے۔ جس کو فن کار کائنات کے مشاہدے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اور اشیا یا احساسات کی غیر ضروری جزئیات کو علاحدہ کرکے ایک تجریدی شکل میں پیش کرتا ہے۔"

ذرا آگے چل کر کہتے ہیں:

"اگر ہم اس نظریے کو سمجھ لیں کہ تصویر کی جزئیات زیادہ ضروری نہیں بلکہ اس کی فکری اساس ضروری ہے تو پیچیدگیاں سلجھنے لگتی ہیں۔"

دیکھا جائے تو شاکر علی کی نظر ہربرٹ ریڈ سے اس معاملے میں زیادہ باریک ہے اور باتیں زیادہ معنی خیز ہیں۔ ہربرٹ ریڈ کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہو پاتا ہے کہ تجریدنگار فطرت کی نقالی نہیں کرتے۔ یہ نقالی کیوں نہیں کرتے۔ ہربرٹ ریڈ کے بیان سے اس کیوں کا جواب مہیا نہیں ہوتا۔ بی بی سی

والے پاکستانی مصور اور شاکر علی کے بیان سے اس "کیوں" کا نہایت معقول جواب ملتا ہے اور اس طرح ہم تجرید نگاری کے بنیادی اصول سے واقف ہو جاتے ہیں۔

شاکر علی کی بات میں وضاحت سب سے زیادہ ہے۔ ایک نے خیالات کو اہمیت دی ہے۔ دوسرے نے "فکری احساس کو"۔ یوں تو بات ایک ہی ہے۔ البتہ رسائی (APPROACH) کے انداز الگ الگ ہیں۔ یہ رسائی کا انداز بڑا معنی خیز ہوتا ہے۔ ایک کے نزدیک فطرت کی نقالی نہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ فن مصوری کے اپنے مخصوص وسائل وجود میں آجائیں (یہاں ہربرٹ ریڈ کی موسیقی کی تجریدی خصوصیت کی طرف بھی اشارہ مل جاتا ہے) اور مصوری کی انفرادی حیثیت نمایاں ہو جائے۔ دوسرے کے نزدیک جب فکری احساس پر زور دیا جاتا ہے تو جزئیات اور تفصیلات خود بخود غائب ہو جاتے ہیں اور اشیا تجریدی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔

اب تک ہم نے تجرید نگاری سے متعلق محض بنیادی باتیں چند اہم لوگوں کے حوالوں سے بیان کیں، جن کا لب لباب یہ ہے کہ تجریدی تصاویر میں افکار و خیالات پیش نظر رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں جزئیات و تفصیلات کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لئے ان تصاویر میں جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ تفصیلات کے نہ ہونے کے باعث خارج میں موجود چیزوں کی طرح نظر نہیں آتیں۔

اب شاکر علی کے اس نظری زائچے پر غور کرنا چاہیے جس کو فن کار کائنات کے مشاہدے کا ذریعہ بناتا ہے۔ زائچہ اگر کھنچی ہوئی لکیروں سے بنتا ہے تو یہ نظری زائچہ کیا چیز ہوتی ہے۔ کیا نظری زائچہ کی بجائے ہم "انداز نظر" استعمال کر سکتے ہیں؟ —— اگر ہم عینک، دوربین یا خوردبین کو کائنات کا مشاہدہ کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے مگر کسی تجرید نگار کا نظری زائچہ کائنات کے مشاہدے کا ذریعہ کیسے بنتا ہے —— سمجھ میں آنے والی بات نہیں، کیا۔ کوئی خاص نظر ہے جس سے تجرید نگار کائنات کو دیکھتا ہے تو اسے کائنات کی ہر چیز ویسی نظر آتی ہے جیسی کہ وہ اپنی تصویروں میں پیش کرتا ہے؟ اگر تجرید نگاروں میں ایک خاص تعلیم و تربیت سے ایسی بصارت پیدا ہو گئی ہے کہ ان کو ہر چیز ویسی نظر آتی ہے جیسی کہ وہ پیش کرتے ہیں، تو پھر بات صاف ہے۔ ان کی نظر میں اور ہماری نظر میں پھر وہی فرق ہو گا جو عام کیمرے کے فوٹو میں اور ایکسرے کے فوٹو میں ہوتا ہے۔ مگر چونکہ ابھی تک کسی تجرید نگار نے ایسی نظر پانے کا اعلان نہیں کیا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاکر علی کے یہ خاص الفاظ بے معنی ہیں یا پھر ان کا کوئی اور مطلب ہو گا۔ مگر شاکر علی غیر ضروری جزئیات کو علاحدہ کرنے کی بات بھی کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جس نظری زائچہ کو کائنات کے مشاہدے کا ذریعہ بنایا گیا ہے، اس میں اور غیر ضروری جزئیات کو علاحدہ کرنے کے بعد جو تصویر بنائی گئی اس میں فرق کا پایا جانا ضروری ہے۔ ذرا پکاسو کی بات بھی سنیئے۔ کہتا ہے —— میں جس چیز کو دیکھتا ہوں اس کی تصویر بناتا ہوں۔ THE MEANING OF ART میں اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر ہے۔ جس کا عنوان ہے "ایک دوشیزہ آئینے کے روبرو"۔ تصویر کو دیکھئے تو آئینے میں جو چہرہ نظر آتا ہے اس میں اور باہر جو چہرہ ہے اس میں نمایاں فرق ہے۔ اگر پکاسو کی نظر عام لوگوں سے مختلف ہوتی تھی اور اس بے چاری دوشیزہ کا چہرہ اسے اس طرح کا نظر آرہا تھا تو تصویر میں اس کا چہرہ بالکل کلہاڑی کی مانند نظر آتا ہے، تو پھر آئینے کی کلہاڑی میں اور باہر کی کلہاڑی میں فرق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر تصویر میں تو "پھر جز میں ڈال کے بھر دل چلے" والا قصہ ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پکاسو کو اپنے برش پر پورا قابو حاصل نہیں تھا —— شاکر علی کے بیان میں نظری زائچہ اور کائنات کا مشاہدہ جیسے الفاظ تو خل آگئے ہیں مگر ان کی "فکری احساس" والی بات نہایت اساسی ہے اور اسی میں تجرید نگاری کا راز پوشیدہ ہے۔

اس سے قبل کہ ہم تجرید نگاری پر مزید روشنی ڈالیں اور اس سلسلے میں کچھ اور لوگوں کی باتوں کو سامنے لائیں ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ انسانی ذہن کا تجریدی عمل کیا ہوتا ہے یعنی ذہن کے کون سے عمل کو تجریدی کہنا چاہیے اور کیوں۔ اس طرح ہم فنون لطیفہ میں تجرید نگاری کی حیثیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

جرد کا مطلب ہے ننگا ہونا۔ عربی میں تجرید کا مطلب ننگا ہونا بھی ہے اور ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا بھی ہے ——— تجرید ABSTRACTION کا مکمل ترجمہ ہے۔ تجرید کا ایک مطلب اور بھی ہے۔ وہ ہے غیر مادی یا غیر مرئی حالت۔ ولی کا ایک شعر ہے:

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

تجرید کے اِن معنوں میں جب ہم عالمِ تجرید کی اضافت استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب بالکل وہی ہے جو افلاطون کے عالمِ مثال THE WORLD OF ETERNAL PRINCIPLES کا ہے۔ افلاطون کے مطابق عالمِ مثال تک رسائی عقلِ محض PURE REASON کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ دوسرے حواس کے ذریعے نہیں۔ اب ہم ذہن کے تجریدی عمل کو ذہن کے دوسرے غیر تجریدی اعمال سے مجرد کر کے دیکھ سکتے ہیں ——— ذہن کے غیر تجریدی اعمال ادراک، حافظہ، تصور اور تخیل ہیں اور تجریدی عمل تعقل ہے۔ پہلے آپ کا ذہن کسی چیز کا ادراک کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ پھر بار بار کے مشاہدات سے اس کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ چیز محفوظ شدہ حالت میں جوں کی توں پڑی نہیں رہتی بلکہ اس پر رنگ آمیزی بھی ہوتی ہے۔ یہ رنگ آمیزی شکل، رنگ اور جسامت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ غیر تجریدی اعمال ذہن سے آپ کا تعلق ٹھوس اور محسوس خارجی دنیا سے پیدا ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے۔ غیر تجریدی عمل میں آپ کا ذہن اپنے دوسرے اعمال کی مدد سے ٹھوس اور محسوس دنیا کی غیر محسوس اور غیر مادی حقائق سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ تعقل کے عمل میں ذہن دوسرے اعمال یا قوتوں میں تصور سے زیادہ کام لیتا ہے بلکہ تعقل نام بھی تصورات CONCEPTS کے بامقصد کھیل کا ہے۔ آپ کی عقل REASON جب کام کرتی ہے یعنی جب اصول و قوانین کو دریافت کرتی ہے تو وہ تصورات کو استعمال کرتی ہے۔ جب عقل کب، کہاں اور کیسے جیسے سوالات کے لئے جوابات ڈھونڈتی ہے تو مختلف علومِ قطعی SCIENCES وجود میں آتے ہیں اور جب کیوں کے لئے جوابات تلاش کرتی ہے تو فلسفہ نمودار ہوتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ دونوں ذہن کے خالص تجریدی عمل کے نتائج ہیں۔ اس عمل میں ذہن کی دوسری قوتوں نے جس قدر بھی عمل اندازی کی اسی قدر یہ عمل غیر سائنسی اور غیر فلسفیانہ ہوگا، اور اسی مناسبت سے غیر تجریدی ہوگا۔ ذہن کے اس تجریدی عمل کی روشنی میں ہم تجرید نگاری کے سارے خدوخال دیکھ سکتے ہیں۔ اب اگر تھوڑی سی روشنی فن پر بھی ڈال دی جائے تو فن اور تجرید نگاری کے تعلق کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور ہربرٹ ریڈ کے اس دعوےٰ کو بھی پرکھا جا سکتا ہے کہ آیا فن بنیادی طور پر تجریدی ہوتا ہے۔

فن یا آرٹ کا جب ہم ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مطلب سارے فنونِ لطیفہ سے ہوتا ہے۔ فن کی تعریف بہتوں نے کی ہے، ہر ایک کی تعریف میں کوئی نہ کوئی سچائی بھی ہے اور کچھ نہ کچھ کمی بھی۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ فن علم سے ایک مختلف چیز ہے۔ ہم اپنے طور پر دونوں کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ انسان کا وہ اظہار جو انسانی ذہن کی ساری قوتوں کو دعوت دے فن کہلاتا ہے اور وہ اظہار جو صرف قوتِ تعقل کو دعوت دے، علم کہلاتا ہے۔ فن نہ صرف حواسِ خمسہ ظاہری و باطنی کو دعوت دیتا ہے بلکہ وجدان اور جذبات و خواہشات کو بھی متاثر کرتا ہے اس لئے ہم نے ذہن کی ساری قوتوں کا ذکر کیا ہے۔ ہم اس فن کو عظیم سمجھتے ہیں جو ذہن کی مختلف قوتوں کو متوازن انداز میں دعوت دیتا ہے۔ جس فن میں کسی ایک قوت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ خام رہ جاتا ہے اور اگر اس راہ میں زیادہ دور نکل جائے تو فن کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔

معلوم نہیں ہربرٹ ریڈ یہ بات کس دلیل کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ہر فن بنیادی طور پر تجریدی ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر جو چیز تجریدی ہے وہ ہے فلسفہ اور سائنس۔ یہ صحیح ہے کہ کسی فن پارے میں فکری عنصر کا ہونا ضروری ہے مگر فن میں فکری عنصر بنیادی حیثیت سے موجود نہیں رہتا۔ فن اس وقت وجود میں آتا ہے جب ذہن کا عمل بنیادی طور پر غیر تجریدی ہوتا ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہربرٹ ریڈ کے خیال سے بالکل الٹ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر فن بنیادی طور پر غیر تجریدی ہوتا ہے۔ فن کی دنیا ہری بھری دنیا ہوتی ہے جو زندگی، حرکت، حرارت اور رنگ و بو سے معمور رہتی ہے۔

میرے محبوب شاعر احمد ندیم قاسمی تجرید نگاری کا ایک ایسا تصور اپنے دل میں لئے ہوئے ہیں جو کسی بھی دوسرے شخص کے ہاں نہیں ملتا۔ ان کا خیال ہے کہ حقیقت کو فنی حقیقت میں بدلنے کے لئے فن کار کو جن مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے، انہی کا دوسرا نام تجرید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خارجی حقیقت

ہماری کام کی منفرد شخصیت کا اضافہ تجرید ہوتی ہے۔ اقبال کے شعر ؎

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دلآویز امیجری تجرید نہیں تو اور کیا ہے۔ ذرا آگے چل کر کہتے ہیں: "اسی طرح جب چغتائی کی تصویر میں لڑکی کی آنکھیں اس کی کنپٹیوں تک کھنچی چلی جاتی ہیں تو یہاں بھی تجرید ہی کارفرما ہوتی ہے"۔

میرا خیال ہے کہ وہ تخیل IMAGINATION کی ہر قسم کی کارفرمائی کو تجرید سمجھتے ہیں۔ حالانکہ تجرید نگاری کے مخالفین بھی ایسا نہیں سمجھتے اور مبلغین بھی۔ فی حقیقت، اقبال کا شعر اور چغتائی کے مذکورہ بالا حوالے بالکل غیر تجریدی یا حقیقی چیزیں ہیں۔

حافظے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مدرکاتی حافظہ PERCEPTUAL MEMORY اور دوسرا تصوراتی حافظہ CONCEPTUAL MEMORY

مدرکاتی حافظہ یہ ہے کہ آپ کو اشیا ٹھوس شکل میں یاد آئیں اور تصوراتی حافظے میں اشیا کی صرف مخصوص صفات تصور کی صورت میں باقی رہتی ہیں۔ اقبال کا شعر تو بالکل واضح ہے مگر چغتائی کی تصاویر کے بارے میں بھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ چغتائی کی تصاویر میں تخیل کی کارفرمائی کے لیے بنیاد مدرکاتی حافظہ مہیا کرتا ہے اور تجریدی تصویروں کی بنیاد تصوراتی حافظہ پر رکھی جاتی ہے۔ یہاں پر ناظر بجا طور پر سوال اٹھا سکتا ہے کہ تجریدی تصاویر میں تصوراتی حافظہ پر جب مزید کام ہوتا تو کیا یہ کام تخیل کا نہیں ہوتا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ تخیل کا کام ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں تجریدی مصوری کو خالص تجریدی چیز نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے کہ جب بات مصوری کے دائرے میں آجاتی ہے (مصوری چاہے حقیقی ہو چاہے تجریدی) تو نہ تو مصور کے ذہن کا عمل خالص تجریدی ہو سکتا ہے اور نہ تصویر دیکھنے والے کے ذہن کا۔ مصوری میں تجرید کو اضافی چیز سمجھنا چاہیے۔

تصوراتی حافظے پر تخیل کا کام مدرکاتی حافظے پر تخیل کے کام کے مقابلے میں تجریدی ہوتا ہے۔ تصور تخیل کے مقابلے میں تو تجریدی ہوتا ہے مگر تعقل کے مقابلے میں نہیں۔ یہاں تعقل خالص تجریدی ہے اور تصور نسبتاً غیر تجریدی۔ مدرکاتی حافظے میں اشیا واضح اور روشن موجود رہتی ہیں۔ تصوراتی حافظے میں اشیا کی بنیادی اور مخصوص صفات موجود رہتی ہیں کسی چیز کے تصور (CONCEPT) میں آپ ٹھوس اور عام تفصیلات کو مدنظر نہیں رکھتے۔ مثلاً اونٹ کے تصور میں آپ گوشت، خون اور ہڈی وغیرہ کو سامنے نہیں رکھتے بلکہ اس کی اوسط خصلت اور جسم کے مخصوص ڈھانچے کو اس کے تصور کی بنیاد بناتے ہیں۔ اونٹ کے تصور میں "اونٹ پن" کو اہمیت حاصل ہے، یہ گوشت اور خون وغیرہ تو باقی جانوروں میں بھی ہوتے ہیں۔ حقیقی مصوری میں جب اونٹ آتا ہے تو اپنے تفصیلی جسم اور اپنی پوری زندگی کے ساتھ آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تجریدی مصوری میں اس کا صرف "اونٹ پن" نظر آتا ہے۔ اسی چیز کو ہربرٹ ریڈ نے "خالص اور بنیادی صورت" کہا ہے اور رضا کریلی نے "فکری اساس" کا نام دیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب تجریدی مصوری کی بنیاد تصوراتی حافظے پر ہے تو پھر اس کا منصب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا منصب تصورات پیش کرنا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مصوری ہمارے ذہن کی دیگر قوتوں کو دعوت نہیں دے سکتی جب اشکال و صور زندہ نظر نہ آئیں تو ان سے ہمارا جذباتی تعلق کیسے پیدا ہوگا۔ تجریدی مصوری سے ہماری شکایت یہ نہیں کہ اس میں جانی پہچانی چیزیں کیوں نظر نہیں آتیں بلکہ یہ ہے کہ اس میں زندگی کیوں نہیں۔

فن تو زندگی کا فنی نقش ہوتا ہے۔ فن جب زندگی کو نئی رنگ میں پیش کرتا ہے تو حقائق خیال افروز ہو کر سامنے آتے ہیں اس وقت ہم اپنے آپ کو ایک دوسری زندگی سے دوچار پاتے ہیں، ہمارے ذہن کی ساری قوتیں اس وقت بیدار ہوتی ہیں جب ہم زندگی سے دوچار ہوتے ہیں۔

تجریدی تصویروں کو دیکھنے سے نہ ہم محظوظ ہوتے ہیں نہ جھوم اٹھتے ہیں اور نہ ہمارے جذبات میں کوئی ہلکی سی تحریک ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ اگر کوئی پکاسو کا بھی تو اس نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔ تجریدی مصوری کی اس اصلیت کو جان لینے کے بعد ہم کسی طرح بھی اس کو فن کی بارگاہ میں داخل نہیں سمجھتے۔ جس طرح فن تجریدی نہیں ہو سکتا، اسی طرح تجریدی تخلیقات فن پارے نہیں ہو سکتے۔

ہیپ ورتھ جیسی مشہور مصورہ خاتون نے کہا ہے کہ تجریدی مصوری ادراک کو تیز کرتی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ ادراک کو کیسی چیزیں تیز نہیں کر سکتیں۔ ادراک صرف واضح اور روشن چیزیں دیکھنے سے تیز ہوتا ہے۔ غیر واضح چیزیں دیکھنے سے تو ادراک کند ہو جاتا ہے۔

سید جابر علی جابر ـــــ جوگندر پال ـــــ عبداللہ جاوید ـــــ رفیع الدین ہاشمی

اِختلافات

"شعری تجربہ" ایک کار آمد اصطلاح ہے

قاضی عبدالغفار صاحب[1] نے اپنے مضمون میں ایک دفعہ پھر "شعری تجربہ" کی اصطلاح کو لغو اور بے معنی قرار دے کر اس کی تحدید یا تجدید پر زور دیا ہے۔ جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے اور یادداشت کام کرتی ہے "شعری تجربہ" کی اصطلاح آئی۔ اے۔ رچرڈز نے سب سے پہلے استعمال کی تھی، غالباً "ادبی تنقید کے اصول" میں جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ اور لیوس وغیرہ نے بھی اسے اکثر استعمال کیا ہے۔ اب اس اصطلاح کی عمر چالیس پینتالیس سال ہو چکی ہے لیکن اس کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ اس کی وجہ اس کی جامعیت اور وسعت ہے۔ "تجربہ" فلسفے اور نفسیات کی پرانی اصطلاح ہے اور فلسفہ تجربیت کا کلیدی لفظ ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں ابھرنے والے نفسیات اور فلسفے کے تمام دبستانوں میں "تجربہ" کی اصطلاح بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ان دبستانوں کے ماہر ادبی نقادوں نے جن میں سے دو تین کا نام میں نے اوپر لیا ہے، اس اصطلاح کو شاعر کی "واردات قلبی" کے ساتھ مربوط کر کے ایک کار آمد اور جامع اصطلاح بنا لیا ہے۔ معلوم نہیں قاضی صاحب اس کی "کار آمدی" میں کیا کمی دیکھتے ہیں جو اس کو لغو اور بے معنی قرار دے کر اس کی تحدید یا تجدید کی سفارش کرتے ہیں۔ "شعری تجربہ" دو لفظوں کا مرکب ہے۔ "شعری" اور "تجربہ" کا۔ شعری سے مراد شاعری اور شاعر سے تعلق رکھنے والا اور تجربہ سے مراد زندگی کی تمام تر بوقلمونی ہے جو شاعر کے "تجربے" میں آتی ہے۔ اس سے زیادہ آسان لفظوں میں شعری تجربہ کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

قاضی صاحب کو شعری تجربے کی اصطلاح میں کوئی خصوصیت یا انفرادیت نظر نہیں آتی۔ یہ اعتراض ریاضی دانوں اور سائنس دانوں کا اعتراض ہے۔ جو شاعری میں بیان شدہ تجربات کو فضول اور لغو مبالغہ پر مبنی تصور کرتے ہیں اور اس میں کوئی خاص بات نہیں دیکھتے۔ شاعری کے دلدادہ اس اعتراض پر ناراض نہیں ہوتے بلکہ ایسے حضرات کو ذوقِ شاعری سے محروم کہہ کر اپنی تسلی کر لیتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی منطقی الف کو الف کہتا ہے یعنی اصولِ عینیت کی تشریح کرتا ہے تو منطق سے ناواقف لوگ اس پر ہنستے ہیں اور "الف الف ہے" میں کوئی خاص بات انھیں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ اصولِ عینیت (LAW OF IDENTITY) منطق کی بنیاد ہے۔ قاضی صاحب منطق کے عالم ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے جدید علم معانی (SEMANTICS) کا مطالعہ بھی کیا ہے جو منطق سے ملحقہ مضمون ہے۔ اسی طرح قاضی صاحب نے علمِ معانی سے تحت علامتی فلسفے کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن انھوں نے ایک چیز کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور وہ ہے شاعری اور شاعری کی تنقید، حالانکہ فلسفے کی ایک خاص شاخ ـــــ جمالیات ـــــ فنونِ لطیفہ ہی سے بحث کرتی ہے۔

تجربہ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ہمہ گیر اور جامع لفظ ہو گا جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اور فلسفیوں نے یوں ہی اسے نہیں اپنایا تھا۔ شعری تجربے کی اصطلاح سے پہلے نقاد نفسیات کی متعدد اصطلاحات استعمال کیا کرتے تھے اور اب بھی مندرج کرتے ہیں مثلاً خیالات، تصورات، جذبات،

---

[1] مطبوعہ "نقوش" نمبر ۹

احساسات، کیفیات وغیرہ۔ تجربہ ان تمام نفسیاتی کوائف کو ایک لفظ میں پیش کر دیتا ہے۔ اس لفظ کو پڑھتے یا سنتے ہی ہمارے ذہن میں یکے بعد دیگرے متعدد ذاتی "واقعات" ابھرتے ہیں مثلاً محبت، نفرت، حب وطن، جذبۂ تحسین وغیرہ وغیرہ۔ کلیم الدین احمد کے لفظوں میں :

"خیال بھی تجربہ ہے اور جذبہ بھی تجربہ ہے، پھولوں کی خوشبو، سانپ دانڑ کی آواز، اقلیدس کا مطالعہ، کسی پر عاشق ہونا بھی تجربے ہیں، لیکن تجربے عامیانہ، فرسودہ اور گھٹیا بھی ہوتے ہیں اور بیش قیمت یکتا اور نئے بھی"

شاعر اپنے لئے وہی تجربے چنتا ہے جو نئے اور بیش قیمت ہوں چونکہ جن نے جن تجربات کا بیان کیا ہے وہ گھٹیا اور بے ہودہ ہیں لیکن میر، غالب اور شیکسپیر کے بیان کردہ تجربات بیش قیمت تجربات ہیں۔

"شعری تجربہ" اپنے موضوع یعنی زندگی ہی کی طرح وسیع اور بوقلموں مفہوم رکھتا ہے۔ شعری حقیقت زندگی کی حقیقت ہے جو شاعر کے کلام میں ڈھل کر زندگی سے بھی زیادہ حسین اور دلکش ہو جاتی ہے۔ شعری حقیقت کی بوقلمونی دیکھنی ہو تو شیکسپیر کے ڈرامے پڑھئے جو انسانی تجربات کی شعری تصویریں ہیں۔ شعری تجربہ کبھی میر کا غم ہے، کبھی اقبال کی حرکیت، کہیں یہ غالب کی تکنیک ہے اور کہیں انیس کی منظر نگاری

"شعری تجربہ" بڑی کارآمد اور جامع اصطلاح ہے۔ علمی اصطلاحات تحدید کا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ نفسیات میں FEELING, SENTIMENT, EMOTION MOOD وغیرہ اپنے خاص مفہوم رکھتی ہیں جو ادبی تحریروں میں مفقود ہیں لیکن علمی اصطلاحات مختلف علوم میں مشترک بھی ہوتی ہیں جیسے SUBLIMATION نفسیات میں بھی اپنا ایک اصطلاحی مفہوم رکھتی ہے، اور علم طبقات الارض میں بھی اور علم کیمیا میں بھی۔ یوں یہ محدود ہوتے ہوئے بھی لامحدود ہے۔ نفسیات چونکہ نہایت اہم علم ہے اس لئے اس کے ماہرین نے ہر نفسی صورت حال کے لئے ایک خاص اصطلاح مخصوص کر دی ہے۔ شعری تجربہ بھی اسی طرح علم تنقید کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ اس کی وسعت کے پیش نظر اسے محدود نہیں کیا جا سکتا، نہ اسے نئے معنی پہنانے کی ضرورت ہے۔ یہ شاعرانہ احساس کی تمامتر بوقلمونی کا مظہر ہے۔

آخر میں اصطلاحوں کی بوالعجبی کو ظاہر کرنے والا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔ میرے ایک بزرگ دوست جو انگریزی واجبی سی جانتے ہیں، کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" پڑھنے کے بعد فرمانے لگے "کلیم الدین بس یہ کہتا ہے کہ تجربہ ہونا چاہیے!" اور تجربہ سے مراد ان کی زندگی کا عملی تجربہ تھا۔ میرے بزرگ دوست کی غلط فہمی کی وجہ یہی اصطلاحوں کی خصوصیت تھی۔ جو پہلی دفعہ ہمیشہ اپنا روایتی مفہوم ہی ذہن میں لاتی ہیں اور جب تک اس کی تشکیل کا پس منظر واضح نہ کیا جائے اجنبی اجنبی سی معلوم ہوتی ہیں۔ "شعری تجربہ" پہلے پہل اس خط نگار کو بھی ایسا ہی اجنبی محسوس ہوا تھا جب تک اس کے فلسفیانہ اور نفسیاتی پس منظر اور اس کی اصطلاحی ترکیب سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

قاضی صاحب کے نزدیک شعری تجربہ کی کوئی ایسی خصوصیت نہیں، جو اسے عضویاتی تبدیلیوں اور ذہنی تصویروں کے سلسلے سے ممیز کر سکے اس سلسلے میں گذارش ہے کہ پیغمبر اور شاعر دونوں آمد کے موقع پر کم و بیش عضویاتی تبدیلیوں سے دوچار ہوتے ہیں لیکن عامیوں کے برعکس وہ ان نفسی کیفیتوں کو با آہنگ اور موثر زبان میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی صلاحیت انہیں عامیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ شاعر ذہنی تصویروں کو لفظی تصویریں بنا سکتا ہے لیکن وہ صرف خاص خاص ذہنی تصویروں ہی کو اپنے لئے انتخاب کرتا ہے —— ایسی تصویریں جن کا بدل خارجی دنیا میں بھی مل سکے (تنقید کی زبان میں اس طریق کار کو معروضی پیکر OBJECTIVE CORRELATIVE کہتے ہیں) پچھلے پہر کا زرد رو چاند جو بے راز و نیاز آشنائی ہے، اقبال کی تنہائی اور افسردگی کی خارجی تصویر ہے۔

قاضی صاحب کے قول کے مطابق بعض مصور بغیر امیج کے بھی کامیاب تصویریں بنا لیتے ہیں۔ پھر شاعر کی بنائی ہوئی تصویروں کی کیا

خصوصیت ہے وہ بے صورت تصویر مصوری کی شکست ہے۔ یہ قوت کا فقدان ہے۔ شاعر لازمی طور پر ٹھوس بنانے کا عمل CRYSTALLISATION اختیار کرتا ہے تاکہ زندگی کے مجرد پہلو زیادہ سے زیادہ مجسم ہو کر سامنے آجائیں۔ دانتے نے "بیٹرس" کے حسن کی الوہیت کو اس طرح مجسم کیا ہے:

"اس کی آنکھوں کے پیچھے حسنِ الوہی ایسے جھلک رہا تھا جیسے کسی آئینے کے سامنے کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کے پیچھے ایک اور شخص دو روشن شمعیں لے کر کھڑا ہو جن کا عکس آئینے میں جھلک رہا ہو۔"

حسنِ الوہی ایک مجرد شے ہے۔ شاعر نے اسے زیادہ سے زیادہ مجسم کر کے دکھا دیا ہے۔

شعری تجربہ کی اصطلاح کو نئے معنی پہنانے کی ضرورت فی الحال تو محسوس نہیں ہوتی۔ علامت کی اہمیت کی طرف کولرج نے کوئی سو سال پہلے توجہ کی تھی، اور آج یہ لفظ دن میں بیسیوں دفعہ سننے میں آتا ہے یعنی کم و بیش سو سال سے استعمال ہو رہا ہے۔ شعری تجربہ بھی سمبل کی طرح بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ بھی کم از کم نصف صدی تو چلے گا، ممکن ہے کوئی نیا رچرڈز اسے کسی نئے مفہوم میں استعمال کرنے کی بنا ڈال دے۔ لیکن اس وقت تک ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔

سید جابر علی جابر (ملتان)

کچھ "فنون" ۱۰ کے بارے میں

عصمت چغتائی سے متعلق میں عرصہ چند سال سے اس تعصب کا شکار ہو چلا تھا کہ ان کی کہانی اپاہج ہوتی ہے اور زبان کی بیساکھیوں کے سہارے ہی چل پاتی ہے۔ "گھر والی" بڑی تندرست کہانی ہے اور اس کے جسم کا ہر حصہ برابر کام کرتا ہے۔ "یادِ من بیا" چونکہ ذہن کو ایک نہایت عمدہ مطالعہ کے لئے تیار کرتی ہے اس لئے اس توقع کے پورا نہ ہونے کے اسباب پا کر آخر میں مایوسی ہوتی ہے اور اشفاق احمد کو بخشنے کو جی نہیں چاہتا۔ اب تک میں نے جو افسانے پڑھے ہیں ان میں سے "چوتھے کھونٹ" بہترین لگا۔ حمیدہ رضوی کا ادراک بڑا ELUSIVE ہے اور ابلاغ بڑا ARRESTING۔ بہت پیاری کہانی ہے۔ — محمد خالد اختر کی "زندگی کی کہانی" ساری زندگی کی طوالت اختیار کر گئی ہے۔ اس طوالت سے یہ تو ضرور ہوا کہ کہانی کو مناسب ماحول مل گیا مگر اتنے بڑے ماحول میں یہ چھوٹی سی کہانی اور چھوٹی معلوم ہونے لگتی ہے۔ بہر حال کہانی کو پڑھتے ہوئے اسے پڑھتے چلے جانے کو جی چاہتا ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی کہانی "لال شہزادہ" میں بے مزہ ہو کر مزے سے پڑھتا رہا اور آخر میں جب نواب صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تو ان سے منہ موڑے میں بدستور ماشاء اللہ بیگم کی جانب تک رہا تھا۔ دراصل کہانی کے آخری دو پیراگراف میں نے پڑھے ہی نہیں۔

تمکنت کی "ابل پا پولے" گو ریڈیائی ڈرامے کے سین اتنے چھوٹے اور متنوع ہوں تو اسٹیج پر اس کی پیش کش مشکل بھی رہتی ہے اور کمزور بھی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ڈرامے کی تکمیل اسکرپٹ میں نہیں اسٹیج پر ہوتی ہے تو مصنف کو اسٹیج کے مسائل سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

اختلافات کا فورم بھی دلچسپ ہے۔ عنوان نے سب سے پہلے اسی کے پڑھنے کی ترغیب دی۔ اگر آپ اس پر "اتفاقات" کی تختی لگا دیتے تو ادب کی کوئی بھی سازش سمجھ کر شاید اس کے مطالعہ کو فرصت تک ٹال دیتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ادب میں اختلافات کی کافی گنجائش ہے۔

حرفِ اول میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے مستقل عنوانات میں افسانہ نگار کو بھی رکھ لیا ہے۔ آج کل بہت اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ ذمہ دار رسائل میں اس موضوع پر متواتر بات چیت سے اس صنف کے امکانات میں اضافہ ہوگا۔

آج بھی دو تین کہانیاں اس چٹھی کے بعد پڑھوں گا۔

جوگندر پال (اورنگ آباد)

"درد آشوب" پر تبصرہ

نقوش شمارہ (۹) میں "ادب کا ایک نیا مفسر" کے عنوان سے انور خواجہ کی تحریر شائع ہوئی ہے جس میں فتح محمد ملک کے مضمون "میراجی کی کتاب پریشان" اور تبصرۂ "درد آشوب" شائع شدہ نقوش شمارہ (۸) پر جس انداز میں تنقید کی گئی ہے اسے ادبی نہیں کہا جا سکتا۔ فی الوقت "درد آشوب" کے تبصرے اور تبصرے پر تنقید کے ضمن میں اظہار خیال مقصود ہے۔ فتح محمد ملک نے تبصرے کے ابتدائی حصے میں ترقی پسند تحریک کے کچھ انتہا پسند مبلغین کی متعصبانہ روش کا تذکرہ کیا ہے جو بہر حال جزوی طور پر مبنی بر صداقت ہے البتہ ان کا نقطۂ نظر منفی انداز کا حامل ہے۔ ترقی پسند تحریک نہ صرف تاریخ ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس تحریک نے ایک عظیم تخلیقی محرک کا کام بھی انجام دیا ہے اور چند انتہا پسندوں کا احتساب نظر انداز کرنے کے لائق ہے۔ اس سلسلے میں انور خواجہ کا خیال کہ ترقی پسند تحریک نظریے کے طور پر زندہ ہے اور اور زندہ رہے گی، بڑی حد تک درست ہے۔ فتح محمد ملک نے ترقی پسند ادیبوں کے زمرے میں سے ایک نظر انداز کئے جانے کے قابل اقلیت کے رویے کو کسوٹی بنا کر بحیثیت تنقید نگار خود اپنے مطالعۂ ادب میں الجھنیں پیدا کر لی ہیں لیکن اس ضمن میں انور خواجہ نے فتح محمد ملک کے چند فقروں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "احمد فراز بھی اسی فضا میں ان ہی نوجوانوں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے اور انجمن سے ہدایت کے طلبگار رہے مگر اپنے بیشتر ہم سفروں کے برعکس دوسری راہوں پر چلنے والوں کے اندازِ خرام سے بھی متاثر ہوتے رہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں حفیظ جالندھری، ن۔ م۔ راشد اور باقی صدیقی سے لے کر ناصر کاظمی تک سے گہرے اثرات قبول کرنے کی شہادتیں بہ آسانی مل سکتی ہیں۔"

اب ان ہی فقروں کو انور خواجہ نے جس انداز سے پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو:-

> "احمد فراز نے بھی اسی فضا میں آنکھیں کھولیں اور متاثر کس سے ہوئے حفیظ جالندھری، راشد، باقی صدیقی اور ناصر کاظمی سے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ترقی پسند نہیں۔ یہ خوب ہوا کہ ان کی شاعری تو ترقی پسندی کی فضا میں شروع ہوئی اور متاثر وہ غیر ترقی پسندوں سے ہوئے۔ بیان و تضاد ملاحظہ ہو، مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ان مذکورہ بالا شعرا میں ہر شاعر شعری اور فکری دونوں اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعی الگ ہے۔"

فتح محمد ملک نے یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ احمد فراز صرف مذکورہ بالا شعرا ہی سے متاثر ہوئے۔ ان کے فقروں سے تو صاف طور پر یہ عیاں ہوتا ہے کہ احمد فراز ترقی پسندوں سے متاثر اور منسلک ہونے کے باوجود ان ہم عصروں سے بھی متاثر ہوتے رہے ہیں جو ترقی پسندوں کے زمرے میں شامل نہ تھے۔ اس طرح بیان کے تضاد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہا "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" جیسے فقرے کے استعمال کا جواز تو اس کا کیا علاج کہ جہاں ادب میں سیاست اور گروہ بندی کا عمل دخل عام ہو وہاں غیر ادبی (غیر پارلیمانی) زبان کا استعمال ناگزیر ہو ہی جاتا ہے۔ انور خواجہ کا یہ استدلال کہ مذکورہ شعرا میں ہر شاعر شعری اور فکری دونوں اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اپنا وزن

دکھائی دیتا ہے کہ نہ صرف "تنہا تنہا" بلکہ "دردِ آشوب" میں بھی حفیظ جالندھری کے سوا مذکورہ بالا تمام شعراء کے اثرات کارفرما نظر آتے ہیں۔ جہاں تک تاثر پذیری کا تعلق ہے، یہ کوئی اٹل اصول یا کلیہ نہیں کہ ایک شاعر شعراء کے صرف ایسے گروہ سے متاثر ہو جو ایک ہی مکتبۂ فکر سے متعلق ہوں۔ ہم اپنے پیش رو یا معاصر شعراء سے فرداً فرداً بھی مختلف اثرات قبول کرتے ہیں۔ کسی شاعر کی زبان، کسی شاعر کی فکر، کسی کا لہجہ، کسی کا فن ہمیں کسی نہ کسی طرح متاثر کرتا ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ہم ایک کی زبان سے متاثر ہوں تو اس سے مختلف مکتبۂ فکر سے متعلق شاعر کی فکر سے متاثر نہ ہوں۔ اس سلسلے میں انور خواجہ کو مصحفی اور حسرت موہانی جیسے شعراء کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جو مختلف مکاتیب فکر و فن کے حامل شعراء سے اکتسابِ فیض کے سلسلے میں مثالی حیثیت کے حامل ہیں۔

فتح محمد ملک نے اپنے تبصرے میں "تنہا تنہا" کا ذکر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا:۔

"فراز کی ترقی پسندی مقامیت سے پھوٹتی ہے اور جہاں فراز نے مقبول احمد پوری کے بجائے دورِ اول کے ندیم کی روایت سے منسلک ہو کر وطن عزیز کی شمال مغربی سرحد پر بسنے والے کردار کی پیش کش سے مقامیت سے آفاقیت کا رنگ لینے کی کوشش کی۔"

انور خواجہ نے فتح محمد ملک کے اس پورے خیال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور صرف حیرانی کا شکار ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک ان کی معلومات درست ہیں کہ مقبول گیتوں کے شاعر ہیں لیکن چونکہ یہ معلومات صرف سنی سنائی تک محدود ہیں اس لئے وہ اس نکتے کو بھی نظر انداز کر گئے کہ فتح محمد ملک نے دورِ اول کے ندیم کی روایت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بعد مقامیت اور آفاقیت کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں احتیاط اور ادبی دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مقبول حسین احمد پوری کے کلام کا مطالعہ کرتے اور خاص طور پر ان کے ہاں جس انداز کا مقامی رنگ ملتا ہے اس کا تجزیہ کرتے اور پھر ندیم کے کلام میں مقامی رنگ کا جو انداز ہے اس کا تقابلی مطالعہ کرتے لیکن اس صورت میں شاید وہ اس حیرانی سے محروم ہو جاتے جس کا انھوں نے اپنی تنقید میں ذکر کیا ہے۔ ہمیں انور خواجہ کے اس فقرے سے حرف بہ حرف اتفاق ہے کہ ندیم کے ہاں کسی قسم کی بچھوری باتوں کی گنجائش نہیں لیکن ہمیں اس بات سے اتفاق نہیں کہ فراز کے کلام میں مقامی رنگ کی جو جھلکیاں پائی جاتی ہیں ان کا تقابلی مطالعہ ندیم اور مقبول کے کلام میں پائے جانے والے مقامی رنگ سے کرنا کسی قسم کی بچھوری بات ہے۔ شعر و ادب میں تقابلی مطالعہ بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ اور اس کو محض نیتوں کے فتور کی بنا پر بچھورپن قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انور خواجہ خود ہی آگے چل کر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے چند ایسے فقروں کو پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں جن میں وہ تقابلی مطالعہ کی اہمیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے انور خواجہ کی "تنقید" کے ان نکات پر غور کیا ہے جن کو انھوں نے فتح محمد ملک کے تبصرے سے اختلاف کرنے کے ضمن میں خود ہی پیش کیا تھا۔ اب ہمیں ان دونوں اصحاب کے اختلاف کے بنیادی نکتے پر غور کرنا ہے۔ انور خواجہ فرماتے ہیں :۔

"فراز کو اکتسابِ فیض کے جرم میں ضیا جالندھری کے حوالے سے تقلیدی کہہ دینا بددیانتی نہیں، ایک سازش ہے جس کی ابتدا ضیا جالندھری کی اس تقریر سے ہوئی جو "دردِ آشوب" پر تبصرے کے طور پر ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے نشر ہوئی۔ اصل میں ضیا جالندھری نے بھی اپنی کتاب آدم جی ادبی انعام کے لئے بھیجی تھی۔ انعام فراز کو مل گیا۔ اب یہ جلن تو فطرتی تھی سو اس کا بخار انھوں نے فراز کی شاعری کو تقلیدی کہہ کر نکال لیا۔ فتح محمد ملک نے ان کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہی اور ایسا شاندار تبصرہ لکھا کہ ضیا کا دل باغ باغ ہو گیا ہو گا۔"

ہمارے سامنے ضیا جالندھری کا ریڈیو پاکستان والا تبصرہ نہیں ہے چنانچہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ضیا کو آدم جی ادبی انعام سے محروم ہونے کے سبب سے جلن ہوئی یا وہ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ ہمیں اس سازش کے الزام سے بھی کوئی سروکار نہیں کیونکہ کسی ناقد یا شاعر کا کسی اور شاعر یا ناقد کو تقلیدی ٹھہرانا ادر کسی اور ناقد کا اس خیال سے اتفاق کرنا ضروری نہیں کہ سازش یا بد دیانتی کے اسباب کی بنا پر ہو۔ انور خواجہ کو اس ضمن میں کچھ زیادہ وتحمل کا ثبوت دینا چاہیے تھا کیونکہ اس تمام غیظ وغضب کے عقب میں ایک اعتذارانہ ذہنیت کارفرما معلوم ہو رہی ہے۔ "تقلیدی" کی اصطلاح سے اس طور پر خوف کھانا بھی ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے جبکہ ہم جگت استاد تسلیم کرتے ہیں اور تقلیدی رنگ کے باوجود اس کی عظمت کے معترف بھی ہیں۔

فتح محمد ملک نے فراز کی انفرادیت کو بحسن و خوبی اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ یہ بھی کہا ہے کہ:۔

"دردِ آشوب" میں فراز کا احساسِ جمال اور احساسِ لذت پہلے سے زیادہ نکھرا ستھرا بھی ہے اور رنگا رنگ بھی ہے۔ اقتصادی اور سیاسی استحصال کو موضوعِ سخن بناتے وقت بھی ان کی آواز اب اجتماعی سے زیادہ انفرادی لہجہ ڈھونڈتی نظر آتی ہے"

جہاں تک ہم نے "دردِ آشوب" کا مطالعہ کیا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فراز کی انفرادیت کا تعلق اس کے لہجے اور آہنگ ہی سے ہے۔ شدید تاثر کا نتیجہ عام طور پر تقلید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن ایک اچھا شاعر تقلید کے باوصف اپنی انفرادیت کو کس طرح سنبھالتا ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں فراز کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے جس میں فتح محمد ملک کے اس ستائشی نعرے کے ثبوت جگہ جگہ موجود ہیں کہ فراز کی انفرادیت کا تعلق اس کے لہجے اور آہنگ ہی سے ہے۔

عبداللہ جاوید (خیرپور میرس)

ادب کا نیا مفسّر

میں "فنون" کا مستقل قاری ہوں۔ "فنون" کا ہر شمارہ دلچسپی سے پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا ہوں لیکن شمارہ ۵ میں ایک مضمون پڑھ کر سخت کوفت ہوئی ہے اس مضمون کو پڑھ کر میرے لئے ممکن نہیں رہا کہ آپ کو اپنے تاثرات سے آگاہ نہ کروں۔

اس شمارے میں انور خواجہ کا مضمون بعنوان "ادب کا نیا مفسّر" پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر کوئی شخص، بلندی کی طرف جاتے ہوئے کسی شریف انسان کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کر رہا ہو تو دیکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ اس سے کم از کم یہ تو پوچھے کہ "میاں یہ کیا حرکت ہے۔ اس بھلے آدمی کا کیا قصور ہے کہ اس کی ٹانگ کھینچتے ہو؟"

انور خواجہ نے معرکے میں فتح مند اور مظفر ہونے کے بعد آخر میں اس واحد رعایت سے قارئین کو نوازا ہے کہ "ادب تو ایک جمہوریت ہے" اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اس سلسلے میں میں بھی کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔

انور خواجہ نے شروع میں ہی واضح کر دیا ہے کہ ترقی پسند تحریک، ایک "عظیم ادبی تحریک" تھی اور اس نے عظیم شاعر، افسانہ نگار اور نقاد پیدا کئے۔ اس کے برعکس اسلامی ادب کی تحریک ایک "سرکاری اور سیاسی نعرہ" ہے —— انور خواجہ کے "اختلافات" کا پس منظر ان کا یہی نظریاتی سانچہ ہے۔

فتح محمد ملک، نظریاتی اعتبار سے اسلامی، اندازِ فکر کے حامل ہیں۔ چنانچہ ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی ان کا یہ اندازِ فکر، ذہنی پس منظر کے طور پر کام کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مختلف شاعروں اور ادیبوں کے ہاں پائے جانے والے اسلامی افکار کا رشتہ (بجا طور پر) فکرِ اقبال سے استوار

کرتے ہیں، مگر انور خواجہ کو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، اسلامی فکر کے بجائے ترقی پسند تحریک کی اشتراکی فکر زیادہ مرغوب ہے۔ اسی لیے انھوں نے فتح محمد ملک کو ہدف ملامت بنایا ہے۔

انور خواجہ کہتے ہیں کہ فتح محمد ملک نے اسلامی ادب کا نعرہ اس لیے لگایا ہے کہ یہ "ایک سرکاری اور سیاسی نعرہ ہے اور اس نعرے کو مقبول بنانے والے ادیبوں نے سرکاری عہدے، محکمہ اطلاعات کی ملازمتیں، انعامات اور وظائف پائے" ـــــ کسی کو سرکاری مقاصد کا آلہ کار قرار دینا اس پر الزام تراشی اور اُسے بدنام کرنے کا نہایت سستا اور سہل نسخہ ہے (اگرچہ پٹا ہوا اور ناکام)۔ مگر انور خواجہ سے یہ پوچھنا تو یقیناً جمہوریت کے منافی نہیں ہوگا کہ محکمہ اطلاعات اور دیگر سرکاری ملازمتوں میں، پریس ٹرسٹ کی ملازمتوں میں اور مختلف النوع انعامات اور وظائف پانے والے ادیبوں میں ترقی پسند تحریک سے (ماضی میں) متعلق رہنے والوں اور اسلامی ادب کا "نعرہ" لگانے والوں کا کیا تناسب ہے؟

انور خواجہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فتح محمد ملک میں "تخلیق کا مادہ تو تھا نہیں کہ شاعر یا ادیب بن سکتے چنانچہ نقاد بنے" ـــــ میرے خیال میں اگر انور خواجہ کا کسی مغربی نقاد سے مستعار لیا ہوا یہ قول، ایک کسوٹی کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ (یعنی ناکام شاعر یا ادیب، ناقد بن بیٹھتے ہیں) تو پھر یہ ایک عمدہ ہتھیار ہے ہر اُس ناقد پر حملہ کرنے کا، جو صرف تنقید لکھ رہا ہے ـــــ مثلاً ہم بلا تامل دعویٰ کر سکتے ہیں کہ سید وقار عظیم اور احتشام حسین میں تخلیق کا مادہ نہیں اور چونکہ وہ افسانہ نگاری اور شاعری میں نہیں چل سکے اس لیے نقاد بن بیٹھے ـــ انور خواجہ کے پاس اپنے قائم کردہ معیار کی روشنی میں یقیناً ایسے لوگوں کی لمبی لسٹ ہوگی جو تخلیقی صلاحیتوں کے بغیر تنقید لکھ رہے ہیں ـــــ میری رائے ہے کہ ان تمام ناقدوں کو (جو فتح محمد ملک کی طرح صرف تنقید لکھ رہے ہیں) چاہیے کہ وہ اپنی فرصت اولین میں نظمیں یا افسانے لکھ کر چھپوائیں اور اس طرح اپنے نام انور خواجہ کی فہرست سے خارج کرا کے ان سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں۔ ورنہ آج نہیں تو کل انور خواجہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا یوں کھول دیں گے۔ انھیں فتح محمد ملک کے حشر سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

انور خواجہ نے فتح محمد ملک پر "پروفیسر نقاد" کی پھبتی چست کی ہے اور کسی نقاد کا مقولہ دُہرایا ہے کہ "پروفیسر نقادوں سے ہشیار رہو" ـــــ مگر مشکل یہ ہے کہ انور خواجہ نے ترقی پسند تحریک کے ضمن میں جن چار عظیم نقادوں کے نام گنوائے ہیں۔ ان میں سے تین اتفاق سے "پروفیسر نقاد" ہیں، اب قاری کی الجھن یہ ہے کہ وہ کس کس سے ہشیار رہے ـــ اُردو نقادوں سے (جن کی اکثریت پروفیسر ہے) یا انور خواجہ سے جو ناقدوں کے ناقد بن بیٹھے ہیں۔

انور خواجہ کو شکوہ ہے کہ "بہت سے نقاد ماضی کی حیوانی اقدار کو واپس لانا چاہتے ہیں" معلوم انھیں یہ الہام کیوں کر ہوا اور خدا جانے (بقول انور خواجہ) "حیوانی اقدار" کے مدعی کون سے "بہت سے نقاد" ہیں۔ تاہم اگر انور خواجہ کو اس قماش کے نقادوں کا علم ہو تو انھیں سائبیریا بھیجنے کی سفارش ہم بھی کریں گے کیونکہ انسان کو محض حیوانی جبلتوں کے تابع کرنے اور اس سے اس کی تہذیب و شائستگی چھین لینے والوں کے لیے سائبیریا سے زیادہ موزوں، مناسب اور بہتر مقام اور کوئی نہیں ہے۔

انور خواجہ نے اس کے بعد فتح محمد ملک کے مضامین ـــ مختار صدیقی کا "فردِ آشوب"، میراجی کی کتاب پریشاں، "دردِ آشوب" پر تبصرہ ـــ پر اعتراضات کیے ہیں ـــ مگر ان میں نقطۂ نظر کے اختلاف سے زیادہ فتح محمد ملک کو کسی نہ کسی بہانے ہدفِ تنقید بنانے کی کوشش کی ہے ـــ ان کے خط کا عنوان (ادب کا ایک نیا مفسر) بھی یہی تاثر دیتا ہے کہ انھیں فتح محمد ملک کی آرا سے زیادہ ان کی ذات سے اختلاف (یا مخالفت) ہے ـــ ایسے میں ان کے "اختلافات" کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ابتدا میں انھوں نے جو چند ایک باتیں کی ہیں، میں نے ان کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی (سرگودھا)

یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی



جلوۂ حسن کا ہر چند اثر پڑتا ہے
پاس جاتا ہوں تو کچھ اور نظر پڑتا ہے

بے گناہوں کو بھی پامال کیے ڈالتے ہو
پاؤں رکھتے ہو کہاں اور کدھر پڑتا ہے

لڑکھڑاتی ہیں زبانیں سرِ محفل کیا کیا
تمھیں دیکھو جو مری چپ کا اثر پڑتا ہے

تو سہی پھونک دوں یہ پاپ کی بستی ساری
کیا کہوں بیچ میں اک آپ کا گھر پڑتا ہے

فکرِ فردا وہ بلا ہے کہ یگانہ صاحب
سوکھنے لگتا ہے دم، سایہ اگر پڑتا ہے

(نصیر ترابی کے شکریے کے ساتھ)

سید عابد علی عابد



بہار آئی ہے، زخمِ جگر کا نام تو لو
کوئی بہانہ ہو، اہلِ ہنر کا نام تو لو

ڈرا چکے ہو، نصیحت گرو، بہت مجھ کو
چلو اب اس بُتِ بیداد گر کا نام تو لو

درست، اس کے یہاں نارسا ہے عرضِ وفا
فغاں کی بات تو چھیڑو، اثر کا نام تو لو

فسانۂ شبِ فرقت میں، بر سبیلِ کلام
فریب دے کے نگارِ سحر کا نام تو لو

حواس اڑ گئے اے ساتھیو، کہاں پہنچے
نشانِ راہ کا، گردِ سفر کا نام تو لو

تبسّمِ لبِ لعلیں کی دیکھنا ہو بہار
تو بزمِ یار میں تم چشمِ تر کا نام تو لو

جہاں چمن میں غزل خواں ہیں بلبلانِ اسیر
وہاں مرے نفسِ شعلہ گر کا نام تو لو

خفا ہے مجھ سے جو وہ پردہ دارِ حجرۂ ناز
مجھے خبر بھی نہیں، پردہ در کا نام تو لو

بغیر بحث بھی کٹتی ہے آج کل تو زباں
اگر کا ذکر تو چھیڑو، مگر کا نام تو لو

معین احسن جذبی



کیا جانئے ذوق و شوق کے بازار کیا ہوئے
یوسف پکارتا ہے، خریدار کیا ہوئے
گستاخئ نگاہِ تمنّا کدھر گئی
تعزیرِ درد کے وہ سزاوار کیا ہوئے
صبر آزما وہ شوقِ نظارہ کہاں گیا
آسودگانِ سایۂ دیوار کیا ہوئے
ہر سانس بوئے بادہ، نہ ہر گام لغزشیں
جانے وہ محتسب کے گنہگار کیا ہوئے
دے تو کوئی تبسّمِ دوراں کو پھر جواب
وہ میرے درد و غم کے طرفدار کیا ہوئے
تھا جن کے پاس زخم کا مرہم، کہاں گئے
جو دل کو جوڑتے تھے، وہ معمار کیا ہوئے
ڈھونڈو تو کچھ ستارے ابھی ہوں گے عرش پر
دیکھو تو وہ حریفِ شبِ تار کیا ہوئے
دھوکا نہ تھا نظر کا تو پھر اے شبِ دراز!
وہ ہلکے ہلکے صبح کے آثار کیا ہوئے

جذبی کہاں گئیں وہ تری دل فریبیاں
ڈوبے ہوئے وہ سوز میں اشعار کیا ہوئے

قتیل شفائی



دور تک چھائے تھے بادل اور کہیں سایا نہ تھا
اس طرح برسات کا موسم کبھی آیا نہ تھا

سرخ آہن پر ٹپکتی بوند ہے اب ہر خوشی
زندگی نے یوں تو پہلے ہم کو ترسایا نہ تھا

کیا مِلا آخر تجھے سایوں کے پیچھے بھاگ کر
اے دلِ ناداں، تجھے کیا ہم نے سمجھایا نہ تھا

اُف یہ سناٹا کہ آہٹ تک نہ ہو جس میں مخل
زندگی میں اس قدر ہم نے سکوں پایا نہ تھا

خوب روئے چھُپ کے گھر کی چار دیواری میں ہم
حالِ دل کہنے کے قابل کوئی ہمسایا نہ تھا

ہو گئے قلاش جب سے پیار کی دولت لٹی
پاس اپنے اور تو کوئی بھی سرمایا نہ تھا

وہ پیمبر ہو کہ عاشق، قتل گاہِ شوق میں
تاج کانٹوں کا کسے دنیا نے پہنایا نہ تھا

اب کھُلا جھونکوں کے پیچھے چل رہی تھیں آندھیاں
اب جو منظر ہے وہ پہلے تو نظر آیا نہ تھا

صرف خوشبو کی کمی تھی غور کے قابل قتیلؔ
ورنہ گلشن میں کوئی بھی پھول مرجھایا نہ تھا

قتیل شفائی

○

رنگ جدا، آہنگ جدا، مہکار جدا
پہلے سے اب لگتا ہے گلزار جدا

نغموں کی تخلیق کا موسم بیت گیا
ٹوٹا ساز تو ہو گیا تار سے تار جدا

بیزاری سے اپنا اپنا جام لیے
بیٹھا ہے محفل میں ہر میخوار جدا

ملا تھا پہلے دروازے سے دروازہ
لیکن اب دیوار سے ہے دیوار جدا

یارو، میں تو نکلا ہوں جاں بیچنے کو
تم سوچو اب کوئی کاروبار جدا

سوچتا ہے اک شاعر بھی اک تاجر بھی
لیکن سب کی سوچ کا ہے معیار جدا

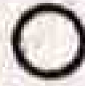
کیا لینا اِس گرگٹ جیسی دُنیا سے
آئے رنگ نظر جس کا ہر بار جدا

اپنا تو ہے ظاہر و باطن ایک مگر
یاروں کی گفتار جدا، کردار جدا

مل جاتا ہے موقع خونی موجوں کو
ہاتھوں سے جب ہوتے ہیں پتوار جدا

کس نے دیا ہے سدا کسی کا ساتھ قتیل
ہو جاتا ہے سب کو آخر کار جدا

باقی صدیقی



اس کارگہِ رنگ میں ہم تنگ نہیں کیا
جو سر پہ لگا ہے ابھی وہ سنگ نہیں کیا

تصویر کو تصویر دکھائی نہیں جاتی
اس آئینہ خانے میں نظر دنگ نہیں کیا

ہر بات پہ ہم دیتے ہیں غیروں کا حوالہ
اپنا کوئی آہنگ، کوئی رنگ نہیں کیا

بخشے ہوئے اک گھونٹ پہ ہم جھوم رہے ہیں
اب مانگ کے پینا ابھی کوئی ننگ نہیں کیا

ہے حلقۂ جاں اپنی وفاؤں کا تصور
اس دائرے سے آگے کوئی فرسنگ نہیں کیا

زخمِ دلِ بیتاب ہے ہاتھوں میں نوالہ
اس بات پہ دنیا سے مری جنگ نہیں کیا

وہ رنگ نہیں شعلۂ احساس میں باقیؔ
ہم سازِ تمنا سے ہم آہنگ نہیں کیا

ناصر کاظمی



جرمِ اُمید کی سزا ہی دے
میرے حق میں بھی کچھ سُنا ہی دے
عشق میں ہم نہیں زیادہ طلب
جو ترا نازِ کم نگاہی دے
تجھ کو ملنا اگر نہیں منظور
عالمِ خواب میں صدا ہی دے
تُو نے بنجر زمیں کو پھول دیے
مجھ کو اک زخمِ دلکشا ہی دے
بستیوں کو دیے ہیں تُو نے چراغ
دشتِ دل کو بھی کوئی راہی دے
عمر بھر کی نواگری کا صلہ
اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے
زرد رُو ہیں ورق خیالوں کے
اے شبِ ہجر کچھ سیاہی دے
گر مجالِ سخن نہیں ناصر
لبِ خاموش سے گواہی دے

فارغ بخاری



فصلِ جنوں جو چمکی تو پتھّر بھی آئیں گے
ہم پر بھی اور شیشہ گروں پر بھی آئیں گے

بیداریوں کی سیج پہ کروٹ بدل کے دیکھ
کتنے ہی اور خواب کے منظر بھی آئیں گے

یہ اور بات ہے کہ کوئی تشنہ لب رہے
محفل میں مے بھی آئے گی ساغر بھی آئیں گے

کوہِ ندا کی سمت بڑھے جا رہے ہیں جو
ان جانی منزلوں سے پلٹ کر بھی آئیں گے

رُت ہے یہی تو جسم کی دیوار توڑ کر
اندر جو زلزلے ہیں وہ باہر بھی آئیں گے

جو ڈوبتے ہیں، ڈوب بھی جائیں تو غم نہیں
ان گہرے پانیوں کے شناور بھی آئیں گے

ظہور نظر



چھوڑ کر دل میں گئی وحشی ہوا کچھ بھی نہیں
کس قدر گنجان جنگل تھا، رہا کچھ بھی نہیں

خاکِ پائے یار تک گیلی ہوا نے چاٹ لی
عشق کی غرقاب بستی میں بچا کچھ بھی نہیں

آبنائے درد کے دونوں طرف ہے دشتِ خوف
اب تو چارہ جان دینے کے سوا کچھ بھی نہیں

حال کے زنداں سے باہر کچھ نہیں جز دودِ مرگ
اور اس زنداں میں بجز زنجیرِ پا، کچھ بھی نہیں

ہجر کے کالے سمندر کا نہیں ساحل کوئی
موجۂ طوفانِ دہشت سے ورا کچھ بھی نہیں

کاسۂ جاں ہاتھ میں لے کر گئے تھے ہم وہاں
لائے اُس در سے بجز خونِ صدا کچھ بھی نہیں

شہرِ شب میں کون سا گھر تھا، نہ دی جس پہ صدا
نیند کے اندھے مسافر کو ملا کچھ بھی نہیں

عمر بھر عمرِ گریزاں سے نہ میری بن سکی
جو کہے کرتی رہے، میں پوچھتا کچھ بھی نہیں

ہاتھ میرا، اے مری پرچھائیں! تو ہی تھام لے
ایک مدت سے مجھے تو سوجھتا کچھ بھی نہیں

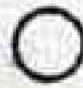
رات بھر اک چاپ سی پھرتی رہی چاروں طرف
جان لیوا خوف تھا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں

وہ بھی شاید رو پڑے ویران کاغذ دیکھ کر
میں نے اُس کو آخری خط میں لکھا کچھ بھی نہیں

دولتِ تنہائی بھی آنے سے تیرے چھن گئی
اب تو میرے پاس اے جانِ وفا کچھ بھی نہیں

دل پہ لاکھوں لفظ کندہ کر گئی اُس کی نظر
اور کہنے کو ابھی اُس نے کہا کچھ بھی نہیں

سلیم احمد



منزلِ بے جہت کی خیر، سعیٔ سفر ہے رائیگاں
اہلِ وفا کے قافلے پھر بھی تو ہیں رواں دواں
اپنی حدودِ ذات سے اپنی ہی سمت ہوں رواں
آپ ہی میرِ کارواں، آپ ہی گردِ کارواں
زہر ہے میرے جام میں، ہونٹوں پہ آ گئی ہے جاں
پھر بھی مجھے حیات پر تیرے کرم کا ہے گماں
دہر پہ میں کھلا نہیں، مجھ کو خدا ملا نہیں
آپ ہی اپنا راز ہوں، آپ ہی اپنا رازداں
حسن کا چھو کے دیکھنا، آگ تھا موم کے لیے
روح پگھل کے رہ گئی، عقل ہوئی دھواں دھواں
وہ بھی تو ہیں کہ زندگی جن کی ہے شہد و انگبیں
ذائقۂ حیات سے اینٹھ گئی مری زباں
گوشِ گلِ بہار میں کس نے کہا ہے حرفِ شوق
کون ہے میرا ترجماں، کس کو ملی مری زباں
جلوۂ بے حجاب سے روح کو شاد کام کر
اے کہ تری خزاں بھی ہے رشکِ بہارِ دیگراں
روح کی تہ میں ہے ابھی ایک وہ موج درد کی
جس کے سرور و کیف سے یاس میں بھی ہوں نغمہ خواں

شاذ تمکنت

○

وہ وقت ہے مجھ پر جو کسی پر نہیں آیا
اللہ کہاں ہے، وہ پلٹ کر نہیں آیا

چپ چاپ کھڑا تھا درِ مجبوری پہ کوئی
تو پردۂ مجبوری سے باہر نہیں آیا

دنیا نے مجھے پشت سے دیکھا تو گلہ کیا
میں آئینہ تھا، میرا سکندر نہیں آیا

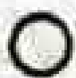
اپنے سے شکایت تھی، زمانے سے گلہ تھا
جینے کا سلیقہ مجھے اکثر نہیں آیا

تعبیر تھی، ہر بار مرے سامنے آئی
اک خواب تھا آنکھوں میں مکرر نہیں آیا

کیا منظرِ رخصت کا دھواں ہے کہ ابھی تک
آنکھوں میں کوئی دوسرا منظر نہیں آیا

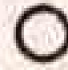
اے چشمۂ خورشیدِ تمنا، ترے صدقے
کیوں شام ڈھلے شاذ ابھی گھر نہیں آیا

ظفر اقبال



سو بھی تمام گرمیٔ بازار کا بدن
یاقوت لب پہ گوہرِ گفتار کا بدن
ہر شام دائرے سے بناتا ہے میرے گرد
اُس جسمِ جاں گداز کے اسرار کا بدن
چمکے گا پھر ہوائے بیاباں کی رات میں
ریگِ ہوس پہ وعدۂ دیدار کا بدن
دل میں گھلا ہے ٹوٹتی رانوں کا زہرِ زرد
پگھلا ہے سر میں صبح کے آثار کا بدن
پھیلے ہوئے ہیں کائی زدہ لفظ ہر طرف
ہے درمیاں میں حسرتِ اظہار کا بدن
پھرتا ہے گرد باد کی صورت کہاں کہاں
دل کی فضا میں خاکِ خبردار کا بدن
آغازِ شیشہ رنگ، تمنا کی ابتری
پانی کا پھول، عکسِ گرفتار کا بدن
دریا تو اپنا آپ ہے، کیسے عبور ہو
بیشک پکارتا رہے اُس پار کا بدن
مخفی ہے اُس کی رمز بدن در بدن ظفرؔ
انکار کے بدن میں ہے اقرار کا بدن

سرور بارہ بنکوی



کبھی اپنے عشق پہ تبصرے، کبھی تذکرے رُخِ یار کے
یونہی بیت جائیں گے یہ بھی دن، جو خزاں کے ہیں نہ بہار کے

یہ طلسمِ حسنِ خیال ہے کہ فریبِ فصلِ بہار کے
کوئی جیسے پھولوں کی آڑ میں ابھی چھپ گیا ہے پکار کے

سیو چاکِ دامن و آستیں کہ وہ سرگراں نہ ہو پھر کہیں
یہی رُت ہے عشرتِ دید کی، یہی دن ہیں آمدِ یار کے

ابھی اور ماتمِ رنگ و بو کہ چمن کو ہے طلبِ نمو
ترے اشک ہوں کہ مرا لہو، یہ امیں ہیں فصلِ بہار کے

صہبا اختر



ایک اندوہِ بے قیاس میں ہوں
آگ ہوں، خاک کے لباس میں ہوں

فطرتِ حسن ہے غرور پسند
اور مَیں عرض و التماس میں ہوں

دُور آبِ فراتِ فن ہے ہنوز
کربلائے سخن کی پیاس میں ہوں

کیا سکونت سرائے فانی کی
ایک تعمیرِ بے اساس میں ہوں

کوئی سُنتا تو قدر بھی کرتا
ایک صحرائے ناسپاس میں ہوں

شمعِ امید ہوں مگر صہبا
بند فانوسِ رنج و یاس میں ہوں

جاوید شاہین



یہ جاں گداز سفر دامِ خواب ہو نہ کہیں
رواں ہے جس میں سفینہ، سراب ہو نہ کہیں

یونہی اُترتا نہ جا سرد گہرے پانی میں
چمکتا ہے جو بہت، سحرِ آب ہو نہ کہیں

کھڑا جو جھانکتا ہے کب سے گرم کمروں میں
گلی میں ٹھٹھرا ہوا ماہتاب ہو نہ کہیں

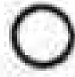
ہوا یہ کون سی چلتی ہے آر پار مرے
کھُلا ہوا کسی خواہش کا باب ہو نہ کہیں

دلوں پہ کیوں نہیں کرتیں اثر تری باتیں
زمیں تو ٹھیک ہے، پانی خراب ہو نہ کہیں

غبار سے بھری بوجھل فضا ہے دل پہ محیط
گرج رہا ہے جو سر میں، سحاب ہو نہ کہیں

سجائے پھرتا ہے جس کو وہ کوٹ پر شاہیںؔ
مرے ہی خوں کا مہکتا گلاب ہو نہ کہیں

جلیل حشمی



شمع سی کلائی پر سائے سرخ گجروں کے
زندگی! یہ تیری دھوپ اور رُوپ رنگوں کے

اپنی اپنی لَو لے کر ہر کوئی روانہ تھا
رات میں نے دیکھے ہیں، قافلے ستاروں کے

مرثیے مسیحا کے سانس سانس میں گونجیں
سُولیاں دکھائی دیں اب تو سائے لفظوں کے

ہم پتنگ ہوں جیسے، ڈور اور ہاتھوں میں
دیکھتے ہیں اُوپر سے، رنگ ہم زمینوں کے

بال مہرِ شب کے دُور دُور پھیلے ہیں
کوئی کیسے نکلے گا شہر سے، صلیبوں کے

سنگ کر گیا ہم کو اپنے گھر کا سناٹا
منتظر پڑے ہیں اب دُور کی صداؤں کے

ہولے ہولے پلکوں پر روشنی اُترتی ہے
میرے دل میں روشن ہیں وہ چراغ چہروں کے

شام کے شُبک سائے دلنواز پھولوں پر
یاد آ گئے اے دل نام کتنے پیاروں کے

اپنی بات کب سوچوں، آشنا ہیں سب، سوچوں
اتنے غم ہیں اوروں کے، کام اتنے لوگوں کے

خلیل رامپوری



برف پتّوں پر جمی ہے، جسم جلتا ہے مرا
کوئی منظر دیکھ لوں تو دل پگھلتا ہے مرا

ذہن سوچوں کے نگر میں گم ہے، خامہ ہاتھ میں
دیکھئے احساس کس پیکر میں ڈھلتا ہے مرا

شعر وہ پڑھتا ہے لیکن دیکھتے ہیں مجھ کو لوگ
جیسے اس قندیلِ فن میں تیل جلتا ہے مرا

جھانکتا ہے چاند جب کمرے میں، روشندان سے
کیا کہوں وہ کون ہے جو دل مسلتا ہے مرا

زندگی دنیا نہ دنیا یہ اُسی کے ہاتھ ہے
اپنی شہرت کے لئے وہ دل بدلتا ہے مرا

بولتے چہروں کی صحبت چاہئے مجھ کو خلیلؔ
جی کہیں سادہ لفافوں سے بہلتا ہے مرا

بشیر احمد بشیر



یادوں میں بسا کے چاہتوں کو
سینے سے لگا لیا دُکھوں کو

کس طور جدا جدا کروں میں
سوچوں کی اُلجھتی ڈوریوں کو

کس طرح زمین پر گرا دوں
پلکوں پہ دمکتے آئینوں کو

اب نام ترا لکھوں کہ دیکھوں
اینٹوں پہ کھدی عبارتوں کو

تو سنگ تھا، آئینہ تھا، کیا تھا
کیا دوں میں جواب ہمدموں کو

کس دل سے کیا قبول تو نے
بے مہر کٹھور دُوریوں کو

یہ کس کے لکھے ہیں قول و اقرار
لے جاؤں کہاں ترے خطوں کو

پھر لَوٹ کے آسکے تو آ دیکھ
بستی کے اُداس راستوں کو

جُز اپنے، بشیر کون سمجھے
حرفوں میں چھپی حکایتوں کو

جعفر شیرازی



کہیں لگی آنکھیں بھی دل غم سے چُور کتنا ہے
پڑے نہ مینہ تو گھٹا کا قصور کتنا ہے

کوئی کوئی ہے رُتوں کے مزاج سے واقف
ہوا کو کیا کہ درختوں پہ بُور کتنا ہے

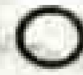
یہ فرقتوں کی تھکن، یہ اُداسیوں کے سفر
وہ مجھ سے دور ہُوا ہے تو دُور کتنا ہے

وہ جانتا ہی نہیں، اور کئی تمنائیں
ترے دماغ میں، اے دل، فتور کتنا ہے

ہے میرے دل میں مگر اک جہاں پہ روشن ہے
تمہارے درد کے شعلے میں نور کتنا ہے

چھپا کے دل میں رکھوں تو اگر ملے جعفرؔ
یہ تجھ میں، تیری غزل میں، سرُور کتنا ہے

سیف زلفی



اشکوں میں قلم ڈبو رہا ہے
فن کار جوان ہو رہا ہے

مقتل کے دکھا رہا ہے منظر
کاغذ کو لہو سے دھو رہا ہے

ظالم کو سکھا رہا ہے انصاف
پتھر میں درخت بو رہا ہے

پربت سے لڑا رہا ہے آنکھیں
مٹی سے طلوع ہو رہا ہے

ہاری ہوئی رات کا سویرا
غنچوں کی جبیں بھگو رہا ہے

ذرّے کو بنا کر ایک قوت
خود اپنا وقار کھو رہا ہے

لوہے کو اجل کی دھار دے کر
خود اس کا شکار ہو رہا ہے

محلوں میں نہیں کسی کو آرام
فٹ پاتھ پہ کوئی سو رہا ہے

چھوتا نہیں ڈر سے پھول کوئی
کانٹوں کو کوئی پرو رہا ہے

خنداں ہیں گلی گلی ستارے
گھر گھر کا چراغ رو رہا ہے

سینے میں کوئی خیال زلفیؔ
سوئیاں سی چبھو چبھو رہا ہے

سیف زلفی



اک شخص بغور تک رہا ہے — مہتاب سے خوں ٹپک رہا ہے
زخموں سے لہو لہو ہوں لیکن — پھولوں سا بدن مہک رہا ہے
گم سُم ہوں سیاہ جنگلوں میں — جگنو سا مگر چمک رہا ہے
صیاد بٹھا رہا ہے پہرے — دل ہے کہ چہک چہک رہا ہے
بیتے ہُوئے موسموں کا کانٹا — سانسوں میں ابھی کھٹک رہا ہے
ننھا سا پرندہ روح جیسا — پنجرے میں پھڑک پھڑک رہا ہے
اس دور کا ہر جوانِ رعنا — بچوں کی طرح بلک رہا ہے
نیزے پہ چڑھا ہے سر کسی کا — سُولی پہ کوئی لٹک رہا ہے
قاتل ہے کسی کا کاسۂ سم — زنداں میں کوئی سسک رہا ہے
پوچھیں بھی تو کس سے راہ پوچھیں — ہر شخص یہاں بھٹک رہا ہے
طوفانِ بلا میں ہے سفینہ — آندھی میں دیا بھڑک رہا ہے
اگلے گی زمیں اجل کا لاوا — ہر سمت مواد پک رہا ہے
زلفی کے سُنو نہ شعر یارو
شاعر ہے، جنوں میں بک رہا ہے

گوہر ہوشیارپوری



ہُوا گداز تو طرفِ الم گداز کیسا تھا
ستم ظریف کوئی بے نیاز کیسا تھا

بنامِ خیر — بعنوانِ مصلحت ہی سہی
جہاں میں سلسلۂ شر دراز کیسا تھا

ہزار منزلِ کشف و کشود سے گذری
یہ دھن کہ خود وہ سراپائے راز کیسا تھا

اُسے خود آپ گوارا ہُوئی نہ یکتائی
نہیں تو خلقِ بشر کا جواز کیسا تھا

بہرِ حجاب صنم گر کے سامنے ہے صنم
غریقِ رمزِ حقیقت مجاز کیسا تھا

سوال کیا، روشِ اہلِ ناز کیسی تھی
یہ دیکھ عالمِ شوق و نیاز کیسا تھا

کشیدگی میں بھی وابستگی کے پہلو سے
سلوک سادہ پسِ احتراز کیسا تھا

مِلا تو سارے سفر کی تھکن اُتار گیا
وہ اجنبی — وہ مسافر نواز کیسا تھا

مری غزل کی دعا مستجاب ہے گوہرؔ
مرا کریم — مرا کارساز کیسا تھا

محسن احسان



خود تماشا ہوں تو خود محوِ تماشا میں ہوں
اپنا قاتل بھی ہوں میں، اپنا مسیحا میں ہوں

سوچتا ہوں تو بجز داغِ طلب کچھ بھی نہیں
دیکھتا ہوں تو طرب خانۂ دنیا میں ہوں

نگہِ اہلِ ہوس میں نہیں منصب، نہ سہی
یہ مگر زعم تو ہے، تیری تمنّا میں ہوں

اک نظر دیکھ کہ اے بے خبرِ کاوشِ رنگ
پسِ ہر پردۂ گُل، انجمن آرا میں ہوں

ایک لمحے کو سہی میری گھنی چھاؤں میں بیٹھ
دشتِ غم میں شجرِ شوق کا سایا میں ہوں

دیکھ محرومیٔ تقدیر و ستمکاریٔ شوق
موجِ دریا میں بھی رہ کر لبِ دریا میں ہوں

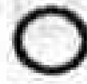
صرصرِ وحشتِ جنوں تا درِ زنداں لے جائے
شاخِ آلام سے ٹوٹا ہُوا پتّا میں ہوں

وہی تمکینِ تغافل، وہی بے صبریٔ شوق
قربتِ حُسنِ دلآرا پہ بھی تنہا میں ہوں

شدّتِ شوق سے اُمڈا ہُوا بادل تو ہے
حدّتِ شوق سے جلتا ہُوا صحرا میں ہوں

اب کے وہ قحطِ وفا شہرِ تمنّا میں پڑا
محسنؔ اک قطرۂ خوں کے لیے ترسا میں ہوں

اسلم انصاری



جب ہمیں اذنِ تماشا ہو گا تو کہاں انجمن آرا ہو گا

ہم نہ پہنچے سرِ منزل تو کیا ہم سفر کوئی تو پہنچا ہو گا

اُڑتی ہو گی کہیں خوشبوئے خیال گلِ معنی کہیں کھلتا ہو گا

وادیٔ رنگ میں ہر نقشِ بہار شاخ در شاخ لرزتا ہو گا

ساغرِ دل میں ترا عکسِ جمال محوِ ایجادِ تمنّا ہو گا

ہر گل و برگ ہے اک نقشِ قدم کون! اس راہ سے گذرا ہو گا

لبِ تصویر پہ گویا ہے سخن کوئی سن لے تو تماشا ہو گا

اب بھی گل پوش دریچے کے قریب تو کسی سوچ میں ڈوبا ہو گا

آج کی شام بھی وہ سروِ جمیل تیرے آنگن میں لہکتا ہو گا

تو نے جب ہاتھ چھڑایا تھا وہ پل تجھ کو بھی یاد تو آتا ہو گا

دل یہ کہتا ہے تجھی سے ملئے میں یہ کہتا ہوں کہ پھر کیا ہو گا

دشتِ فرقت میں کھڑا سوچتا ہوں
تُو کہاں انجمن آرا ہو گا

حسن اختر جلیل



دیارِ دل شفقِ غم سے جگمگایا نہیں
ترے خیال نے گھونگھٹ ابھی اٹھایا نہیں

اب اور کر کوئی تدبیر اے دلِ بے تاب
وہ دیکھ کر ترے آنسو بھی مسکرایا نہیں

درخت جس کے تصور سے جھوم جھوم گئے
ہوائے لُو کا وہ جھونکا چمن میں آیا نہیں

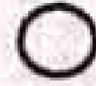
مرے خلوصِ وفا کا بھرم تو باقی ہے
ترے نثار کبھی تُو نے آزمایا نہیں

ق

نہیں ہوا کے نشانِ قدم بھی راہوں پر
کبھی — کبھی، کوئی اس بے کراں میں آیا نہیں

افق کے بعد افق ہے، خلا کے بعد خلا
یہ وہ سفر ہے کہ ساتھی خود اپنا سایا نہیں

انور شعور



دھوکا کریں، فریب کریں، یا دغا کریں
ہم کاشش دوسروں پہ نہ تہمت دھرا کریں

رکھا کریں ہر ایک خطا اپنے دوش پر
ہر جرم اپنی فردِ عمل میں لکھا کریں

احباب سب کے سب نہ سہی لائقِ وفا
ایک آدھ باوفا سے تو وعدہ وفا کریں

روٹھا کریں ضرور مگر اس طرح نہیں
اپنی کہا کریں نہ کسی کی سُنا کریں

انسان سرِ سینہ کا محرم نہیں ہنوز
کچھ شک ہوا کرے تو زباں سے کہا کریں

فرصت مِلا کرے تو خرافات کے بجائے
اک گوشۂ چمن میں کتابیں پڑھا کریں

چھپوا دیا کریں کسی اخبار میں کلام
لیکن مشاعروں میں نہ شرکت کیا کریں

اتنے تو خشک ہوں کہ کسی داد خواہ سے
مہمل غزل سُنیں تو نہ ہم واہ وا کریں

دیگر ضرورتیں نظر انداز کر کے ہم
تکلے لیا کریں نہ برانڈی لیا کریں

اعلانِ ترکِ بادہ گساری کے باوجود
پینا ہی لازمی ہو تو چُھپ کر پیا کریں

گھر میں ہزار ادائیں دکھایا کریں مگر
دنیا کے سامنے نہ تماشا بنا کریں

اتنے سبک نہ ہوں کہ بلاتے ہُوئے نگاہ
ارزاں کنندگانِ شرافت حیا کریں

خوار اس قدر نہ ہوں کہ بلاتے ہُوئے ہمیں
دوشیزگانِ انجمن آرا ڈرا کریں

وہ ناخلف تو قابلِ تخریب تک نہیں
اصلاح کیا شعور کی جون ایلیا کریں

وہ جب ہمیں سنائیں سلیماں کے معجزے
ہم وصفِ شاہزادیٔ شہرِ سبا کریں

وہ داستانِ عبرتِ عاقل دلائیں یاد
ہم مدحتِ مبارکِ زیب النسا کریں

دامن مثالِ دامنِ یوسف بچائیں وہ
ہم ہات مثلِ دستِ زلیخا رسا کریں

اقبال ساجد



گڑے مُردوں نے اکثر زندہ لوگوں کی قیادت کی
مری راہوں میں بھی حائل ہیں دیواریں قدامت کی

نئی کرنیں پُرانے آسماں میں کیوں جگہ پائیں
وہ کافر ہے کہ جس نے چڑھتے سُورج کی عبادت کی

پُرانی سیڑھیوں پر میں نئے قدموں کو کیوں رکھوں
گراؤں کس لیے چھت سر پہ بوسیدہ عمارت کی

ترا احساس بھی ہو گا کبھی میری طرح پتھر
نکل جائے گی آئینے سے پرچھائیں نزاکت کی

وہ میرا بُت تھا جس کو مَیں نے اپنے ہاتھ سے توڑا
کہ برسوں کی یہ محنت ایک لمحے میں اکارت کی

اگر ہے نام کی خواہش تو دیواروں پہ چسپاں کر
بنا کر جھوٹ کے رنگوں سے تصویریں صداقت کی

ابھی سینوں میں لہراتے ہیں میری یاد کے پرچم
ابھی تک ثبت ہیں مُہریں دلوں پر بادشاہت کی

ابھی سب حرف ہیں تازہ، مگر تاکیوں بے معنی سے
سیاہی خشک بھی ہونے نہیں پائی عبارت کی

کوئی میٹھے پھلوں کی آس میں کیوں تلخ دن کاٹے
کِسے فرصت ہے ساجد آج کل صبر و قناعت کی

صدیق افغانی



آنکھوں سے آنسوؤں کے جو لشکر رواں ہوئے
کچھ ریگ زارِ جسم کے اندر رواں ہوئے

آندھی رُکی تو قہر کا بھونچال آ گیا
جب گر پڑے درخت تو پتھر رواں ہوئے

جادُو جگا دیا ترے ہاتھوں کے لمس نے
میرے بدن میں سات سمندر رواں ہوئے

صُورت پذیر ہو گئے یادوں کے سلسلے
عکسِ جمیل، آبِ رواں پر رواں ہوئے

شب آ گئی تو اور بڑھا قاتلوں کا خوف
گردن پہ تیز دھار کے خنجر رواں ہوئے

جاذب بہت تھا نرمیٔ رفتار کا طلسم
تیرے عقب میں سرو و صنوبر رواں ہوئے

کاغذ کی ناؤ موجِ بلا سے اُلجھ پڑی
آتش کی سمت موم کے پیکر رواں ہوئے

صدیق پھیلتا ہی گیا منزلوں کا بُعد
ہر چند لوگ راہ بدل کر رواں ہوئے

سلیم شاہد



محفل اُٹھی تو دوست کچھ ایسے بکھر گئے
شاخیں برہنہ ہو گئیں، پتے بکھر گئے
کیا کیا تھیں صورتیں مری آنکھوں کے روبرو
ٹوٹا جو آئینہ تو وہ چہرے بکھر گئے
کھینچی جو سانس، تلخ ہوا منہ میں آ گئی
سارے بدن میں درد کے ذرّے بکھر گئے
یوں روشنی نے توڑ دیے خواب رات کے
آنگن میں رنگ رنگ کے سائے بکھر گئے
کرنوں کے ساتھ پھیل گئے لوگ شہر میں
گھر بے مکین ہو گئے، رشتے بکھر گئے
گھر کی اماں سے نکلا تو بازار تھے کئی
آنکھوں میں سمت سمت کے رستے بکھر گئے
دیکھا تو پانیوں پہ تھے خطے الگ الگ
گویا زمیں کی کشتی کے تختے بکھر گئے
آخر مری خموشی دھماکے سے کھل گئی
حرفِ بیاں سے آگ کے شعلے بکھر گئے
شاہد تعلقات بھی تھے تار سوت کے
تسبیح کے زمین پہ دانے بکھر گئے

رُوحی کنجاہی



کون لے میرا پتہ، کس سے کہوں
میں ہوں اور وحشتِ وفا، کس سے کہوں!

کس نے کیوں بات کوئی بھی نہ سُنی
کس کو کیا زعم رہا، کس سے کہوں

عمر بھر ساتھ نبھانے والا
اب کہاں چھوڑ گیا، کس سے کہوں!

رات کس وقت، کہاں آئی مجھے
دن کہاں ختم ہُوا، کس سے کہوں

اپنی ہر سوچ ادھوری کیوں ہے
کیا ہُوا ذہنِ رسا، کس سے کہوں

کیوں ہوا خوگرِ تسلیم ایسا!
کیا ہُوئی میری انا، کس سے کہوں

جس میں موجود ہیں سب تیری صفات
ہے وہی میرا خدا، کس سے کہوں

اصل قاتل تو ہے منصف میرا
کس نے خوں کس کا کیا، کس سے کہوں

کیوں بہر حال جیے جاتا ہوں
کیوں ہر اک زہر پیا، کس سے کہوں

وقت بے رحم ہے کتنا رُوحی
زخمِ دل بھرنے لگا، کس سے کہوں

راؔم ریاض



ہلکی سی روشنی تھی، ہوا سا اندھیرا تھا
ہم یونہی اُٹھ گئے، ابھی کافی سویرا تھا

تیرے لیے ہے اب مری آواز اجنبی
یہ اور بات ہے کہ کبھی تو بھی میرا تھا

ہم اجنبی تھے، تیری رفاقت میں جل گئے
ورنہ بڑے درخت تھے، سایہ گھنیرا تھا

پل بھر کو جو رُکا ہے، اسے ریت کھا گئی
صحرا میں اب کے تیز ہوا کا بسیرا تھا

جب راؔم ہم کرید رہے تھے زمین کو
سورج نے آسمان پہ سونا بکھیرا تھا

خالد شیرازی



ہر نقش ہُوا ہو کے بکھر جائے گا آخر
خالد، ترا احساس بھی مر جائے گا آخر

مِٹ جائے گا خواہش کا نشاں موت کے ہاتھوں
یہ سانپ بھی سینے سے اُتر جائے گا آخر

دن، جس کے لیے رات بڑے کرب میں کاٹی
سایوں کے تعاقب میں گذر جائے گا آخر

میں خوف ہوں، بیٹھا ہوں کمیں گاہِ فنا میں
تُو بچ کے مری زد سے کدھر جائے گا آخر؟

جو سائے کے مانند رواں ہے مرے ہمراہ
وہ شخص بھی تنہا مجھے کر جائے گا آخر

خالد احمد



نور نور ذہنوں پر، خوف کے اندھیرے ہیں
روشنی کے پیڑوں پر، رات کے بسیرے ہیں

شہر شہر سناٹے، یوں صدا کو گھیرے ہیں
جس طرح جزیروں کے، پانیوں میں ڈیرے ہیں

نیند کب میسر ہے، جاگنا مقدر ہے
زلف زلف اندھیارے، خم بہ خم سویرے ہیں

دل اگر کلیسا ہے، غم شبیہِ عیسیٰ ہے
پھول راہبہ بن کر، روح نے بکھیرے ہیں

عشق کیا؟ وفا کیا ہے؟ وقت کیا؟ خدا کیا ہے؟
ان لطیف جسموں کے، سائے کیوں گھنیرے ہیں؟

ہو بہو وہی آواز، ہو بہو وہی انداز
تجھ کو میں چھپاؤں کیا، مجھ میں رنگ تیرے ہیں

ذوقِ آگہی بھی دیکھ، طوقِ بے کسی بھی دیکھ
پاؤں میں ہیں زنجیریں، ہاتھ میں پھریرے ہیں

توڑ کر حدِ امکاں، جائے گا کہاں عرفاں
راہ میں ستاروں نے، جال کیوں بکھیرے ہیں

فہم لاکھ سلجھائے، وہم لاکھ اُلجھائے
حسن ہے حقائق کا، کیا خیال میرے ہیں

ہم تو ٹھہرے دیوانے، بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالدؔ، پاگلوں کو گھیرے ہیں

عابد صدیق



پُوجا وہی گیا ہے جو حیرت زدہ ہُوا
بُت بن گیا، تو شہر میں آکر خدا ہُوا

صدیوں کی قید کاٹ رہا تھا جو میرے ساتھ
ٹوٹا حصارِ جسم تو سایہ رہا ہُوا

میں خوش ہُوا تھا جان کے جس کو حدِ سفر
اک تیر کا نشاں تھا وہاں بھی بنا ہُوا

تیشہ چلے تو سنگ کا جوہر بھی کھُل سکے
کیا کیا ہُوا عزیز نہ پتھر کٹا ہُوا

راہِ طلب میں نقشِ کفِ پا نہ کر تلاش
اس راستے سے جو بھی گیا، لاپتہ ہُوا

بادل برس گیا تو ہے اب موج موج رقص
برسات سے اُمنڈ پڑا دریا رُکا ہُوا

یکتا بزعمِ خویش تھے، تو بھی بُرے نہ تھے
لوگوں میں آ ملے ہیں تو یہ بھی بھلا ہُوا

جھیلا تھا جس نے دردِ ملامت ہمارے ساتھ
ہے وقت سے سوال کہ وہ شخص کیا ہُوا

عابدؔ وہ اب ملے تو کسی روپ میں کبھی
ہر رنگ میں پھرا ہوں اُسے ڈھونڈتا ہُوا

افتخار نسیم



شام سے تنہا کھڑا ہوں، یاس کا پیکر ہوں میں
اجنبی ہوں اور فصیلِ شہر سے باہر ہوں میں

تُو تو آیا ہے یہاں بس قہقہوں کے واسطے
دیکھنے والے! بڑا غمگین سا منظر ہوں میں

میں بچا لوں گا تجھے دُنیا کے سرد و گرم سے
ڈھانپ لے مجھ سے بدن اپنا، تری چادر ہوں میں

میرے ہونے کا پتہ لے لے در و دیوار سے
کہہ رہا ہے گھر کا سنّاٹا، ابھی اندر ہوں میں

میں تمہیں اُڑتے ہُوئے دیکھوں گا میرے ساتھیو
میں تمہارا ساتھ کیسے دُوں، شکستہ پر ہوں میں

اب تو ہلتے ہیں ہوا سے بھی در و دیوارِ جسم
باسیو! مجھ سے نکل جاؤ، شکستہ گھر ہوں میں

سردار نقوی



رنگ اِک آتا رہا چہرے پہ، اِک جاتا رہا
میں تو ماضی کو فقط آئینہ دِکھلاتا رہا

دُھوم تھی جس کے تکلّم کی، وہی جانِ سخن
جب حدیثِ دل کی بات آئی تو ہکلاتا رہا

پیاس صحرا کے مقدر میں جو تھی، سو اب بھی ہے
ابر برسا بھی تو بس دریا کو چھلکاتا رہا

بڑھ کے جو آغوش میں لے لے، کوئی ایسا بھی ہو
جو شجر تھا راہ میں، بس ہاتھ پھیلاتا رہا

رات پھر جلتا رہا تنہائیوں کی دُھوپ میں
رات بھر زلفوں کی چھاؤں کا خیال آتا رہا

خلق پتھر مارنے آئی تو وہ بھی ساتھ تھے
میں خطائیں جن کی، اپنے نام لکھواتا رہا

شاہد زبیر

○

نہ دستِ شاخ سے لے جائیے اٹھا کے مجھے
وہ بھول جائے گا، گلدان میں سجا کے مجھے

جدا نہ ہو کہ تری ساری کائنات ہوں میں
نہیں یقین تو پھر دیکھ آزما کے مجھے

وہ کم نظر جو مری روشنی کا دشمن تھا
ہے مطمئن تہِ دامانِ شب چھپا کے مجھے

میں خواب ہوں، مری قسمت ہے صرف بیداری
وہ سو رہا ہے مگر آنکھ میں سجا کے مجھے

اُسے تلاش کرو مشعلِ صدا لے کر
شبِ سکوت سے لایا تھا جو بچا کے مجھے

ہر ایک برگ تھا جب جانکنی کے عالم میں
بہت ہنسا تھا وہ رنگِ چمن دکھا کے مجھے

میں جل رہا تھا کسی گھر کے طاق میں شاہد
ہوا کا جھونکا بہت خوش ہوا بجھا کے مجھے

○

ذہن کے گوشوں پہ یہ کیسا اندھیرا چھا گیا
تجھ سے ملنے بھی نہ پایا تھا کہ میں پتھرا گیا

راستوں کا جال بھی اب پاؤں کی زنجیر ہے
میرا دُکھ یہ ہے کہ میں اپنی حقیقت پا گیا

ایک اک کر کے مٹا ڈالے سبھی قربت کے نشاں
دیکھ کر عکسِ رواں پانی میں، وہ یاد آ گیا

وہ جو لیتا تھا در و دیوار سے اپنا پتا
شہر سے بیزار ہو کر جانبِ صحرا گیا

ایک تنہائی شریکِ راہ آخر تک رہی
منزلوں کی دُھن تھی جس کو وہ کہاں تنہا گیا

کون ہے میرا یہاں، کس کی نظر کا نور ہوں
میں وہ یوسف ہوں جسے بازار میں بیچا گیا

میں نے شاہد کانپتے دیکھا ہے اس کو صبح تک
جرم بھی کرنے نہ پایا تھا کہ وہ گھبرا گیا

احمد ندیم قاسمی



احباب کے حصّے میں ہزاروں ہُنر آئے
کچھ درد پچھے رہ گئے جو میرے سر آئے

خود اپنے ہی ریزے مری جھولی میں بھرے ہیں
اور لب پہ دعا ہے کہ کوئی شیشہ گر آئے

میں جانتا ہوں، زندہ ہوں جس کرب سے لیکن
زندہ ہوں کہ شاید کوئی اُمید بر آئے

اُس حسن کو آغوش میں لینے کا جنوں ہے
جو حسن مجھے حدِّ نظر تک نظر آئے

مانا کہ ازل سے تری جانب نگراں ہوں
بھیگی ہُوئی آنکھوں سے مگر کیا نظر آئے

وہ شعبدۂ حسن ادا ہے کہ خدا ہے
ہر بار مرے پاس برنگِ دگر آئے

جنگل ملے خاموش تو صحرا ملے تنہا
اندازِ مرے شہر کے ہر سو نظر آئے

کہتے ہیں کہ مر کر ہیں کبھی مر نہ سکوں گا
کیا مر کے ہی جینے کی دعا میں اثر آئے

کیا عرش سے آگے بھی کوئی ہے کہ نہیں ہے!
اب تو مجھے خود اپنے خیالوں سے ڈر آئے

گردش سے اگر قطعِ نظر ہو تو ہے ممکن
ڈوبا تھا جہاں چاند، وہیں سے اُبھر آئے

بہلاؤ نہ اب خلد سے اُن خود نگروں کو
غیرت کو بچا کر جو فلک سے اُتر آئے

حسین شاہد

تبصرے

"مجلس شاہ حسین" کا اشاعتی پروگرام اس کے ایک بہت بڑے پروگرام کی "معمولی" سی شق ہے لیکن یہ معمولی شق جس طرح غیر معمولی جتنی جارہی ہے اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ پنجابی کو انگریزی کی جگہ "سنابری" کی علامت بنا کر رہیں گے۔ اس وقت میرے سامنے پانچ کتابوں کا ایک سٹ ہے جو مجلس نے شاہ حسین کے ۳۲۸ ویں عرس کے موقع پر مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع کیں۔ کتابوں کے موضوعات کی رنگارنگی اس بات کی شاہد ہے کہ مجلس کے پیش نظر قومی کلچر کا مجموعی ارتقا ہے اور علاقائی ثقافتوں کی شانہ بشانہ نشوونما اس کا جزو ایمان ہے۔ ساتھ ہی مجلس پنجابی زبان و ادب کے کارناموں کو ہر سطح پر متعارف کرانے کا تہیہ بھی کئے ہوئے ہے۔ مجلس کا اشاعتی پروگرام جس کو اس کے منتظمین ہر سال مارچ کے مہینے میں منظر عام پر لاتے ہیں، ان کے عزائم کی عملی تصویر ہوتا ہے اور برائے اشاعت منتخب ہونے والی کتب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل "مجلس" ہر قسم کے تعصب سے بالاتر علاقائی اور قومی کلچر کی متوازن صورت گری کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ درست ہے کہ "مجلس شاہ حسین" بنیادی طور پر ایک علاقائی تحریک ہے لیکن کچھ لوگ قومی یکجہتی کے مقدس نام پر علاقائی تحریکوں پر جن "دلائل" سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتے ہیں، یہ کتابیں ثابت کرتی ہیں کہ کم از کم مجلس شاہ حسین کے ضمن میں نہ تو ان دلائل میں کوئی وزن ہوتا ہے اور نہ علاقائی "ثقافت کی ترویج سے کسی کے "ایمان" کے "ارجک" ہونے کا کوئی جواز موجود ہے۔

زرِ گل

ضخامت ۱۵۲ صفحات

قیمت: مجلد تین روپے

یہ کتاب کشمیری نظموں کا اردو ترجمہ ہے جو تابش صدیقی نے نظم ہی میں کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں مجلس نے خود ہی ایک سوال اٹھایا اور خود ہی اس کا جواب دیا ہے۔ سوال اور جواب مجلس ہی کے الفاظ میں سنیئے۔

"پنجابی کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ حسین کے عرس کے موقع پر اپنی کشمیری نظموں کا اردو منظوم ترجمہ چھاپنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی جبکہ ابھی پنجابی زبان میں کرنے کے بہت کام پڑے ہیں؟...... کشمیر اور پاکستان کا گذشتہ بیس سال سے جو تعلق بنتا ہے، اس کے پیش نظر یہاں زبانوں کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظر اس افسوسناک حقیقت پر پڑتی ہے کہ گذشتہ بیس سال میں سیاسی میدان میں کشمیر کے مسئلہ کے لئے جو کام ہوا اس کا عشر عشیر بھی ثقافتی محاذ پر کیوں نہیں ہوا......"

اور پھر ——— "مجلس کو جہاں پنجابی زبان سے ناروا سلوک کا گلہ ہے وہاں اسے یہ شکوہ بھی ہے کہ کشمیری زبان جو کسی نہ کسی روز ہماری علاقائی زبان ٹھہرے گی، ہماری قومی ادبی روایت کا حصہ نہیں بنائی جا رہی۔"

کتاب میں چودھویں صدی سے لے کر زمانۂ حال تک کے چند شعراء اور شاعرات کی کوئی پچاس کے قریب نظموں کا ترجمہ ہے۔ مترجم کا کہنا ہے کہ کشمیری نہ تو اُن کی مادری زبان ہے اور نہ اُنھوں نے اسے کسی مکتب میں پڑھا ہے۔ ترجمہ براہِ راست کشمیری سے نہیں بلکہ انگریزی کے ذریعے اُردو تک آیا ہے چنانچہ اس ترجمہ در ترجمہ کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں ہم کچھ کہنے سے قاصر ہیں کہ اس وقت ہمارے سامنے نہ اصل ہے اور نہ ہی انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ البتہ نظمیں، جیسی کہ وہ ہیں، بعض مقامات پر سادگی اور تاثر کے اعتبار سے کن حدوں کو چھوتی ہیں اس کی ایک مثال نظم "رات بھر کا مہمان" کا ابتدائی ٹکڑا ہے:

شب بھر میرے پاس رہا
جیسے پھول کی پتّی پر
شبنم کا اک موتی تھا

اور پھر نظم "مجھے تمنا ہے اس جہان کی" پڑھتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام حسّاس انسان، جہاں کہیں بھی ہوں، ایک ہی طرح سوچتے ہیں علاوہ ازیں جذبے کی صداقت اور بیان کی وارفتگی کی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں۔

میں نے تمہاری خاطر آخر
بیچ ڈالا گھر بار
آجاؤ اک بار

تم آؤ تو جی وں شاید
زیست سے کروں پیار
آجاؤ اک بار

کوئی دن میں بن جاؤں گی
اک اُجڑی سی بہار
آجاؤ اک بار

نظموں کے آخر میں ان شعراء اور شاعرات کے سوانحی خاکے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن کی نظمیں ترجمہ ہوئی ہیں۔ شروع میں کشمیری شاعری پر مختصر سا نوٹ افادیت سے خالی نہیں۔ سرورق کی جاذبیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کچے گھڑے

ضخامت ... صفحات
قیمت : مجلد تین رُپے

باقی صدیقی کی پنجابی نظموں کا یہ عنوان یقیناً مصنف کا اپنا ہی تجویز کیا ہوا ہے لیکن مجلس شاہ حسین نے یہ کہہ کر ـــــ"...... مجلس "کچے گھڑے" پیش کر رہی اے تے "کچے گھڑے" ای ساڈی ازلی برات نیں"ـــــ عنوان کریں اپنا لیا ہے کہ مجلس کی تمام تر تہی دستی عنوان میں سمٹ کر آ گئی ہے۔

باقی صدیقی اردو شاعری کے حوالے سے ایک زندہ نام ہے۔ زندگی ـــــ نام کی ہو یا صاحبِ نام کی ـــــ کسی بھی طور کی ہو سکتی ہے لیکن "کچے گھڑے" نے باقی کے نام کو متحرک، سرسبز اور صحت مند زندگی کی ضمانت دے دی ہے۔ اس لئے کہ باقی نے "کچے گھڑے" میں جو کچھ کہا ہے اس نے معاشرے کی فضا میں گونجنے والی حساس آوازوں کا مشہود، محسوس، منظوم روپ دھار لیا ہے۔ یہ آوازیں انسانی بستیوں میں اس وقت سے پریشان ہیں جب سے انسانوں کے ایک گروہ نے طاقت کا سہارا لے کر اپنے اعمال سے تند و تیز طوفانوں کا منہ کھول رکھا ہے اور دوسرے نحیف و نزار

گروہ کے پاس ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف کچے گھڑوں کا آسرا ہے۔ جب تک حالات جوں کے توں رہیں گے۔ یہ آوازیں اسی طرح پریشان رہیں گی لیکن بے ربط طور پر ـــــ اور باقی صدیقی ان آوازوں کو مسخر کرکے ظاہر کرتے رہیں گے۔ اس قسم کی کسی بھی "صدائے گرفتہ" کی زندگی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ انہیں فن کار نے کس انداز سے ظاہر کیا، چاہے وہ ان گنت بار ہی کیوں نہ ظاہر کی گئی ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ باقی کی یہ آوازیں کبھی مر بھی سکتی ہیں۔

سنگ اِٹی نا کچا دھاگہ،
گل گھتے نا پھوک
بھروی کیہڑا آکھے
کوڑے جھوٹے وڈے لوک

یا:

بُھرا کھتیاں ٹُٹ گھنے
تے رات کرے ارناں
ہک درجے آں ننگا کرے
ہستن جدا انسان

یا:

جھڑن پکی بیری
جھیڑا کھکے وٹے مارے
لگ گئی ویہڑے وچ وٹیاں نی ڈھیری
جھڑن پکی بیری

"کچے گھڑے" شروع سے آخر تک ایسی ہی پریشان آوازوں کو سمیٹ کے گرفتہ بنا کر منظوم موثر روپ دینے کی کامیاب کوششوں سے بھری پڑی ہے جس کی اشاعت باقی کے لئے باقی رہنے کی، "مجلس" کے لئے مبارکبادی اور ہمارے لئے خوش بختی کی ضمانت ہے۔

پنجابی زبان تے اوہدا لٹریچر

ضخامت ۱۰۷ صفحات   قیمت: مجلد اڑھائی روپے

ڈاکٹر بنارسی داس جین کی اس کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ پہلی بار یہ ۱۹۴۱ء میں چھپی تھی۔ اس کی دوبارہ اشاعت کا جواز وہی ہے جو پچھلے برس مجلس نے ڈاکٹر لاجونتی رام کرشن کی کتاب "پنجابی دے صوفی شاعر" کی دوبارہ اشاعت پر پیش کیا تھا اور وہ یہ کہ پنجابی میں اس موضوع پر کسی نئے لکھنے والے نے آزادی کے بعد قلم ہی نہیں اٹھایا۔ قریشی احمد حسین نے پنجابی کے بارے میں بزبانِ اردو ایک کتاب چھپوائی تھی۔ وہ بھی اس کتاب کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک مکمل کتاب ہے جس میں پنجابی لٹریچر کی تمام تر باتوں کا تھوڑا بہت جائزہ لیا گیا ہے اور تنقید کا انداز بھی باقی کتابوں سے بہتر ہے۔ کتاب کو دوبارہ چھاپنے کی ایک اور وجہ جواز یہ بھی ہے کہ آزادی کے بعد یہ تقریباً ناپید ہو چکی تھی اور اس کا زندہ رہنا بجد

ضروری تھا کیونکہ اس میدان میں جب بھی کسی نے کام شروع کیا اسے اپنے کام کی بنیاد اسی زاوئیے سے پہلے ہی کی کتابوں کو بنانا ہوگا۔ کسی بھی نوشت کے حسن و قبح کا فیصلہ وقت خود کرتا رہتا ہے لیکن زبانوں کا جائزہ لینے والی کتب کی موت خود اس ادب کی اور اس کے پرستاروں کی موت ہوتی ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسی کتابوں کی قدامت ہی تو مورخ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا مجلس نے یہ کتاب از سرِ نو چھاپ کر نہ صرف ایک نئی دریافت کی صورت پیدا کی ہے بلکہ پنجابی نقادوں کے لئے لمحۂ فکریہ بھی مہیا کیا ہے۔

کتاب میں سب سے پہلے پنجابی کے علاقے کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پنجابی کے مختلف لہجوں کا حال مثالوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں پنجاب (غیر منقسم) کے نقشے سے بھی مدد لی گئی ہے۔ زبان کے اس پہلو پر بحث کرنے کے بعد پنجابی لٹریچر کی مختصر تاریخ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی لکھی ہوئی کتب کے حوالے سے بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی پنجابی اصنافِ سخن کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ کتاب اپنے اختصار کے باوجود ایک قیمتی دستاویز ہے جسے پنجابی سے کسی بھی سطح پر دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ کتاب کا وجود اس حقیقت پر بھی بھرپور طنز ہے کہ پنجابی کے تخلیقی ادب میں پچھتر فی صد سے بھی زیادہ حصہ مسلمانوں کا ہے لیکن مسلمانوں ہی نے اسے سب سے زیادہ نظر انداز کیا ہے۔

دوہے بابا فریدؒ (پنجابی۔ انگریزی)

ضخامت ۱۱۰ صفحات — قیمت: مجلد پانچ روپے

یہ کتاب بابا فریدؒ — جو پنجابی شعر کا بابا آدم بھی ہے — کے ۱۳۳ دوہوں اور چار رباعیوں کا منظوم انگریزی ترجمہ ہے۔ مترجم مقبول الٰہی ہیں جو اس سے پہلے "ابیاتِ سلطان باہو" کو انگریزی میں نظم کر کے چھپوا چکے ہیں۔

بابا فریدؒ کی زبان کہنہ تو ہے ہی، ان کے الفاظ بھی ہم تک گرنتھ صاحب کی وساطت سے پہنچے ہیں، اسی لئے ان کی صرف شکلیں ہی غیر مانوس نہیں، مفہوم بھی کسی حد تک مشکل ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالی پنجابی متن کی مدد سے ہمارے جیسے عام قاری کے لئے فریدؒ کے مطالب تک پہنچنا آسان نہیں۔ مقبول الٰہی کا یہ ترجمہ انگریزی دان طبقے کی اس مشکل کا خوبصورت حل ہے لیکن بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، یہ ترجمہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ مقبول الٰہی کو دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ یہ کتاب اس خوشگوار انکشاف کی حامل ہے کہ اپنی طرف سے گمنام رہنے کی پوری کوشش کے باوجود تخلیقی جوہر نے مقبول الٰہی کو بیچ بازار "عریاں" اور باقی صدیقی کے الفاظ میں اس طرح نمایاں کر دیا ہے جیسے:

اُچیاں کندھاں
ڈک نہ سکن
پُھلاں نی خوشبو

کسی بھی زبان کے شعری سرمایے کو مکمل اور حقیقی تاثر کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے لیکن علاقائی زبانوں کے ضمن میں تو یہ کام مزید مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ علاقائی شعروں میں بلا کی مقامیت ہوتی ہے۔ ترجمے کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ مترجم اصل مفہوم سے کس حد تک قریب ترین مقام پر پہنچا ہے۔ اگر ترجمے کی زبان مصنف کی اپنی زبان ہو تو اس کامیابی کے امکانات زیادہ سہل ہوتے ہیں لیکن یہاں صورت اس کے برعکس ہے یعنی ترجمے کی زبان مصنف کی اپنی زبان نہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مقبول الٰہی نے انتقالِ مفہوم میں ان حدوں کو چھو لیا ہے، جہاں تک پہنچ کر قاری احساسِ تشنگی کی شکایت نہیں کر سکتا اور جسے دونوں زبانوں کی شد بد ہو وہ تو

اکثر مقامات پر جوم اٹھتا ہے۔ صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا:

فریدا پنکھ پراہونی، دُنی سہاوا باغ
نوبت وجی صبح سے چلن کا کر کاج

FARID! THE BIRD IS BUT A GUEST
THIS LIFE A GARDEN GREEN
THE KNELL OF PARTING HAS BEEN TOLLED
PREPARE TO LEAVE THE SCENE.

یا:

فریدا! میں جانیا دکھ مجھ نوں، دکھ سبھائے جگ
اُچے چڑھ کے ویکھیا تاں گھر گھر ایہا اگ

FARID! I THOUGHT, I AM IN PAIN
BUT, IN FACT, ALL ARE SO
I CLIMBED A HEIGHT TO FIND BELOW
ALL HOMES WITH GRIEF AGLOW

کتاب کی گیٹ اپ کو جاذب نظر بنانے میں جدید اردو ٹائپ پریس اور آرٹسٹ اسلم کمال نے بھرپور حصہ لیا ہے۔

سووینیر (نشانی) ۱۹۶۷ء

ضخامت ۱۳۶ صفحے آفسٹ چھپائی قیمت: حساب دوستاں در دل

مجلس ہر سال میلہ شاہ حسین کے موقع پر ایک رسالہ مفت تقسیم کرتی ہے جسے اس سال کا سووینیر (نشانی) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں شاہ حسینؒ کے کلام اور زندگی پر بالخصوص اور پنجابی زبان اور ادب کے بارے میں بالعموم مضامین اور منظومات شامل کی جاتی ہیں لکھنے والوں کو دعوت دیتے وقت یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ سووینیر میں لکھنے کے لئے زبان کی کوئی پابندی نہیں۔ جو جس زبان میں تحریر بھیجے گا اسی میں شائع کی جائے گی۔ — مجلس کو علاقائی تعصب کی علامت قرار دینے والے یہاں سے آنکھیں بند کر کے گذریں — پلیز!

زیر نظر رسالہ جس کا سائز باقی کتابوں $\frac{۱۸×۲۲}{۸}$ کے مطابق ہے، مجلس کا تیسرا سووینیر ہے۔ اس میں صرف ایک مضمون اردو کا ہے باقی سب چیزیں پنجابی میں ہیں، اس لئے کہ لکھنے والوں نے مختاری کے باوجود اپنے آپ کو پنجابی میں لکھنے کا پابند کرنا مناسب سمجھا، یہاں تک کہ مشہور سندھی مضمون نگار پروفیسر رشید احمد لاشاری نے بھی اپنا مضمون پنجابی میں تحریر کیا۔ ان کے علاوہ مضامین لکھنے والوں میں منیر احمد شیخ، منصور قیصر، راحت نسیم ملک، ڈاکٹر رشید انور، سجاد شیخ اور محمد آصف خاں شامل ہیں جبکہ منظومات کے حصے میں حکیم ناصر، منیر بھائی، سلیم کاشر، اکبر لاہوری اور یاسر حسین کمال کے نام ہیں۔ آخر میں مجلس شاہ حسین کا دستور اور کام کے منصوبوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ تفصیل پنجابی کچھر کو اس طور طرح امتیاز بخشنا چاہتی ہے جس صورت ان کتابوں کو ظاہری اور باطنی حسن کے لحاظ سے باقی زبانوں کی مطبوعات میں بلاشبہ ممتاز بنا دیا گیا ہے۔

حسین شاہد

ہماری چند تازہ کتابیں

نقشِ اقبال
سید عبدالواحد

سید عبدالواحد معینی اقبالؔ کے شیدائیوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اقبالؔ کو جس جس رنگ میں دیکھا ہے اپنے قلم کے زور سے اس کا نقش کاغذ کے صفحات پر مرتسم کر دیا ہے ــــ نقشِ اقبالؔ ان کے مختلف وقتوں میں لکھے ہوئے مضامین کا انتخاب ہے۔

قیمت: دس روپے پچاس پیسے

عکسِ اقبال
محمد عبداللہ قریشی

اقبالؔ کے چند اپنے نادر و نایاب مضامین اور غیر مطبوعہ نظموں اور خطوں کے علاوہ بعض ایسے قیمتی اور محنت سے لکھے ہوئے مقالات کا مجموعہ جن سے اقبالؔ کی محبوب شخصیت اور فکر و فن کا عکس روشن تر نظر آتا ہے۔

قیمت: نو روپے

آئینۂ اقبال
محمد عبداللہ قریشی

ادبی دنیا نے علامہ اقبالؔ کے افکار اور فکر و فن کے مطالعہ کے لئے جو اقبال نمبر شائع کیا ہے اس کی افادیت اور مقبولیت کے پیشِ نظر اسے ہمیشہ برقرار رکھنے کی ضرورت ابھی سے محسوس کی جانے لگی ہے۔ بنا بریں ادبی دنیا کے اس قابل قدر خاص نمبر کو وقت کی حدود سے ماورا رکھنے کے لئے کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔

قیمت: آٹھ روپے

آئینۂ کشمیر
محمد عبداللہ قریشی

اس میں کشمیر کے ہر پہلو پر اتنی خوبی، قابلیت اور تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اسے ہر لحاظ آئینۂ کشمیر کہنا زیب دیتا ہے۔

قیمت: آٹھ روپے

ہماری دوسری کتابیں

باقیاتِ اقبال	سید عبدالواحد	۱۰٫۵۰
اقبال کے صنائع بدائع	حمزہ عبد احمد	۳٫۷۵
جشنِ خزاں	عاصی کرنالی	۷٫۵۰
منصبِ امامت	شاہ اسماعیل شہید	۴٫۵۰
چھ ستمبر	عشرت رحمانی	۱۲٫۵۰
حیاتِ جاوید	حالی	۱۷٫۵۰
روحِ اقبال	یوسف حسین خاں	۱۰٫۰۰
اردو غزل	"	۱۲٫۰۰
حسرت کی شاعری	"	۲٫۰۰
حالی کا سیاسی شعور	جذبی	۵٫۵۰
یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	۸٫۰۰
ادبی جھلکیاں	"	۵٫۵۰
گنج ہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	۶٫۷۵
ہمنفسانِ رفتہ	"	۶٫۰۰
طنزیات و مضحکات		۷٫۵۰
تصوراتِ اقبال	صلاح الدین احمد	۸٫۰۰
اختر شیرانی اس کی شاعری	اختر جعفری	۵٫۵۰
مضامین فلک پیما	عبدالعزیز	۹٫۰۰
ناول کیا ہے	احسن فاروقی	۶٫۰۰
ایمرسن کے مضامین	وقار عظیم	۵٫۰۰
امریکی ناول اس کی روایات	"	۵٫۰۰
تعلیم کے مقاصد	سید عبداللہ	۷٫۵۰
تعلیمی مقالات	عبدالغفور	۷٫۰۰
استقلال کے پیکر	ترجمہ حبیب اشعر	۶٫۷۵
جرأت کے پیکر	جان کنیڈی	۶٫۰۰
ایک صدر کی میراث	"	۵٫۵۰

مفصل فہرست طلب کریں:

آئینۂ ادب ۔ چوک مینارہ انارکلی لاہور فون نمبر ۶۷۵۰۴۲

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر پبلشر نے محمد طفیل کے اہتمام سے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "نقوش" ۴۷- انارکلی لاہور سے شائع کیا